DUE DATE

Cl No. Acc. No. ________________

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی پرچہ ۸ر

سالانہ [illegible]

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

جنگ دوسرے مذاہب میں جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت اور عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

جنگ اور تہذیب جدید بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت مجلد ۔ انگریزی ۔ عثمانیہ غیر مجلد ۔ انگریزی ۔ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن (حیدرآباد دکن)

فہرست مضامین

ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ | جلد ۱۱ | عدد ۳ ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پنڈت جواہر لال کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جس کی گہرائیوں تک ان سے پہلے کے ہندوستانی سیاست دانوں کی نظر نہ پہنچی تھی، یا اگر پہنچی تھی تو ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اُن نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے اور پھر انہی پر اُس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔

میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کرونگا، تاکہ اِس پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض کرتے ہیں۔ تاریخ یورپ اور سیاسیات یورپ کے مطالعہ سے ان کے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اس کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدہ کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی

حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے، اور اس اشتراک ہی نے ان کے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کرکے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کرلیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس، رشتہ، وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔

یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔.......مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشو نما نہ پاسکے"۔ (میری کہانی۔ جلد دوم صفحہ ۳۳۱۔ مکتبہ جامعہ دہلی)۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور سمایا ہے ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ وہ نیشنلزم اور کمیونلزم کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس کے فرقے ہیں، اسی لیے وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ـــــ آپ چاہیں تو اسے ایک بدقسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے، مگر ہے

یہ حقیقت اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں، بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصور قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف پر حاوی ہے، وہ کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابل توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اس کے نزدیک جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے" (ص ۴۵۵)۔ اگرچہ پنڈت جی بقول خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں ہیں، مگر مارکس کی اس تعبیر تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے، اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا"۔ (ص ۱۴۱)۔

اپنے تصور قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیاد ہی پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی، یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جن کے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں، اور جن کے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وھلم جرا۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں۔ بلکہ "اگر" کیا معنی، ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے۔

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔" (صفحہ ۳۳۱)۔

" ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے۔" (جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہوسکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو مسلم اور دوسرے فرقے کہاں سے پیدا ہو گئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ سے اختلافات پیدا کر دیئے؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی اس نظریہ پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے اخذ کیا ہے، اور اذعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو رئیس نہیں ہے، صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشی عامل (Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے ـــــ عقلی و استدلالی نہیں بلکہ رجحانی و وجدانی رائے ـــــ قائم کرلی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز

ہو کر ہندوستانی قوم کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے ایک غلط بنیاد (یعنی طرز خیال اور طرق زندگی کی بنیاد) پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیر اثر وہ جگہ جگہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے" (ص ۱۹۱)۔

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طول عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں جس موقع پر جہاں ہندو اور مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو"۔ اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے، اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لاکر ایک قابل لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور ان کے باہمی اختلاف کی یہ ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے! یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات بآسانی

ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، نہ اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھ کر اپنے ذاتی مفاد اور برطانی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کے ساتھ حل کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس نظر سے اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں صحیح راستہ صاف نظر آجاتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ "فرقہ وارانہ" مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔

"ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انہوں نے خوب کھیلا" (ص۲۱)

"فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے" (ص۲۳)

"اغراض کے اس ہجوم میں ..... برطانوی ہند کے نمایندوں کی سرداری عموماً آغاخان کے حصہ میں آئی تھی" (ص۲۱)

"اصل وقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی" (ص۲۴)

"حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی تمام فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں" (ص۱۷۵)

"فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جاسکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے مجوزہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے" (ص۱۱۳)۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے انداز فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا انداز فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے، اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنے کی زحمت کون اٹھائے۔ اس کا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ اب ترقی کرکے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے "ہندوستانی قوم" کو فرقوں میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کے لیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دار، زمیندار

اور تمام مستقل اغراض رکھنے والے طبقے سامراج کے ساتھ سازش کرکے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا مذہب اور سامراج، اور یہ خود غرض طبقے تینوں باہم قریبی رشتہ دار ہیں تینوں قابل نفرت ہیں، اور تینوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں:۔

"منظم مذہب بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تعمیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے ..... حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے" (ص ۱۶۰)۔

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدر دان ہے اور بڑی بے تعصبی کے ساتھ ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے" (ص ۱۱۵)۔

"مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دار و مدار ظلم پر ہے"۔ (ص ۳۹۴)۔

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو جنت نشان بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقہ سے ہونا چاہیے، یہ ایک جداگانہ سوال ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ

نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے۔ (ص ۲-۱۹۱)

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی، ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا ...... یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی بجائے تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social revolution) کا جذبہ پیدا ہو جائے۔" (ص ۱۴۵)

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے ..... یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انھیں بھی راضی کر لینا چاہیے ...... یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جاسکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنے جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھالے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔" (ص ۵۵-۱۵۶)

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (ص ۱۵۵)

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا

کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہوجائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی"۔ ص ۴۶۹ ۔

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کے لیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے۔ قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹاکر "قومی" بنائی جائے) آخری منزل مقصود نہیں ہے بلکہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کرکے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرکے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کرکے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھا رکھا تھا۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، بھوکے ہیں، اور اس کے ساتھ ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں، لہٰذا ہندوؤں کی بہ نسبت وہ اس اشتراکی انقلاب کے لیے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ میں تیزی سے قدم بڑھائیں گے" (ص ۴۶۵)

جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے پنڈت جی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان ایک جماعت ہیں، یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہیں (کیونکہ ان کو "مسلمانوں" کے نام سے یاد کرنا خود ہی مذہب کی بنیاد پر ان کو ایک مستقل جماعت تسلیم کرنے کا ہم معنی ہے) اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ایک مستقل سوشل سسٹم ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ وہ ان تینوں حقیقتوں سے بے خبر نہیں ہیں۔

اب ملاحظہ ہو کہ وہ اس مذہبی جماعت کی قومیت اور اس کے مستقل سوشل سسٹم یعنی اس کی جداگانہ تہذیب کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا" (ص ۳۳۲)

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو" (ص ۳۳۲)۔

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان، اور انہی کی طرح ہندو، فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں

ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کا لوٹنی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں۔ یعنی دھوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جارہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان شاذ ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علیگڈھ والے البتہ سرخ ترکی ٹوپی کے گرویدہ ہیں۔ (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں۔" (ص ۳۳۶)

دیکھا آپ نے۔ ایک جگہ جس قوم کے مستقل اجتماعی وجود کو تسلیم کیا گیا تھا، دوسری جگہ اسکی قومیت سے قطعی انکار رہے۔ ایک جگہ جس تہذیب کی اتنی طاقت تسلیم کی گئی تھی کہ مسلم قوم کے اجتماعی نظام میں اسی کی بدولت "ایک حد تک" آزادی پائی جاتی ہے، دوسری جگہ اسی تہذیب کو باتوں میں اڑایا جاتا ہے۔ اسکو ایک بے اصل چیز قرار دیا جاتا ہے وہ محض پرانی قوموں کی دھندلی سی یاد ہے، یا زبان، آرٹ اور موسیقی ہے، یا چند نہایت حقیر امتیازی علامات اور چند ایسی ہی دوسری چیزوں کا مجموعہ ہے جو مٹتی اور فنا ہوتی جارہی ہیں لیکن یہ کہتے کہتے دفعتہً یاد آتا ہے کہ نہیں، یہ چیز تو ابھی موجود ہے۔ اس لیے پھر یوں ارشاد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانو! تم یہ کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا رہے ہیں، مٹادینگے اور خود مسلمان قومیں اس کو چھوڑ رہی ہیں۔

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیب

وحدت بنتی جارہی ہے ...... اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا" (ص ۳۳۲)۔

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں۔ اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہوگئے۔ اسلام کے مرد غازی ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لیے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لیے جارہے ہیں.... ...مصر بھی اسی راستہ پر جارہا ہے...... یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیار کے لیے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جارہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے۔" (ص ۳۳۶)۔

مطلب یہ ہے کہ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے، جس کو سب مسلمان قومیں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے بیٹھے ہو۔ چھوڑ و اسے اور آؤ اس راستہ کی طرف جدھر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کمبخت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانیں گے۔ لہذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اس کی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے، اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو و مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کرے" (ص ۳۳۰)

"(مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا) مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے یا بدیسی حکومت"۔ (ص ۳۳۱)

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی؟ (ص ۳۳۳)۔

یہاں ہندوستان کے "قومی لیڈر" نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے، لہذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو، ورنہ جو کوئی یہ نام لے گا، ٹوڈی قرار دیا جائیگا ـــــــ یہ آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگا دی ہے جو حریت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پھر جواہرلال کے یہ الفاظ پڑھیے کہ "اگر مسلمانوں میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ میں تیزی سے قدم بڑھائیں گے"۔

اب آپ اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں پنڈت نہرو کے اُس جدید انقلابی طریقہ سے آپ کو روشناس ہونا چاہیے جو انہوں نے "فرقہ وارانہ مسئلے" کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا ہے۔

پنڈت جی خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہوشمند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ توقیاً مت تک

اِس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کے لیے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں۔ ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس تہذیب کو خیرباد کہدیں جسے وہ اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا تو بہت دور کی چیزیں ہیں مسلمانوں کے اس گروہ سے تو الٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کریگا، اور اس غرض کے لیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہے گا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کر کے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد جو منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کی گرفت قائم نہیں رہی ہے، اور جہالت یا مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کا شعور اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو بآسانی توڑ لیا جا سکتا ہے قبل اس کے کہ مسلمانوں کا "بورژوا طبقہ" ــــ اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے ــــ بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لی جائے۔

یہی حقیقت ہے اُس پالیسی کی جس کو "مسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے" (Muslim mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:۔

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر مذ توں فرقہ وارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ اُدھر نگاہ بھی نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جارہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو مسلمان سکھ، عیسائی، سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بیکاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کے لیے آگے بڑھیں جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے۔"

کیسے معصوم کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں، ان کو سامنے رکھ کر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ دراصل شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شدھی نہیں سیاسی اور معاشی شدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدھی کا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہو گئے تھے۔ اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علما تک اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اُس تحریک کے بانیوں نے پھوہڑپن سے کام لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آجاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اِس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے۔ لہٰذا کسی چیز کے چھوڑنے کا کوئی

سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی "ہندوستانی قوم" کے فرد ہو مگر سامراج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو، اور اس اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ــــ ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ مگر دیکھیے، کیسے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیر مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

مجھے یہ الزام دینے میں جلدی نہ کیجیے کہ تو ایک شخص کے خیالات کو نقل کر کے ایک پوری جماعت کو بدنام کرنا چاہتا ہے نہیں اب یہ ایک شخص کے انفرادی خیالات نہیں رہے، بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کی سرکاری پالیسی بن گئے ہیں۔ آگے چل کر میں ناقابل انکار شہادتوں سے ثابت کروں گا کہ کانگریس کا پورا نظام اس وقت انہی اصولوں پر چل رہا ہے، جو پنڈت جواہر لال کی زبان سے ابھی آپ سن چکے ہیں۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق مضامین کی اشاعت کے لیے اعانت کی جو درخواست کی گئی تھی اس کے سلسلہ میں مزید ڈیڑھ سو روپیہ حالی اور ڈیڑھ سو روپیہ کلدار وصول ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ سرمایہ پانچ سو پچاس روپیہ حالی اور دو سو روپیہ کلدار تک پہنچ گیا ہے۔

ان صفحات میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان کا مجموعہ ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے جو سردست صرف دس ہزار طبع ہوگا قیمت پانچ پیسے فی نسخہ رکھی گئی ہے یعنی ۱۰/ سینکڑا۔ جو حضرات اس مضمون کی اشاعت میں حصہ لینا چاہیں وہ حسب ذیل پتہ پر مراسلت فرمائیں:ـــ

مہتمم "پیغام حق" ڈاکخانہ جمال پور۔ براہ پٹھان کوٹ (پنجاب)

مقالات

اسلام اور موجودہ مدنی مسائل

از جناب مولانا حکیم محمد عبد الرؤف صاحب دانا پوری

(مولانا ممدوح نے جامعہ ملیہ دہلی کی مجلس دینیات کے سامنے جو مقالہ "اسلام اور موجودہ مدنی مسائل" کے عنوان سے پڑھا تھا، اس کا وہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس میں سیاسیات اور معاشیات پر بحث کی گئی ہے]۔

نظامِ حکومت جب سے انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی، اسی وقت سے کسی نہ کسی پیمانہ پر نظامِ حکومت اور قانون سازی کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ہر زمانہ میں بہترین انسانی عقول اور انسانی قوتیں نظمِ حکومت اور قانون کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں مصروف ہوتی رہی ہیں۔ حکومت کے ہزار ہا نظام اور قوانین کے صدہا اصول بنائے گئے، لیکن مقصودِ اصلی کے لیے کوئی مکمل نظام مرتب نہ ہوسکا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ اجتماعی زندگی میں انسان کی اجتماعی طاقت انسان کی ترقی میں صرف ہوسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو باتیں نہایت ضروری تھیں۔ امن اور حقوق کی صحیح تقسیم۔ انہی دو باتوں کے لیے نظام و قانون سازی کی ابتدا ہوئی۔

مقصد اصلی تو یہ تھا۔ مگر ہوا کیا؟ یہ کہ ایامِ قبل تاریخ و بعد تاریخ (زمانۂ جاہلیت) میں انسان کی اجتماعی طاقت بہت سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی اور انسانی نسل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ وطن اور خاندان اور نسل کی بنا پر بہت سی جدا جدا قومیں بن گئیں اور ساری قومیں اپنے اپنے تفوق اور ر

برتری کا دعویٰ کرنے لگیں۔ حقوق کو صحیح طور پر سمجھنے کے بجائے قومیت کے معیار پر استحقاق کو دیکھا جانے لگا۔ عصبیت قومی سب سے زیادہ قابل تعریف شے سمجھی جانے لگی۔ حق و باطل کا امتیاز قومی تعصبات کے اندر فنا ہو کر رہ گیا۔

زمانۂ وسطیٰ میں نظام حکومت اور قانون سازی کے بے شمار طریقوں کا تجربہ ہوا۔ شخصی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ مخلوط حکومتیں بنیں۔ جمہوری نظام قائم ہوا۔ طرح طرح کے قوانین بنائے گئے۔ بے حد وحساب اصلاحات ہوتی رہیں۔ لیکن زمانۂ جاہلیت کی قائم شدہ قومی تفریق نے سب کو مٹا دیا اور ہمیشہ اس تفریق نے دنیا کو فتنہ و فساد میں مبتلا رکھا۔ قوموں کی قومیں، ملک کے ملک انسانی نسل کی اسی قومی تفریق کی وجہ سے فنا ہو گئے۔

اس وقت جس دور کو انسانی ترقی کا بہت روشن دور سمجھا جاتا ہے، جس میں علوم وصنائع کمال تک پہنچے ہوئے ہیں، اس میں بھی اسی جاہلیت کی قومی تفریق نے سب سے زیادہ آفت مچا رکھی ہے۔ یورپ اس وقت ترقی یافتہ اور سمجھدار خطہ ہے۔ وہاں ہر طرف جمہوری حکومتیں قائم ہیں لیکن جمہوریت کی بنیاد بھی اسی قومی تفریق پر رکھی گئی ہے۔ اس وقت قومیت کے معنی وطنیت کے ہیں، یعنی ایک وطن اور ایک ملک کے باشندے اپنی فلاح و بہبود کے لیے، اپنی قومی و ملکی برتری کے لیے جس طرح چاہیں قانون بنائیں، کوئی قوت ان کو اس سے نہیں روک سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کی ساری قومیں ایک دوسرے کی دشمن ہو رہی ہیں۔ علوم و فنون، فلسفہ و سائنس، صنعت و حرفت جو انسانی ترقی کے ذرائع ہیں، وہاں بڑے سے بڑے پیمانہ پر ان سے انسان کو تباہ و برباد کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ شخصی حکومتوں کے زمانہ میں اشخاص ایک دوسرے کو ستاتے تھے۔ قوی ضعیف پر ظلم کرتا تھا۔ دولتمند غریب پر مصیبتیں نازل کرتا تھا۔ اب جمہوریت کے زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم سے لڑتی ہے۔ طاقتور قوم ضعیف قوم کو تباہ و برباد کرتی ہے۔ دولت مند قوم غریب قوم کو لوٹتی بلکہ فنا کر دیتی ہے۔ بہرصورت علت مشترکہ

جس سے یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، وہی قومی تفریق، وہی جاہلیت کا قومی تعصب، وہی آبائی رسم کی قومیت ہے۔ جمہوریت اور اعلیٰ قانون سازی کے دعووں نے اس کو مٹایا نہیں، اور بڑھادیا۔ اس ناجائز قومیت کے ساتھ جب تک شخصیت تھی دنیا کے لیے وہ عام خطرہ نہ تھا جو آج جمہوریت و قومیت کے جمع ہو جانے سے نظر آ رہا ہے۔

یورپ کے عقلا اور سیاسیین اس وطنیت کے بڑھتے ہوئے فتنوں سے ناواقف نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے لیے یہ مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور یہی چیز اس کو تباہ کر کے رہے گی۔ یورپ نے اس کا ایک علاج سوچا تھا، یعنی انٹرنیشنل کانگریس لیکن انٹرنیشنل قانون کی دھجیاں بکھر چکیں۔ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا۔ جہاں کا ہر شخص نیشنلزم میں غرق ہو وہاں انٹرنیشنل قانون کا مخلص حامی کہاں سے آئے؟ نیشنل قانون کی حمایت ہیں ساری قومیں علٰحدہ علٰحدہ بٹ چکیں، انٹرنیشنل قوم کہاں سے پیدا کی جائے؟

انسان اور انسانی نسل کو وطن یا خاص خاص نسلوں کی بنا پر بے شمار قوموں میں تقسیم کر دینا دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے جو جڑ پکڑ چکی ہے۔ ابتدا میں جب انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی تھی اس وقت حفاظت کے لیے اس کی ضرورت ہوگی۔ مگر آج قومیت کے اس ابتدائی جاہلیت کے معیار کو قائم رکھنا انسانی زندگی کے لیے مصیبت عظمیٰ ہے۔ یہ تقسیم ہمیشہ عالم انسانی کے امن و امان کو تباہ و برباد کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ قومیت کا یہ معیار قائم رہا تو حکومت کے قاعدے میں جس قسم کی تبدیلی بھی کی جائے اس سے دنیا کا امن بحال نہیں ہو سکتا۔ حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری، نازی ہو یا فاسسٹ، سوشلسٹ ہو یا کمیونسٹ، جب تک اس کے ساتھ قومیت اور عصبیت باقی رہے گی، دوسری قوموں کے لیے وہ آفت ہی رہے گی۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ قومیت کے وطنی معیار کو مٹا دیا جائے، اور اس تفریق کے مٹانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک اخوت کی بندش میں شامل ہو جائیں۔

اس عصبیت کا علاج صرف اسلامی تعلیم کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ممکن العمل صورت موجود نہیں ہے۔ اسلام نے بڑی سختی سے عصبیت قومی اور نخوت جاہلیت کو روکا۔ حضور صلعم نے فتح مکہ کے روز اس قومی تفریق اور نسبی تفاخر کو اپنے پیروں سے روند کر مٹا دیا۔ عرب و عجم کو ایک اخوت کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ فرمایا کونوا عباد اللہ اخوانا۔ اور فرمایا المومنون کرجل واحد ان اشتکی عینہ اشتکی کلہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تعلیم سے ایک ایسی قوم پیدا ہوئی جس میں ہزارہا قومیں مدغم ہو کر ایک بڑی قوم بن گئی جس کا نام "مسلم قوم" ہے۔ اس کے اجزاء ترکیبی کو دیکھو تو اس میں صدہا بلکہ ہزارہا ایسی قومیں ملیں گی جن کو ایک دوسرے سے مطلقاً کوئی نسبت نہ تھی۔ ترکی، تاتاری، شامی، عربی، مصری، عراقی، ایرانی، افغانی، حبشی، مغربی، مغل، ہندی، سندھی، چینی اور اقطاع عالم کی بے شمار قومیں ایک رنگ میں رنگ گئیں۔ عقائد و عبادات ہی میں نہیں، معاشرت اور معاملات کے مسائل میں بھی سب ایک ہو گئے۔ کھانا، پینا، حلت و حرمت کا امتیاز، ذبیحہ کا طریقہ، شادی بیاہ، موت و غم، ساری باتوں میں ایک رنگی و یکجہتی پیدا ہو گئی۔

اسلام نے متحدہ قومیت کو اصول قرار دے کر نظام حکومت کے بہت سے ارکان لازمی قرار دیے تھے۔ ان میں سے ایک اہم چیز یہ تھی ایک وقت میں مسلمانوں کی دو مستقل حکومتیں نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان کسی ملک کسی قوم و نسل اور کسی مرتبے کے ہوں، ان پر فرض ہے کہ سب مل کر ایک کو خلیفہ بنائیں اور اسکی بیعت کریں۔ دوسرا کوئی خلافت کا دعویٰ کرے تو اس کی گردن مار دیں۔ ابو داؤد کی روایت ہے من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ۔ اور صحیح مسلم کی روایت ہے۔ اذا بویع للخلیفتین فاضربوا عنق الاخر۔

اسلام نے اس طرح عصبیت قومی کا خاتمہ کر کے فتنہ و فساد کی جڑ کاٹ دی تھی۔ مسلمان اگر اسلام کی اس تعلیم پر مستحکم رہتے تو مسلمانوں کی اندرونی تاریخ آج بالکل دوسری ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اسلام

کی اس اہم اور صریح تعلیم کے موجود رہتے ہوئے بھی قومیت کے جاہلانہ تفاخر کو پوری طرح مسلمان ترک نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی اندرونی خونریزیوں کی تاریخ ایک ایک کر کے پڑھ جاؤ۔ معلوم ہو جائے گا کہ ان سب کی اصل وجہ یہی قومی عصبیت اور جاہلانہ قومی تفاخر ہے۔

جمہوریت قانون سازی کا اختیار ہر قوم کو علیحدہ علیحدہ دیتی ہے اور ہر قوم صرف اپنے فوائد کو پیش نظر رکھ کر قانون بناتی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جمہوریت دوسری سے ٹکرا جاتی ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کیا۔ کسی قوم کو قانون سازی کا اختیار نہیں دیا۔ بلکہ بالحاظ قومیت و وطنیت تمام اہم اور مشترک امور کے لیے قانون یا اصول قانون خود مرتب کر دیا۔ البتہ ملکی خصوصیات اور وقتی ضروریات کے لحاظ سے ضمنی قوانین یا جزوی مسائل کے استنباط کا حق ہر ملک کے مجتہدین اور اہل حل و عقد کو عطا کیا۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے پیمانہ پر حکمرانی کر کے ایک نظیر سامنے رکھدی۔ اس لیے اسلامی دائرے میں رہ کر قومی تصادم کا راستہ مسدود ہو گیا۔

خلفاء راشدین کے بعد مسلمانوں میں بھی اکثر جہالت کا پرانا قومی جذبہ بھڑک اٹھتا تھا اور اسی وجہ سے مسلمانوں کی اندرونی تاریخ بھی آپس کی لڑائیوں سے خالی نہیں۔ تاہم جن قوموں نے اسلام قبول کیا ان میں وہ مغائرت باقی نہیں رہی جو اسلام سے پہلے تھی یا جو اب بھی ان لوگوں میں موجود ہے جو اسی قوم کے لوگ ہیں مگر مسلمان نہیں ہیں۔

مسلمانوں میں بھی مذہبی اختلافات ہیں۔ مگر ان اختلافات سے مغائرت پیدا نہیں ہوتی۔ روئے دنیا میں کوئی قوم ایسی موجود نہیں ہے جس میں اس قسم کے اختلافات موجود نہ ہوں۔ ایسے اختلافات مٹ نہیں سکتے۔ یہ اختلافات علم، فہم، ادراک اور ذکاوت کے فرق کی وجہ سے ہیں۔ جس طرح دو آدمی شکل و صورت میں بجمیع وجوہ یکساں نہیں ہیں، اسی طرح فہم و ذکاوت میں بھی یکساں نہیں ہیں۔ یہ فرق مراتب کی وجہ سے ایک ہی چیز کا مطلب سمجھنے میں اختلاف کرتے ہیں۔ ایسا اختلاف ایک نسل، ایک ملک، ایک

خاندان اور ایک گھر کے افراد میں بھی ہوتا ہے۔ اس سے مغائرت پیدا نہ ہونی چاہیے۔ ایسا اختلاف اگر ضد اور جہالت کی وجہ سے ہو تو برا ہے۔ اور علمی وجوہ کی بنا پر ہو تو باعث رحمت ہے۔

اقتصادیات | دنیا کا دوسرا اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا انتظام ہے۔ ہر ملک کی انسانی آبادی کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جو اپنی کم سے کم ضروریات زندگی بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ بیوہ، یتیم، نابینا، معذور، مجبور، فقرا، مساکین وغیرہ سے کوئی ملک خالی نہیں ہے۔ حکومت اور سلطنت کو ایسے لوگوں کی کفالت کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ ہر ملک میں مستقل انتظام ہونا چاہیے کہ اس قسم کا کوئی انسان بھوکا نہ رہ جائے مگر جہاں تک دنیا کی تاریخ اور حکومتوں کے قوانین کا حال معلوم ہے، کسی سلطنت نے کبھی اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا۔ قوانین ملک میں کبھی ایسے لوگوں کو کوئی مستقل جگہ نہ دی گئی۔ آج ساری جمہوری اور شخصی سلطنتوں کو دیکھا جاؤ۔ جدید تمدن کے سارے مدعیوں کا جائزہ لو۔ ایسے لوگوں کے لیے کوئی مستقل انتظام کسی ملک میں موجود نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی زندگی محض اہل خیر کے رحم و کرم پر موقوف رہی ہے۔ سلاطین یا حکومتوں نے، پہلے یا موجودہ زمانہ میں جب کبھی ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی سلوک کیا ہے تو اسے کبھی وہ اس کے لیے نہ قانوناً مجبور تھے نہ ہیں، اور نہ انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔

اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے اس کو حکومت کا سب سے زیادہ ضروری کام قرار دیا ہے۔ اسلام کا اقتصادی قانون اس بنیاد پر قائم ہے کہ ہر مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح نماز، روزہ اور حج فرض ہے۔ کوئی مسلمان زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار نہیں کر سکتا اور جو انکار کرے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اسلامی حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ بیت المال قائم کرے اور زکوٰۃ کے اموال کو ایسے مجبور لوگوں پر خرچ کرنے کا انتظام کرے۔ اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ اسلامی حکومت جبراً وصول کرے گی۔ اموال باطنہ جن کا حال حکومت کو معلوم نہ ہو سکے، ان کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی ہر مسلمان پر فرض ہے، اور بغیر اس فرض کو ادا کیے نجات نہیں ہو سکتی، البتہ ان اموال کا اختیار مالک

نصاب کو ہے۔ خود مستحقین کو دے دے یا وہ بھی بیت المال میں داخل کر دے۔

اسلام کی تعلیم کی رو سے ملک کے کل اموال نامیہ کا چالیسواں حصہ اور کل پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ، اور کل جانوروں کا ایک مقررہ حصہ ہر سال ایسے لوگوں پر صرف کرنے کیلئے مخصوص ہے، اور اسلامی حکومت ذمہ دار ہے کہ یہ سب مال صحیح طور پر ایسے لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ کیا ابتدائے آفرینش سے اب تک دنیا کے عقلاء نے کسی قوم یا کسی حکومت نے کبھی کوئی قانون یا کوئی قاعدہ ایسا بنایا ہے جو ایسے مجبور انسان کے لیے اس سے بڑھ کر یا اس کے مثل مفید ہو اور قابل قبول بھی ہو؟ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔

سرمایہ داری اور غربت | ہمیشہ ہر ملک اور ہر قوم کی یہ حالت رہی ہے کہ ملک کا مختصر طبقہ دولتمند اور مالدار ہوتا ہے اور اس ملک کا بڑا حصہ غریب اور مفلس ہوتا ہے۔ سرمایہ دار دولت کی طاقت سے غریبوں کو ستاتے ہیں، مجبور رکھتے ہیں، ان سے جفاکشی اور محنت کا کام لیتے ہیں لیکن ان کی اور ان کے اہل وعیال کی ضروریات کے قابل بھی معاوضہ نہیں دیتے۔ انہی غریبوں اور محنت کرنے والوں کی محنت سے بہت کچھ نفع حاصل کرتے ہیں، اور ناجائز عیش وعشرت میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن مزدوروں کا حق المحنت کبھی بالکل نہیں دیتے، کبھی بمشکل بہت کم دیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرمایہ دار سب ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ نہ یہ مطلب ہے کہ سرمایہ داری فی نفسہ بری چیز ہے۔ تمدن ومعاشرت کی ترقی کا ایک ضروری جز سرمایہ ہے۔ علمی اور صنعتی ترقیوں میں زبردست حصہ سرمایہ داروں کا ہے۔ اسلام نے مال کو حیات دنیا کی زینت کہا ہے۔ سرمایہ داری کو خدا کا فضل بتایا ہے۔ دولتمندی خدا کی نعمت ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ سرمایہ داری کے ساتھ کبر وغرور اور ظلم بھی عموماً ساتھ ہی ساتھ آتا ہے جو دنیا کی بدترین لعنت ہے۔

ہمیشہ اور ہر زمانہ میں سرمایہ داری اور دولتمندی کے ان تلخ نتائج کو روکنے کی عقلاء نے کوشش کی مگر قطعاً کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا حتیٰ کہ بڑے بڑے غور و فکر کرنے والے یہ کہنے لگے کہ دنیا غریبوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے یعنی ان مظالم کا سدباب ناممکن ہے، اور مفکرین کی ایک جماعت اس نتیجہ پر پہنچی کہ اصلاح کا طریقہ صرف یہ ہے کہ سرمایہ داری ختم کر دی جائے اور اقتصادی مساوات قائم کر دی جائے۔

اقتصادی مساوات کی تحریک بھی غیر معلوم مدت سے دنیا میں جاری ہے۔ ایک وقت یونانیوں میں اس کا بڑا زور رہا تھا۔ دوسری دفعہ ایران کے مزدکیوں نے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک پورے ایران میں پوری قوت سے اس کو جاری رکھا۔ مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بلکہ سارا ملک تباہی میں مبتلا ہو گیا۔ یہی تحریک کچھ اصلاح کے ساتھ اب سوشلزم کے نام سے تقریباً یورپ کے کل ملکوں میں زور پکڑ رہی ہے اور یہی تحریک کچھ عملی تبدیلی کے ساتھ کمیونزم کے نام سے روس کے نظام حکومت کی بنیاد بنی ہوئی ہے۔

میں نہایت اختصار کے ساتھ عرض کر دونگا کہ مساوات حقیقی یا اقتصادی مساوات کی تحریک جس قسم کی بھی ہو، غیر فطری، غیر مستقل، اور سخت مضر ہے۔ اسلام ایسی تحریکوں کو پسند نہیں کرتا اسلام نے جس قسم کی مساوات کا حکم دیا ہے وہ اور چیز ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

مساوات حقیقی یا اقتصادی مساوات اقتصادی مساوات کو اصول قرار دینے کی اب تک دو صورتیں معلوم ہو سکی ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے جمیع اموال قابل انتفاع میں اباحت مطلقہ ہو، یعنی جس شخص کو جس چیز کی حاجت ہو اس سے کوئی اس کو روک نہ سکے، جیسا کہ مزدکیوں کا اصول تھا۔ اس صورت کا تجربہ ہو چکا کہ اباحت مطلقہ کے ساتھ نظم ملک ناممکن ہے، اور نظم نہ ہو تو تباہی بھی لازم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ملک کی کوئی قابل انتفاع چیز کسی کی ملک خاص نہ ہو، بلکہ سب چیزیں اہل ملک کی مشترک ملک ہوں،

جیسا کہ سوشلزم اور بالشوزم کا مشترک اصول ہے۔ اس صورت میں نظم حکومت ممکن ہے لیکن استقلال ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ملک کی پوری قوت اور ساری دولت عملاً حکومت اور فوج کے اقتدار میں ہوجائے گی گو اسے قانونی الفاظ میں کتنا ہی محدود کیا جائے، اور رعایا کی سیاسی قوت مسلوب ہوجائے گی، اتنی بھی نہ رہے گی جتنی سرمایہ داروں کے نظام جمہوریت میں رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی باگ جب تک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی جو ایثار پیشہ ہوں اور قانون کا اتباع کریں، نظم قائم رہے گا، لیکن اگر ارباب حکومت اور فوج قانون توڑنا چاہیں تو رعایا بالکل مسلوب الاختیار ہوگی اور حکومت کے غیر قانونی افعال کی اتنی بھی مدافعت نہ کرسکے گی جتنی سرمایہ دار ممالک کی رعایا کرسکتی ہے۔

سوشلزم اور بالشوزم کی تحریک کا نتیجہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوری طور پر غربا اور مزدور پیشہ لوگوں کی حالت سنبھل جائے گی، اور ان کو بہت سے مصائب سے نجات حاصل ہوجائے گی۔ یہی چیز ہے جس سے یہ تحریک آبادی کے کثیر حصہ کی دلچسپی و کشش کی باعث بنی ہوئی ہے، مگر ظاہر ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ تحریک ملک کی سخت تباہی اور بربادی کا سبب بنے گی۔ ملک کی تمام مادی و اقتصادی قوت کو ایک جگہ جمع کردینا اور افراد ملک کو بالکل مفلوج بنا دینا سخت خطرناک طریقہ ہے۔ یہ کہنا کہ ملک کی جمع شدہ قوت و دولت قانوناً ملک کے افراد ہی کے قبضہ میں رہے گی، بڑا سخت دھوکا ہے۔ قانونی قبضہ و عملی قبضہ میں بڑا فرق ہے۔ روس کی تحریک ابھی ابتدائی منزل میں ہے، اور اب تک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو مخلص تھے اور اپنے اصول کی خاطر ہر طرح کے ایثار و قربانی کے لیے طیار رہے تھے لیکن ان کے ایثار و قربانی سے تحریک کے خطرناک پہلو کا سدباب نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ اگر اس خطرہ کا سدباب بھی ہوجائے اور دنیا میں اقتصادی مساوات قائم بھی ہوجائے تو یہ چیز دنیا کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔ مضر ہوگی۔ فطرت اور منشاء الٰہی کے خلاف ہوگی دنیا کا تمام کام اختلاف مراتب کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اقتصادی فرق ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے

انسان بڑے سے بڑا مشکل اور خطرناک کام انجام دے سکتا ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے انسان سخت سے سخت دماغی اور جسمانی جد وجہد پر مجبور ہوتا ہے اور یہی جد وجہد اور مسابقت ہر طرح کی علمی و صنعتی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔ فرق مراتب اور مالی امتیازات مٹا دیے جائیں تو علمی و عملی کاموں کی تکمیل بالکل ناممکن ہو جائیگی۔

اسلام نے نہ حقیقی مساوات کی تعلیم دی ہے، نہ اس کو قبول کیا اور جائز رکھا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے حضور نے فرمایا: انزلوا الناس منازلھم۔ امیر کی اطاعت ہر مسلمان کے لیے لازمی قرار دی۔ ہر جماعت اور ہر خاندان کے لیے امیر و مامور کا سلسلہ قائم کر دیا، حتیٰ کہ حکم دیا اذا کنتم ثلثۃ علی سفر فلیؤموا احدکم۔ یعنی تین آدمی سفر میں ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امام بنا لیں۔ امیر و مامور کے علیحدہ حقوق بتا دیے۔ افراد و اشخاص کی ملکیت کو جائز تسلیم کیا، جائداد منقولہ میں بھی اور غیر منقولہ میں بھی۔ اسی بنا پر کسی پر زکوٰۃ فرض ہوئی، کسی پر نہیں کسی کو زکوٰۃ لینے کی اجازت دی، کسی کے لیے حرام کر دیا۔ کسی پر حج فرض کر دیا کسی پر نہیں۔ ملکیت ہی کے جواز پر قانون فرائض کا قانون لازمی قرار دیا۔ کسی شخص کا مال بغیر اجازت جبراً لینا ناجائز کیا۔ حلال مال کے حصول و طلب کی رغبت دلائی۔ تجارت، ملازمت، حکومت، صنعت و حرفت اور مال جمع کرنے کے سارے حلال وسائل کی ترغیب دی۔

یہ ساری باتیں اس پر دال ہیں کہ اسلام نے انسان کے فرق مراتب کو جائز رکھا ہے۔ اور اس کے ملحوظ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ سرمایہ داری کو جائز رکھا ہے اور خاص اسلامی احکام میں بھی اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے۔ باوجود اس کے سرمایہ داری کے مذموم اثرات کو روکنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہے جو نہ سوشلزم سے ہو سکتا ہے نہ کمیونزم سے۔

سرمایہ داروں کے مذموم طریقے جس طرح سائنس فی نفسہٖ مذموم چیز نہیں ہے بلکہ انسان، انسانی قوت انسانی تمدن اور معاشرت کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، لیکن جب اس چیز کو انسان کی ہلاکت و تباہی اور ملک کی بربادی کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ دنیا کے لیے مصیبت بن جاتی ہے، یہی حال

سرمایہ داری کا ہے۔ سرمایہ دار اگر اموال دنیا کو اچھے مصرف میں صرف کریں تو دنیا کو خوشحالی اور نیکی سے معمور کر سکتے ہیں اور جن کو اللہ پاک توفیق عطا فرماتا ہے وہ یہی کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ کی قوت سے غریب اور مفلس لوگوں کی جائدادیں اور مختصر زندگی کا سامان بھی چھین لیتے ہیں اور انہیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

سرمایہ دار کرتے یہ ہیں کہ غریبوں کو لالچ دے کر اپنی طرف کھینچتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کا خون چوس لیتے ہیں۔ دولتمندوں نے دولت کے ذریعہ سے ملک کی دولت جمع کرنے کے بہت سے طریقے ایجاد کیے اور برابر ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ ان ترکیبوں میں سب سے زیادہ اہم اور عام چیز ربوا (سود) کا کاروبار ہے۔ ربوا کا اصول یہ ہے کہ مال بغیر کسی محنت کے خود نفع پیدا کرے اور صاحب مال کسی نقصان کا ذمہ دار نہ ہو۔ تاجر کتنی ہی ہوشیاری و محنت سے کام کرے، کاریگر کتنی ہی جفاکشی و ذہانت سے چیزیں بنائے، نقصان سے بے خطر نہیں ہو سکتا۔ اور سود خوار کتنا ہی کم سود لے مگر اس کا نفع مستقل اور پائدار ہوگا۔ اس کو کسی خطرہ کا اندیشہ نہیں ہے، نہ اس کو جفاکشی اور محنت کرنی پڑتی ہے۔

بیع کی بے شمار قسمیں سرمایہ داروں نے ایسی بنائی ہیں جو صرف کشش زر کا ذریعہ ہیں۔ مثلاً سٹہ یا بغیر مال کے فرضی بیع اور بیع در بیع۔ یہ بیع نہیں ہے، نہ بیع کے لیے کوئی چیز موجود ہوتی ہے محض سرمایہ جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ انشورنس سرمایہ داروں کی نئی ایجاد ہے اور بڑی کامیاب ایجاد۔ زندگی کا بیمہ کرتے ہیں، چیزوں کا بیمہ کرتے ہیں، مکان کا بیمہ کرتے ہیں اور گویا اموال اور زندگی کے تحفظ کا ایک حد تک ذمہ لیتے ہیں اور اسی ذمہ داری کے بدلے بے حساب دولت سمیٹ لیتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ بیمہ کمپنیاں تھوڑے دنوں میں کس طرح یہ دولت سمیٹتی ہیں؟ یہ دولت کہاں سے آتی ہے؟ مزدور اپنا پیٹ کاٹ کر، کاریگر اپنا خرچ گھٹا کر، تاجر اپنے نفع نقصان سے بے پروا ہو کر خوشی خوشی اپنا

اپنا مال ان کمپنیوں کے حوالہ کر رہے ہیں۔

موجودہ دور کی عجیب حالت ہے یہ لوگ سرمایہ داروں کے مظالم سے تنگ آگئے ہیں مختلف ملکوں کا بڑا حصہ سرمایہ داری کو بالکل مٹا دینے کا حامی ہے۔ باوجود اس کے دولتمندوں کے ان تمام ہتھکنڈوں کی تائید کی جارہی ہے جن پر سرمایہ داری کی بنیاد قائم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نمایشی مخالفت کے باوجود سرمایہ داری کو جو طاقت حاصل ہے وہ کبھی نہ تھی۔

اسلام نے نفس سرمایہ داری کو جائز رکھا ہے، مگر اس سرمایہ داری کو جو حلال صحیح اور غیر مشتبہ طریقہ سے حاصل ہو۔ سرمایہ داروں کے تمام مکر و فریب کے طریقوں کی اس نے سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے اور سب کو ناجائز اور حرام کہا ہے۔ سود، جوا، سٹہ بازی، بیمہ یعنی قسمت کی بازی، بیع کی ساری مجہول اور فرضی قسمیں، سب ناجائز اور حرام ہیں اور جو سرمایہ ان طریقوں سے جمع ہو وہ بدترین سرمایہ ہے۔

ربوا یعنی سود خواری! اسلام نے سود خواری کی بڑی سختی سے مخالفت کی ہے۔ سود خواری کو خدا کے ساتھ جنگ کہا گیا ہے۔ حضور صلعم نے سود خواروں کے ساتھ کبھی مصالحت نہ کی۔ نجران کے نصاریٰ کے ساتھ مصالحت کرتے وقت جو صلح نامہ لکھا گیا اس میں صاف طور سے حضور نے ظاہر کر دیا کہ تم میں سے جو صاحب وجاہت سود کھائے گا اس کا میں ذمہ نہیں لیتا۔ اطراف مدینہ میں یہود کے قبائل آباد تھے اور بڑے سود خوار تھے۔ یہود مشہور سود خوار قوم رہی ہے۔ ان کا مدینہ کے اطراف میں رہنا آپ نے کسی شرط پر منظور نہ کیا۔ قرآن پاک نے سود خوار کی سزا خلود فی النار بتائی ہے جو کفر و عناد کی انتہائی سزا ہے۔ یہ سب سختیاں اسی لیے ہیں کہ سود خواری کے ساتھ دنیا کی اقتصادی حالت کبھی درست نہیں ہو سکتی۔

سود کی حالت یہ ہے کہ مال مقررہ نفع پر غریبوں میں، تجارت کرنے والوں میں کاریگروں میں

مزدوروں میں اور کاشتکاروں میں پھیل جاتا ہے اور ان سب کی محنت و مزدوری کی کمائی کا ایک مستقل حصہ سرمایہ دار کے پاس جمع ہوتا رہتا ہے۔ ہر کام میں خسارہ اور نقصان بھی ہوتا ہے۔ وہ سارا نقصان محنت کرنے والے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سرمایہ دار اس نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ نقصان کی حالت میں بھی وہ اپنا نفع غریب سے وصول کرتا ہے۔

سودخوار سب سے پہلے اپنے دوستوں کو، اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کو، پھر ان سب کو جو اس کے ساتھ معاملہ کریں تباہ کر دیتا ہے۔ اور دوستی و ہمدردی کے ساتھ ان کا سب کچھ لوٹ لیتا ہے۔ ہمیشہ سے یہود دنیا کی مشہور سودخوار قوم ہے۔ اسی لیے یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ جو ان میں دولت مند ہیں ان کی دولت کی انتہا نہیں ہے اور جو غریب ہیں ان کی پستی و ذلت کی بھی انتہا نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی ایک قوم ویش (بنیا) مہاجن اور سودخواری میں مشہور رہے۔ اس قوم کی سرمایہ داری اور دولت مندی کی بھی انتہا نہیں ہے، مگر یہ دولت کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی؟ اپنی ہی قوم کی غریب جماعت کو ان مہاجنوں نے تباہ کر دیا، ان کی کوڑی کوڑی چھین لی اور شودر بنا دیا، تب یہ دولت جمع ہوئی ہے اور اب بھی اسی سودخواری کی لوٹ سے تباہ ہو ہو کر بہت سے کاشتکار اور مزدور پیشہ شودر بنتے جا رہے ہیں جن کا کوئی پوچھنے والا تک نہیں۔

یہود سودخواروں نے بالخصوص اور سرمایہ داروں نے علی العموم اس وقت دنیا میں بینکنگ کا جال پھیلا دیا ہے اور اس ذریعہ سے دنیا کی تجارت، صنعت، محنت اور دنیا کی پیداوار پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ کوئی شخص تجارت، پیداوار، دماغ سوزی اور محنت سے منتفع نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان سرمایہ داروں کو اس میں سے کچھ حصہ نہ دے دے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ کیا یہ کہ ان کے روپے چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیے جائیں اور ان کو پھر ویسا ہی جال پھیلانے کی اجازت دے دی جائے؟ یا یہ کہ اس جال کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا جائے، یعنی سودی معاملات کو روک دیا جائے تاکہ ہمیشہ کے لیے

...... ان مظالم کا قطعی سدباب ہو جائے ؟

بعض اصحاب جو اقتصادیات سے قطعاً نابلد ہیں کہا کرتے ہیں کہ ایسی سودخواری جس میں سود زیادہ لیا جائے اور حاجت مندوں یا مفلسوں سے لیا جائے بے شک بری ہے، مگر تاجروں کو جو روپیہ سود پر دیا جائے کہ وہ تجارت کریں یا جو روپیہ بنکوں سے سود کا لیا جائے اس کی برائی کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ تجارت کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ ایسے لوگوں کو شائد معلوم نہیں ہے کہ بنک کا کام کیا ہے اور جو روپیہ بنک سے سود کا ملتا ہے وہ دولت مندوں کا ہوتا ہے یا غریبوں کا۔ بنک کو مدد دینا اپنی قوم اپنے ملک اور ملک کے غریب طبقے اور چھوٹے تاجروں کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ بلکہ بنک میں روپیہ جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ظالمانہ کام کو وسیع پیمانہ پر جاری کر سکے۔ غریب تاجر، غریب کاشتکار، غریب کاریگر سے بڑی رقمیں سود کی وصول کرے اور ان میں سے ایک حصہ ان لالچی جمع کرنے والوں کو بھی دیتا رہے۔ سود کا روپیہ دولت مندوں کے سرمایہ میں سے نہیں ملتا۔ غریبوں ہی کی جیب سے نکل کر آتا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض کمزور مسلمان سرمایہ داری کے خلاف بھی ہیں اور ظالم سود خواروں کو دولت مند دیکھ کر سودخواری کے جواز کے خواہشمند بھی ہیں۔ اسلامی تعلیم میں اصلاح کے طالب ہیں۔ علماء کے اس پرانے خیال پر روتے ہیں کہ انہوں نے سود سے روک کر ہمیں غریب بنا دیا بعض مولویوں کو ملا کر کم از کم بنک کے سود کے جواز کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کے خلوص اور نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہتا، مگر اس مسئلہ پر مزید غور و فکر کی دعوت دیتا ہوں اگر مسلمانوں میں ہندو کروڑپتی مہاجنوں کی طرح کوئی سودخوار جماعت پیدا نہیں ہوئی تو یہ رونے کی چیز نہیں ہے۔ رونے کی چیز وہ ہوگی کہ غریبوں کو ہم خود لوٹنے لگیں یا خود نہ لوٹیں مگر لوٹنے والوں کی مدد کریں اور لوٹ کے مال میں حصہ بانٹنے لگیں۔ اگر ہم اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ہم میں کروڑپتی

(صاحب) پیدا ہوں تو ہمیں یہ بھی پسند کرنا پڑے گا کہ ہم میں تباہ حال شودر بھی پیدا ہوں کیونکہ کروڑپتی زیادہ تر اپنی ہی قوم کو لوٹ کر کروڑپتی بنتے ہیں۔

الغرض دولت اور سرمایہ دنیا کے تمام کاموں کا ایک ضروری جزو ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت، علمی ترقی، فنون کی تحصیل، سب کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اسلام نے محنت اور جفاکشی کی طرح سرمایہ کو بھی حصول انتفاع کا ذریعہ تسلیم کیا ہے لیکن جفاکشی اور محنت کرنے والا جس طرح نفع کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سرمایہ دار کو بھی نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ اگر تبادلہ میں کوئی حصہ بغیر معاوضہ و بدل کے لیا جائے، یا سرمایہ کے عوض صرف مقررہ نفع لیا جائے اور نقصان کا سرمایہ دار ذمہ دار نہ ہو تو ایسا معاملہ ناجائز اور حرام ہوگا۔ نہ کوئی مسلمان خود ایسا معاملہ کر سکتا ہے، نہ ایسی قوم کیساتھ موافقت کر سکتا ہے جو اس طرح کا معاملہ کرے۔

مسلمانوں پر منجملہ اور فرائض کے ایک فرض یہ بھی ہے کہ دنیا سے ایسے ظالمانہ کاروبار کو مٹائیں کیونکہ یہ چیز دنیا کے کمزور طبقہ کی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

شکر

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

شکر ہر صحیح فطرت میں ودیعت ہے کوئی متنفس اس جذبہ سے خالی نہیں ہے۔ ہر دل کی پیدا ہے اس لیے اس کی صداؤں سے اعراض کرنا درحقیقت اپنی فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ ہمارے باطن کی تمام کائنات اسی چراغ سے روشن ہے اور پھر اسی کا پرتو ہے جو ہماری اس مادی زندگی کی ظلمتوں کو دور کرتا ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ جذبہ نہ ہو تو وہ بھی ایک حقیر جانور ہے۔ اسی سے انسان کی وہ اصلی خصوصیتیں ظہور میں آتی ہیں جن کی بدولت وہ دنیا و آخرت کی تمام سرفرازیاں حاصل کرتا ہے۔ قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانی خصائل اخلاق اور تمام صحیح اعمال و عقائد کا سرچشمہ یہی ہے۔ یہ باب آخرت بھی ہے اور کلید دنیا بھی۔ روح اخلاق بھی ہے۔ اور روح سیاست بھی خلاصہ قرآن بھی ہے اور مقصود سنت نبوی بھی۔ پس جو شخص اس جذبہ سے محروم ہے وہ گویا ہر چیز سے محروم ہے۔ یہ ایک چیز کھو کر اس نے ہر چیز کھو دی۔

اس تمہید کے بعد ہم اجمالاً اس لفظ کی اصل حقیقت کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

شکر کا مفہوم شکر نام ہے اس جذبۂ محبت کا جو خدا کی صفات ربوبیت و رحمت میں غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ شکر نام ہے اس کیفیت کا جو مظاہر قدرت ربانی کے مشاہدہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کیفیت کا پہلا ثمرہ ایمان ہے۔ اگر یہ کیفیت نہ ہو تو دل کا عالم یکسر ظلمات ہے اور قرآن مجید نے اس حالت کی تعبیر کفر کے لفظ سے کی ہے۔

شکر مبادی دین کا سرچشمہ ہے شکر تمام مبادی دین کا سرچشمہ ہے۔ اسی سے توحید و معاد کے اذعان

راہ کھلتی ہے اور اسی سے آدمی کو ایمان بالرسالت کے لیے دلیل ہاتھ آتی ہے۔ ذیل میں ہم اپنے دعوے کی بعض دلیلیں اجمالاً بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے:

۱۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۔ اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو اللہ کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے اللہ قدردان اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں فرمایا۔ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ۔ اگر تم نے شکر کیا اور ایمان لائے اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی اصل شکر ہے۔ آدمی میں جب یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے تب ہی اس پر ایمان کی راہ کھلتی ہے۔

۲۔ قرآن پاک کی موجودہ ترتیب سے بھی ہمارے دعوے کے لیے ایک دلیل ہاتھ آتی ہے

قرآن مجید میں سورہ فاتحہ تمام سورتوں سے پہلے ہے اور اس کے متعلق یہ بالاتفاق تسلیم ہے کہ وہ سورۂ شکر ہے۔ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ دین کی تمام تعلیمات کا سنگ بنیاد شکر ہے اسی سے اس کے تمام مبادی پیدا ہوتے ہیں۔ شائد اسی وجہ سے فاتحہ کا نام ام القرآن بھی ہوا۔

تفصیل بالا سے شکر کی مرکزیت ثابت ہو گئی ہو گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دینی و دنیاوی ترقیوں میں اس کا کہاں تک دخل ہے؟

شکر دینی و دنیاوی ترقیوں کی اساس ہے

قرآن پاک کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر اسلامی زندگی کے لیے سراسر باعث حیات ہے اور اس کا فقدان اس کے لیے ہلاکت و تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں نے اسی حقیقت کو پا کر ایسی درخشاں ترقی کی کہ اس قسم کا عروج چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن جس وقت سے مسلمانوں نے اس عظیم الشان اصل کو چھوڑا ان کی رفعت کا قصر آناً فاناً میں ڈھ گیا۔ نہ تو ان کے پاس تخت و تاج ہی رہا، اور نہ اخلاقی طاقت ہی کہ وہ

الک رہ گئے۔ اسی پر معاملہ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اقوام عالم کی فہرست میں ان کا نام پست ترین قوموں کے سلسلہ میں آنے لگا ایسا کیوں ہوا؟ اس کا محض ایک سبب ہے۔ وہ اسی حقیقت کا (جسے شکر سے تعبیر کرتے ہیں) فقدان ہے۔ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ثابتہ ہے۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ .... (۷۔ ابراہیم)	اور جب اعلان کردیا تمہارے پروردگار نے کہ اگر شکر کروگے تو زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو پھر میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ یہ سنت الٰہی ہے کہ ہر وہ جماعت جس میں شکر کا جذبہ ہوگا وہی انعامات الٰہی سے متمتع ہوگی اور جو اس دولت سے محروم ہوں گے ان کے لیے دنیا میں بھی محرومی ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا کا یہ اٹل قانون ہے؛ اس میں تخلف ناممکن ہے۔ امت مسلمہ پر بھی خدا کی یہ سنت جاری ہوئی۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔

ایک دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

إِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ (۷۔ زمر)	اگر تم ناشکری کروگے تو خدا تمہاری حمد کا محتاج نہیں ہے وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔ اور اگر تم اس کی شکرگزاری کروگے تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے لیکن کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا اس کے بعد اپنے رب کی طرف تمہیں پلٹنا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دے گا، اس لیے کہ وہ سینوں کے اسرار سے (بھی) واقف ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ پیدا ہے کہ رضوان الٰہی کے حصول کا ذریعہ محض شکر ہے۔ اس کے بغیر نہ تو کسی کی آئندہ زندگی ہی کی تعمیر ممکن ہے اور نہ دنیا ہی میں کوئی نمایاں درجہ حاصل ہو سکتا ہے اس لیے کہ ہر قسم کے امتیازوں کی کلید خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ اس کے تمام امور حکمت پر مبنی ہیں۔ اسی لیے انعامات سے وہی لوگ لطف اندوز ہوں گے جو شکر کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ مذکورہ بالا آیت اس بارے میں حجت قاطعہ ہے۔

اوپر کی تشریح سے یہ حقیقت ذہن نشین ہو گئی ہو گی کہ دینی و دنیاوی ترقیوں کا حصول یکسر شکر پر مبنی ہے۔ اس کے بعد اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ انسان ہی کے لیے شکر کی صفت مخصوص نہیں ہے بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہے۔ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اس کی نغمہ ریزی مذکور ہے۔

سورۂ حدید میں ہے:۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۱۔ حدید)	آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہیں۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ...... (تغابن)	آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کی تسبیح کر رہی ہیں اسی کے ہاتھ میں بادشاہت ہے اور اسی کے لیے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

ایک دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ	آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب

الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ.... (۱- جمعہ)۔ | اس خدا کی تسبیح کر رہی ہیں جو بادشاہ پاک غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر یوں مذکور ہے۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ۔..... (۲۶- روم)۔ | اور اسی کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں ہیں سب اسی کے سامنے سرنگوں ہیں۔

مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے کہ خدا کی حمد و تسبیح انسانوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی بے پناہ قدرت و جلال کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ کسی کو اس کی عبدیت سے انکار کی تاب نہیں ہے۔ یہ سب کے سب اس کی حمد میں نغمہ ریز ہیں اور غافل انسان کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی اپنا ساز چھیڑے تاکہ دونوں کے نغموں سے آسمان و زمین گونج اٹھیں۔

سورۂ نور میں ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ........ (۱۴۔ نور) | کیا دیکھتے نہیں کہ آسمانوں اور زمینوں میں جتنی چیزیں ہیں سب کی سب خدا کی تسبیح میں لگی ہوئی ہیں اور اڑتے ہوئے جانور پر کھولے ہوئے ہر ایک کو اس کی تسبیح معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہے۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ.... (۱۵۔ رعد) | اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں صبح و شام برضا و رغبت یا مجبوراً سجدہ کر رہی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شکر ایسا وظیفہ ہے جس سے کائنات کا کوئی ذرہ بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر ایک طوعاً وکرہاً اس کی عظمت وجلال کے سامنے جبین نیاز جھکانے پر مجبور ہے۔

سورۂ رحمٰن میں ہے۔

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔ (۵-رحمٰن) اور سورج اور چاند ایک خاص انداز سے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوا کہ شمس وقمر کا ایک خاص مقدار سے اپنے اپنے حدود میں چکر لگانا یہی ان کی نماز ہے۔

ایک اور مقام پر اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا۔

خدا پاک ہے ان کی افترا پردازیوں سے، آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے بیشک خدا حلیم اور بخشنے والا ہے۔

(۴۳-۴۴-بنی اسرائیل)

الغرض قرآن پاک میں بے شمار ایسی آیات مذکور ہیں جن سے شکر کی ہمہ گیری اور فطرت کائنات ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ آخر یہ جذبہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ قرآن پاک نے اس سوال کا متعدد جگہ جواب دیا ہے۔

شکر کے محرکات | قرآن پاک کے استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار مقامات پر خداوند تعالیٰ نے اپنی نعمتوں سے شکر کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔

۱

سورۂ نحل میں ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ	اور اللہ ہی نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں نکالا
لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ	ہے اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تم کو کان
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	۲ اور آنکھیں اور دل دیے تاکہ تم شکر ادا کرو۔ دیکھتے
اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ	نہیں پرندوں کو کیسے فضا میں بندھے ہوئے ہیں انھیں
مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	کوئی نہیں سنبھالتا بجز خدا کے۔ ضرور اس میں ایمان
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ وَاللّٰهُ جَعَلَ	والوں کے لیے بڑے بڑے دلائل ہیں۔ اور خدا ہی
لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ	نے تمہارے لیے رہنے کے لیے گھر بنا دیے ہیں اور
مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا	اسی نے چوپایوں کی کھال سے تمہارے سفر و حضر کے
يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ	لیے ہلکے ڈیرے بنا دیے ہیں اور ان کے اُون اور
اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا	بالوں سے سامان بنا دیا ایک مدت تک کیلیے اور تمہارے
اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ وَاللّٰهُ جَعَلَ	لیے اپنی مخلوقات سے سایہ کا سامان کیا اور پہاڑ
لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ	میں چھپنے کی جگہیں بنا دیں اور بنائے تمہارے لیے ایسے کرتے
مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ	جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے اور ایسے کرتے جو بچاتے
تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ	ہیں لڑائیوں سے، اس طرح وہ اپنی نعمت کا
يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ	تمہارے لیے اتمام کرتا ہے شاید کہ تم اس کی اطاعت
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ	قبول کرو۔ پس اگر وہ روگردانی کریں تو کچھ پروا نہیں)
الْمُبِيْنُ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا	تجھ پر تو محض تبلیغ ہے۔ یہ خدا کی نعمت پہچان کر اسکا
وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ...... (نحل ۷۸-۸۳)	انکار کرتے ہیں اور اکثر ان میں ناشکرے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے وجوب شکر کے متعدد پہلو نکلتے ہیں۔

(۱) انسان اپنے وجود میں خدا کا محتاج ہے۔ اس نہج سے بھی اگر غور کیا جائے تو اس نیا وجوب شکر کی بہت بڑی دلیل ہے۔

(۲) خداوند تعالیٰ ہی نے انسان کو قوائے مدرکہ سے آراستہ کیا ہے۔ اس لیے ان قویٰ کا ایسا استعمال ہونا چاہیے جس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو۔ اس میں بھی شکر کے وجوب کی بہت بڑی دلیل ہے۔

(۳) دنیا میں جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے ہر ایک کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی غرض ہے۔ کوئی پانی برسانے پر مامور ہے تو کسی کے ذمہ موسم کا خوشگوار بنانا ہے کسی میں حرارت کا مادہ ہے تو کسی میں برودت کا تو ضرور ہے کہ انسان جو خلاصۂ کائنات ہے اس کی پیدائش کا بھی کوئی اہم مقصد ہو۔ قرآن نے ان کی زندگی کا نصب العین شکر قرار دیا ہے اور یہی انسان کی فطرت بھی ہے اس لیے کہ ہر انسان جس میں نظر و فکر کا مادہ ہے جب وہ اپنے آپ کا اور نظام عالم کا مطالعہ کرے گا تو بے اختیار ہو کر خلاق عالم کے سامنے اپنی جبین نیاز ڈال دے گا۔

ایک اور مقام پر انعامات الٰہی سے شکر پر یوں استدلال کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (۱۲۔جاثیہ)	خدا ہی نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا ہے تاکہ اس میں کشتیاں چلیں اس کے حکم سے اور تاکہ تم اس کا فضل چاہو اور شاید کہ تم شکر ادا کرو۔

ایک اور جگہ نہایت تفصیل سے خدا نے اپنی نعمتیں یاد دلا کر شکر پر ابھارا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ یُنْۢبِتُ	خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا ہے جسے تم پیتے ہو اور اسی سے درخت اگتے ہیں جن سے تم چراتے ہو۔

لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (۱۰-۱۴ النحل)۔

تمہارے لیے اگاتا ہے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے۔ اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں نشانی ہے اور اسی نے تمہارے لیے مسخر کر دیا رات اور دن اور سورج اور چاند اور تاروں کو۔ سب اس کے حکم کے ماتحت ہیں ضرور اس میں عقلمند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور جو بکھیرا ہے تمہارے لئے زمین میں جس کے رنگ مختلف قسم کے ہیں۔ اس میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے۔ اور اسی نے دریا کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور نکالو جسے تم استعمال میں لاتے ہو اور تم دیکھتے ہو اس میں کشتیاں جو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم خدا کے فضل کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔

دیکھیے مذکورہ بالا آیات میں جو چیزیں مذکور ہیں کیا ان میں سے کسی ایک پر بھی انسان کا تصرف ہے کیا انسان کے حکم سے پانی برس سکتا ہے؟ اور کیا زمین اس کی خواہش پر اس کے لیے اپنے خزانے اگل سکتی ہے؟ اور کیا درخت میں اس کے اشارے سے پھل آ سکتا ہے؟ اور کیا اختلاف لیل و نہار میں اسے ذرا بھی دخل حاصل ہے؟ غالباً ہر شخص بلا تردد ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دے گا کہ "یہ ضرور ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہماری ہی فائدہ رسانی کے لیے ہے۔ اس لحاظ سے یہ پورا کارخانہ ہمارا خادم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس پورے کارخانہ کی

پاک کسی اور ہی طاقت کے ہاتھ میں ہے جس کے حکم کے بغیر آسمان وزمین میں کوئی انقلاب نہیں ہو سکتا۔ ہے
میں انسان کی بے بسی کا جب یہ عالم ہے تو پھر اسی کا شکر بھی ہونا چاہیے جس نے یہ سب کچھ اسے عطا کیا
اس لیے نہیں کہ وہ شکر کا بھوکا ہے بلکہ اس لیے کہ ہم اس کی نوازشوں کے زیادہ سے زیادہ مستحق
ہو سکیں۔ مذکورۂ بالا آیات میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

تفصیل بالا سے یہ حقیقت محتاج بیان نہ رہی کہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں مہربانی مقتضی ہے کہ انسان زیادہ
سے زیادہ اس کا شکر ادا کرے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شکرگزاروں کے لیے خدا کی طرف سے دنیا
میں بھی تائید ہوتی ہے اور آخرت میں بھی دونوں جگہ وہی اس کے الطاف کے مستحق ہوں گے جو اس کا
شکر بجا لائیں گے۔

شکرگزاروں کے ساتھ خدا کی تائید دنیا و آخرت میں۔	قرآن پاک کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں ان کی تائید دنیا میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی

وہی نعمائے الٰہی سے محظوظ ہوں گے۔

سورۂ قمر میں مذکور ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ ۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۔ نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۔ (۳۳ - ۳۵ القمر)

لوط کی قوم نے تنبیہوں کو جھٹلایا۔ ہم نے ان پر پتھر برسائے بجز آل لوط کے کہ ہم نے انھیں سحر کے وقت نجات دی یا بطور احسان کے اپنی طرف سے ہم نے کیا اور ہم اس طرح شکرگزاروں کو جزا دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم ناشکری کے جرم میں ہلاک کردی گئی
اور لوط اور ان کے اتباع پر محض ان کی شکرگزاری کی برکت سے آنچ تک نہ آئی۔ بلکہ یہ انھیں کی
طرف سے خدا نے پرستاران باطل سے انتقام لیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو جماعت جذبۂ شکر سے

معمور ہوگی، اس کے دشمنوں کا خدا بھی دشمن ہوگا۔ اور اس کے دوستوں کا خدا بھی دوست ہوتا ہے

ایک اور جگہ یوں مذکور ہے۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ...... (۱۳-۱۴، قمر)

اور ہم نے اسے اٹھالیا ایک تختوں اور میخوں والی پر جو چلتی تھی ہماری نگرانی میں۔ اس شخص کو جزا دینے کے لیے جس کا انکار کیا گیا تھا۔

ان آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح کی تباہی بھی اسی لیے عمل میں آئی کہ وہ کفران نعمت کے جرم کی مرتکب ہوئی۔

جس طرح دنیا میں شاکروں کے ساتھ خدا کی عنایت شامل حال ہوتی ہے اسی طرح آخرت میں بھی ان کے لیے سرخروئی حاصل ہوگی۔

سورہ آل عمران میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ۔ (۱۴۵- العمران)

اور کسی پر موت نہیں طاری ہو سکتی۔ الا یہ کہ اذن الٰہی ہو جائے (جس کے لیے ایک وقت ٹھیرا دیا گیا ہے۔ جو دنیا کا ثواب چاہتا ہوا ہے ہم دنیا ہی میں ثواب دیدیتے اور جو کوئی آخرت کے ثواب پر نظر رکھتا ہے اسے آخرت کا ثواب دیتے ہیں اور ہم شکر گذاروں کو ان کی نیک عملی کی جزا ضرور دیں گے

دیکھیے مذکورۂ بالا آیت میں تصریح ہے کہ شاکر بندوں کے لیے خدا کے حضور میں بڑے بڑے انعامات ہیں۔ ذیل کی آیات اس بارے میں حجۃ قاطعہ ہیں ملاحظہ ہوں۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ

بلاشبہ ابراہیم ایک پوری امت تھا اللہ کے آگے جھکا ہوا تھا ہرگز مشرکین میں سے نہ تھا وہ اللہ کی نعمتوں

اُجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ۔ (نحل ۱۲۰۔۱۲۱) نعمتوں کا شکر بجا لانے والا تھا؛ خدا نے اُسے برگزیدگی کے لیے چن لیا اور سیدھے راستہ کی ہدایت دی اسے دنیا میں بھی ہم نے بہتری دی اور آخرت میں بھی، اور بلاشبہ آخرت میں اس کی جگہ صالح انسانوں میں ہوگی۔

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم کو اسی شکر ہی کی بدولت دنیا و آخرت دونوں میں سربلندی و سرخروئی حاصل ہوئی۔

التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح

تالیف جناب مولٰنا محمد ادریس صاحب کاندہلوی

مشکوٰۃ شریف علم حدیث کی مشہور و مستند کتابوں میں سے ہے جس میں صحاح ستہ اور دوسری معتبر کتب حدیث کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف نے عربی زبان میں اس کی شرح لکھی ہے جس کے متعلق مولٰنا انور شاہ صاحب مرحوم جیسے علامہ اجل کی شہادت ہے کہ اب تک اس کتاب کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ اس میں پچھلی تمام شرحوں کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں۔ اور ان پر حسب ذیل خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے:-

۱۔ اسرار شریعت اور حقائق و معارف اسلامیہ کے بیان کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ (۲) ہر باب کی ابتدا میں اس کے مضمون کے متعلق تمام آیات قرآنیہ جمع کر دی گئی ہیں تاکہ حدیث اور قرآن کے درمیان مطابقت واضح ہو جائے۔ (۳) صحابہ و تابعین کے مذاہب مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب فاضل مؤلف نے خود دمشق جا کر چھپوائی ہے، کاغذ اور طباعت بہترین ہے، چار جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ دو جلدیں عنقریب چھپ کر آنے والی ہیں، قیمت ہے۔ کلداز عہ حالی علاوہ محصول ڈاک۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

انبیاء کرام کی بشریت و ملکوتیت

(از جناب مولوی محمد ایوب صاحب عثمانی۔ اورنگ آباد ضلع گیا)

اگرچہ دائرۂ بشریت میں نبوت و رسالت کا وجود انسانی کسب و اکتساب کا نتیجہ نہیں ہے اور انبیاء و رسل کا بزرگ وجود عام مجمع انسانی سے بہت بلند ہوتا ہے لیکن اس اعتبار سے کہ تمام انسانی اوصاف ان میں موجود ہوتے ہیں اور ان بزرگوں کی جماعت نسل انسانی سے خارج نہیں ہوتی، یہ تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی جماعت میں کا ہر نبی و رسول بشر تھا۔ اگر قرآن ان کی بشریت کا ذکر نہ بھی کرتا تو یقیناً ان کی بشریت ثابت تھی لیکن باوجود اس کے قرآن نے ان کے بشر ہونے کی تصریح کی ہے تاکہ ان کی طرف الوہیت کو نسبت دینے کا شائبہ تک نہ رہے۔ چنانچہ تمام نبیوں کے سرتاج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے بشر ہونے کا اعلان فرمائیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱۶-۳) آپ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں بس ایک بشر ہوں جیسے تم ہو۔

جب اعجاز قرآن اور سیرت مطہرۂ نبوی سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت مبرہن ہو جاتی ہے اور انکار کی مجال باقی نہیں رہتی تو منکرین رسالت ان دلائل و براہین کے سامنے مبہوت و متحیر ہو کر آپ پر ایمان لانے کے لیے خوق العادہ چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ اس پر آپ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ اپنے بشر ہونے کا اعلان فرمائیں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا اور کافروں نے کہا کہ ہم تو تیری بات کا یقین

مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ۞ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۞ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۞ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (بنی اسرائیل ۱۰)

جب ہوگا کہ تو ہمارے لیے زمین کے اندر سے ایک چشمہ جاری کردے یا کھجور اور انگور کا کوئی باغ ہو اور تو اس کے بیچ میں نہریں بہت بہا دے یا جیسا کہ تیرا دعوی ہے ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرادے یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرے یا تیرے لیے سونے کا کوئی گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے آسمان پر چڑھنے کا یقین بھی جب ہوگا کہ تو ہمارے پاس ایک کتاب اتار لائے جس کو ہم پڑھیں اے رسول تو ان سے کہدے کہ میرا خدا تمام عیبوں سے پاک ہے بھلا میں اس کے سوا اور کیا ہوں کہ ایک انسان ہوں (خدا کا) پیغام پہونچانے والا۔

قرآن میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی خبر دی گئی اور آپ کے لیے موت اور قتل کی دو انسانی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو بشری صفات میں سے ہیں۔

مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ (آل عمران رکوع ۱۵)

محمد صرف ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول گذر چکے ہیں کیا اگر وہ قضا کر جائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کے متعلق جاہلوں نے الوہیت کا جو اعتقاد گھڑ لیا تھا اس کی تردید کے لیے پرزور طریقہ سے کہا گیا کہ وہ دونوں انسان تھے اور انسانوں کی طرح کھانا کھاتے تھے۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ

مریم کا بیٹا مسیح بس ایک رسول تھا اس سے پہلے

مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ وَ اُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ ؕ کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ ۔ (مائدہ ع ۱۰) اور بھی رسول گذر چکے ہیں اور اس کی ماں صدیقہ تھی اور یہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔

کفار کہتے تھے کہ رسول کسی فرشتے کو ہونا چاہیے ان کے نزدیک یہ بڑے اچنبھے کی بات تھی کہ انہی جیسا ایک انسان پیغمبر ہو۔ اس لیے جب آنحضرت صلعم نے ان کے سامنے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا تو انہوں نے آپ کے دعوے کو ماننے سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ آپ انسان تھے اور معمولی انسانوں کی طرح چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے۔

وَ قَالُوْا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَلَکٌ فَیَکُوْنَ مَعَہٗ نَذِیْرًا اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْہِ کَنْزٌ اَوْ تَکُوْنُ لَہٗ جَنَّۃٌ یَّاْکُلُ مِنْھَا وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۔ فرقان ۱۰ اور کافروں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ اس کے پاس کوئی ایسا فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس غیب سے کوئی خزانہ اترتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ کھاتا اس بنا پر ظالموں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ تو ایک ایسے شخص کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعتراض کا جواب یہ بتایا جاتا ہے کہ کھانا کھانا اور بازاروں میں چلنا پھرنا صرف آپ ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ آپ سے پہلے بھی جتنے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں سب کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّھُمْ لَیَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ ۔ (فرقان ع ۲) اور تجھ سے پہلے ہم نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب ہی کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں پھرتے تھے۔

اور کافروں کا یہ جو خیال تھا کہ بھلا انسان کیسے نبی ہو سکتا ہے تو اس کی تردید میں فرمایا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی جتنے پیغمبروں کو ہم نے بھیجا وہ سب انسان تھے اور ان میں کوئی بھی فرشتہ نہ تھا اور نہ ان کا جسم کھانا کھانے سے بے نیاز تھا اور نہ وہ ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ۔ (انبیاء ع ۱)	ہم نے تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں وہ سب مرد آدمی ہوتے تھے جن کے پاس وحی بھیجی جاتی تھی اگر تم کو معلوم نہ ہو تو اہل کتاب سے دریافت کر لو۔ اور ہم نے ان پیغمبروں کا جسم ایسا نہیں بنایا تھا کہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے

کفار کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ نبی ہی کیا جسے دائمی زندگی حاصل نہ ہو، معمولی انسانوں کی طرح مرنے والا اور قضا کے پیالے کو پینے والا آدمی بھی کہیں نبی ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (انبیاء-۳)	اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کے لیے ہمیشگی نہیں بنائی اگر تو مر جائے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟ موت کا مزہ تو ہر نفس کو چکھنا ہے۔

جب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت اور دعوت توحید و ایمان کی آواز اہل مکہ کے کانوں میں پہنچی تو جس شئے نے تسلیم رسالت اور قبول ایمان سے ان لوگوں کو باز رکھا وہ یہی خیال تھا کہ آپ بشر ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی بشر کو رسول نہیں بنا سکتا۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ جب لوگوں کے پاس ہدایت بھیجی گئی تو انھیں ایمان سے

الْهُدٰىٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۱۱)

ہدایت آ چکنے والی چیز بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ وہ کہتے تھے کیا خدا نے انسان کو رسول بنا بھیجا ہے؟

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں شریک ہو کر آپ سے تبلیغی احکام اور مواعظ حسنہ کو سنتے انھیں یہ کہہ کہہ کر سمجھایا جاتا تھا کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ اپنے ہی جیسے ایک انسان کو رسول مانے لیتے ہو؟

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ قَالَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (انبیاء رکوع ۱)

ظالموں نے چپکے چپکے کہا کہ یہ شخص تمہی جیسا انسان تو ہے پھر کیا تم جانتے بوجھتے جادو کے اثر میں آ رہے ہو؟ رسول نے کہا میرے رب کو آسمان اور زمین کی ہر بات کا علم ہوتا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے کافروں نے تو یہاں تک کہا کہ یہ سب خواب کی باتیں ہیں بلکہ رسول نے جھوٹ گھڑ لیا ہے بلکہ وہ شاعر ہے اور اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تو ہمارے پاس اگلے رسولوں کی طرح کوئی نشانی لائے۔

جب کافروں نے یہ کہکر ایمان لانے سے انکار کر دیا کہ انسان کیونکر ہادی و پیغمبر ہو سکتا ہے تو ان کو بتایا گیا کہ پہلی قومیں اسی لیے دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار ہوئیں کہ انہوں نے رسالت بشری کو تسلیم نہیں کیا تھا اگر تم بھی ویسا ہی کروگے تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو گذشتہ اقوام و امم کا ہوا۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ

کیا تم کو پہلے کافروں کا حال معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور اب ان کے لیے سخت عذاب ہے

عَذَابٌ أَلِيمٌ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوا وَّاسْتَغْنَى اللَّهُ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۔ (تغابن)۔

یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آتے تھے تو وہ انھیں یہ جواب دیتے تھے کہ کیا اب انسان ہماری ہدایت کریں گے؟ پس ان لوگوں نے کفر اختیار کیا اور حق سے روگردانی کی پس اللہ نے بھی ان کی کچھ پروا نہ کی اور وہ بے ہی بے نیاز و لائق حمد۔

قرآن مجید میں قریب قریب تمام انبیاء کے متعلق یہی بیان کیا گیا ہے کہ جاہلوں کو ان پر ایمان لانے سے بس یہی چیز روکتی رہی کہ وہ بشر کو نبی ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۔

(ابراہیم۔ ۲)

کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو اور تم ہم کو ان بتوں کی پرستش سے روکنا چاہتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے اس کے لیے تم ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لاؤ۔ ان کے رسولوں نے جواب دیا ہم بھی یقیناً تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے اور ہم تمہارے سامنے بغیر حکم خدا کے کوئی معجزہ نہیں لا سکتے اور اللہ ہی پر تمام مسلمانوں کو توکل کرنا چاہیے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو بعث بعد الموت کی خبر دی تو ان کے رؤساء قوم نہایت برہم ہوئے اور تمام لوگوں کو ان کی اطاعت سے یہ کہہ کر منع کیا کہ وہ تو ایک آدمی ہے جیسے تم آدمی ہو وہ بھی وہی کھاتا پیتا ہے جو تم کھاتے پیتے ہو۔ بھلا وہ کیسے خدا کا رسول ہو سکتا ہے

اور اس کی پیروی کیسے کی جا سکتی ہے ؟

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ۔ (مومنون ۔ ۳)	اور قوم ہود میں جو کافر رئیس تھے اور جنہوں نے آخرت کے آنے کی تکذیب کی تھی اور جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں دولت دی تھی انہوں نے کہا کہ یہ شخص تو تم ہی جیسا ایک انسان ہے وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اگر تم نے اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت کرلی تو تم خاسر ہو گئے۔ کیا وہ تم کو اس سے ڈراتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں بن کر رہ جاؤ گے تو پھر پیدا ہوگے عقل سے بعید ہے۔ عقل سے بعید ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ یہی ہماری زندگی ہے ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا ہوتا ہے ہم موت کے بعد پھر زندہ نہ ہوں گے۔ یقیناً اس شخص نے اللہ پر جھوٹ تہمت باندھی ہے اور ہم ہرگز اس کو سچا باور نہ کریں گے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اپنی رسالت کی خبر دی اور ان کو اتقا و اطاعت کا پیغام سنایا تو ان کی قوم نے ان سے جو کچھ کہا وہ یہ تھا۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ مَا أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ (شعرٰی ع ۸)	کافروں نے کہا کہ یقیناً تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے تو تو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کی تو اس کا اثر یہ ہوا کہ دنیا میں جو لوگ ہیچ سمجھے جاتے تھے انہوں نے تو ایمان قبول کر لیا مگر امیروں اور رئیسوں نے ایمان لانے سے روگردانی کی اور کہا کہ یہ ایک معمولی آدمی ہے اس سے اس کا مقصد ناموری حاصل کرنا ہے اگر واقعی اللہ تعالیٰ کو ہماری رہبری مقصود ہوتی تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا۔ لہٰذا اس آدمی کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے:

وَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ	اس کی قوم کے رئیس کافروں نے کہا کہ یہ تو تمہاری
مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ	ہی طرح کا ایک انسان ہے جو تم پر برتر ہو کر رہنا چاہتا
عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ	ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو ملائکہ
مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ	کو بھیجتا۔ (انسان کا نبی ہونا) یہ تو ہم نے اپنے پچھلے بزرگوں
اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ (مومنون ۲)	سے کبھی سنا نہیں۔ یقیناً یہ شخص جنون میں مبتلا ہے

حضرت شعیب علیہ السلام نے اصحاب الایکہ کو احکام الٰہی کی تبلیغ کی تو آپ کو یہ جواب دیا گیا:-

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ وَمَآ	کافروں نے کہا یقیناً تجھ پر کسی نے جادو کر دیا
اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ (شعراء ع ۱۰)	ہے۔ ورنہ تو ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے برادر ہارون علیہ السلام کے ساتھ فرعون اور اس کے ارکان دولت کے پاس دعوت ایمان و توحید کی تبلیغ کے لیے گئے تو ان لوگوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ یہ دونوں تو ہمارے ہی جیسے دو انسان ہیں بلکہ ان کی قوم تو ہماری غلام ہے

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ	فرعون اور اس کے لوگوں نے کہا کیا ہم ان دو
قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (مومنون ع ۳)	آدمیوں پر ایمان لائیں جو ہماری ہی طرح کے ہیں اور

ان دونوں کی قوم کے لوگ ہمارے غلام ہیں۔

قرآن میں کس سادگی کے ساتھ نبی کی جگہ بشر کا لفظ انتخاب کیا گیا ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ کسی نبی کو یہ حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب، حکم اور نبوت کی نعمت بخشے اور وہ لوگوں کو بندۂ خدا ہونے کے بجائے اپنی بندگی کا حکم دے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (آل عمران ۱۶)

کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اس کو کتاب اور سمجھ اور پیغمبری دے تو وہ لوگوں سے یوں کہنے لگے کہ تم میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہ کہے گا کہ تم سب اللہ والے بن جاؤ اس سبب سے کہ تم لوگ کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور کتاب کو پڑھتے ہو۔

قرآن میں انسان کے اس قدیم جاہلانہ خیال کا کہ رسول کو فرشتہ ہونا چاہیے صرف مختلف پہلوؤں سے جواب ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس کے سامنے اس حقیقت کو بھی ہویدا کیا گیا ہے کہ نبیوں اور رسولوں کے ارسال سے مقصد احکام الٰہی کی تبلیغ اور مرسل الیہم کی تعلیم و تربیت ہے اور اس مقصد کا حصول اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے پاس انسان ہی رسول بن کر آئے اگر یہ نہ ہو تو ارسال رسل کا مقصد فوت ہو جائے۔ چنانچہ منکرین نبوت نے جب یہ سوال اٹھایا کہ:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا؟ — کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ؟ — اس کی تصدیق کے لیے اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا؟

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ — یہ شخص تو تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہے۔

لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً — اگر ہمارا خدا کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتہ کو رسول بنا کر اتارتا۔

تو ان سب کے جواب میں یہ فرمایا گیا:-

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۔

اگر ہم فرشتہ کو نبی بناتے تب بھی اس کو آدمی ہی بناتے اور جامۂ انسانیت کی ان تمام خصوصیات سے اس کو آراستہ کرتے جو عام انسانوں میں پائی جاتی ہیں ۔

یعنی فطرت کا اقتضا یہی ہے کہ انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی کو رسول ہونا چاہیے حتیٰ کہ اگر فرشتہ کو رسول بنایا جاتا تو اس کو بھی ان تمام تعینات و تقییدات اور ان تمام کمزوریوں سے جو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں آلودہ کر دیا جاتا تاکہ وہ انسانی دائرے میں رہ کر خدا کے قانون کی اطاعت کر کے دکھائے ۔ ایک دوسری جگہ منکرین نبوت بشری کے اسی اعتراض کا اس طرح جواب دیا گیا ہے ۔

قُل لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا ۔

اگر اس زمین پر بجائے انسانوں کے فرشتے آباد ہوتے تو ہم البتہ ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے ۔　(۱۵-۱۱)

مطلب بالکل صاف ہے کہ تبلیغ احکام دو متضاد جنسوں میں ناممکن ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ ہر نبی اسی قوم کے اہل بابصیرت سے بھیجا گیا ہے جس قوم کی تبلیغ کے لیے وہ آیا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے ۔

مَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ　ہم نے ہر ایک رسول کو اسکی قوم کی زبان میں بھیجا ۔

قوم عرب کے سامنے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی آواز بلند کی اور قریش کے لوگوں نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو ان کو سمجھایا گیا کہ یہ رسول تمہاری ہی جنس کا آدمی ہے قریش سے ہے اس کو تمہارے ساتھ بہت ہی الفت و محبت ہے یہ تم کو ہلاکت و بربادی سے بچانا چاہتا ہے ۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ　تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو تمہاری ہی جنس سے

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ ہے تمہاری سختی اس پر گراں ہے وہ تم پر جان بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبۃ ع) دینے والا ہے مسلمانوں پر بڑا ہی مہربان نہایت رحم والا ہے

غرض کہ یہ امر بلا شک و شبہ ثابت ہے کہ انبیائے کرام بشر تھے اور تمام بشری اوصاف ان میں موجود تھے جس نے قرآن پڑھا ہے وہ تو کسی طرح اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ اس کے ساتھ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ نبیوں اور رسولوں میں وہ خصائص بھی ضرور موجود تھے جن سے عام انسان یقیناً محروم ہیں۔ مثلاً نزول وحی، ملائکہ رحمٰن سے ملاقات و گفتگو، واقعہ معراج اور آپ کا یہ فرمانا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا اور یہ کہ میں تمہاری ہیئت کے مثل نہیں ہوں مجھکو میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے۔ علاوہ بریں گوناگوں معجزات کا ظہور جن سے عام انسان محروم ہیں اور ان کے ہر قول و فعل کا وحی الٰہی کے مطابق ہونا۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان خصائص نبویہ کے باعث ہم ان کی بشریت کا انکار کر دیں زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا باطن عام انسانوں کے باطن سے بہت بلند تھا ان کی پاک روحانیت عام لوگوں کی روحانیت سے بہت قوی تھی اور کیوں نہ ہو۔ غیر نبیوں کا کمال ان کے کسب و اکتساب کا نتیجہ ہوتا ہے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی روحانی چمک خاص مبدأ فیاض کی عطا کردہ ہوتی ہے اس معنی کو دوسرے الفاظ میں اگر ہم اس طرح ادا کریں تو غالباً غلط نہ ہوگا کہ انبیاء کرام چونکہ خالق و مخلوق کے درمیان وسائط کی حیثیت رکھتے تھے ان کا کام یہ تھا کہ وہ خدائے قدوس کے ہر ایک حکم، خبر اور وعدہ وعید کو اس کے بندوں تک پہنچائیں اور اسی لیے وہ رسول مقرر کیے گئے تھے لہٰذا وہ اپنی ظاہری جسمانیت میں خالص انسان تھے اور ان کے باطن کو ملکوتیت اور ملاء اعلیٰ سے نہایت گہرا لگاؤ تھا۔ یہ اس لیے کہ اگر وہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کے لحاظ سے عمومی انسان ہوتے تو ان پر وحی رب کا نزول کس طرح ہوتا اور ملائکہ رحمٰن سے ملاقات

و گفتگو کیونکر ہوتی اسی طرح اگر بلحاظ ظاہر و باطن دونوں ملک و ملاء اعلیٰ سے متعلق و مرتبط ہوتا تو اپنے غیر جنس کو تبلیغ احکام کس طرح کرتے یہی سبب ہے کہ قرآن نے جہاں ان کی بشریت کی تصریح کی وہاں ان کی اس خصوصیت کو بھی بیان کر دیا جو ان کا روحانی و باطنی وصف تھا مثلاً انما انا بشرٌ کے ساتھ یوحیٰ الیّ کی قید بھی لگادی گئی تاکہ معلوم ہو کہ آپکا باطن نزول وحی الٰہی کی صفت کیساتھ موصوف تھا جس سے عام لوگ محروم ہیں۔ کافروں نے خوارق و مستحیلات کا سوال کیا اور اسکے جواب میں آپ کو اپنی بشریت کے اعلان کا حکم دیا گیا تو اس کے ساتھ رسالت کا وصف بھی لایا گیا اور یہ کہا گیا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ اسی طرح آپ سے پہلے جو نبی گذر چکے تھے جب ان کی بشریت کا ذکر کیا تو ان میں بھی اس وصف خاص کو ظاہر کیا گیا جیسے کہ اس آیت سے صاف ظاہر ہے وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْ اِلَیْهِمْ اور پھر قرآن میں ان کے معجزات بھی ذکر کیے گئے ہیں جن کا شمار خصائص نبویہ میں ہے اور وہ نبیوں اور رسولوں کے سوا کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔

غرض مندرجہ بالا تصریحات سے عوام کے وہ غلط خیالات اور اوہام قطعاً دفع ہو جاتے ہیں جو عام پیغمبروں اور خصوصاً آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت انہوں نے قائم کر رکھے ہیں۔ اور اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انبیاء کرام اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اسی نوع انسانی کے افراد تھے جس کے افراد ہم آپ سب انسان ہیں البتہ ہمارے اور ان کے درمیان فرق اور عظیم الشان فرق اس لحاظ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی و رسول تھے اور اسی نبوت و رسالت کی بنا پر ان کے باطن کو ملاء اعلیٰ سے خاص تعلق و لگاؤ تھا لیکن اس تعلق کا یہ معنی نہیں کہ وہ حقیقۃً ملک ہی تھے قرآن نے جس طرح ان کے بشر اور نبی ہونے کو بیان کیا اسی طرح دلیل کیساتھ ان کے ملک ہونے کی نفی بھی کر دی ہے۔

متاعِ کارواں

از "ساربان"

[ذیل کا مضمون ماہ شوال کی اشاعت کے لیے لکھا گیا تھا۔ مگر رمضان اور کثرت کار نے مل جل کر ایڈیٹر کو بیماری کے سرے پر پہنچا دیا ہے۔ لہٰذا دوسرے مضامین کو ملتوی کر کے اسی پرچے میں اسے شائع کیا جا رہا ہے۔]

بصارت کے ساتھ بصیرت رکھنے والوں کی نگاہوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ وہ محکم چٹان جس کی بنا پر ایک قوم دنیا میں اپنی ہستی کو قائم رکھ سکتی ہے، اور دنیا کی ہر وہ رَو جو اسے اپنے ساتھ بہالے جانے کے لیے بڑھے، اس سے ٹکرا کر نامراد رہ جاتی ہے، اس قوم کی قوت ایمانیہ ہے جس قدر یہ قوت زیادہ ہوگی اسی قدر وہ قوم دنیا کے ہر سیلاب کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگی۔ قوت ایمانی سے مراد در اصل ایمان کی قدر و قیمت ہے۔ اور چونکہ یہ ایک خارجی شئے نہیں بلکہ قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے ایمان کی قیمت کوئی باہر کا خریدار مقرر نہیں کر سکتا بلکہ خود بیچنے والا ہی اس کی قیمت مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے نزدیک یہ اتنی حقیر شے ہو کہ وہ اسے ایک روٹی کے ٹکڑے کی خاطر بلا دریغ بیچ ڈالے۔ اور دوسرے کے نزدیک یہ متاع اتنی گراں بہا ہو کہ خدائے ارض و سماء سے ورے کوئی گاہک اس کی نگاہوں میں جچتے ہی نہیں اور وہ اگر دونوں جہاں بھی اسے دیدے تو یہ اس شرم کے مارے چپ رہے کہ اب تکرار کیا کریں۔ یہی وہ قوت ہے جس سے مسلمان کے دل میں وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خدا اور رسول کی قائم کی ہوئی تہذیب و ثقافت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مسلمان سے جب دنیا کی ہر طاقت دبتی تھی، تو وہ اس کی شمشیر زنی یا نیزہ افگنی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کی متاع

ایمان کو کوئی کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا

لہٰذا جن قوموں نے مسلمانوں کو زیر کرنا چاہا، وہ مدت بھر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کے ہاتھوں سے تیغ و سنان کا چھین لینا اس قدر مفید اور ضروری نہیں جس قدر کہ ان کے دل دماغ سے متاع ایمان کی قیمت و اہمیت کو کم کر دینا۔ دیگر ممالک اسلامیہ کا ذکر چھیڑا گیا تو یہ داستان بہت طویل ہو جائے گی اس لیے سر دست ہم صرف اتنا دیکھیں گے کہ ہندوستان کے مسلمان کی نگاہوں میں اس کی متاع ایمان کو ایک جنس کاسد ٹھہرانے کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ اور پھر اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ آج اس متاع کو چھیننے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ابھی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی کہ سیرام پور میں سب سے پہلا مشن (William Carey) اور اس کے رفقاء کار Ward اور (Marshman) کی زیر نگرانی قائم ہو گیا تھا اور انہوں نے ۱۷۹۳ء میں یہاں سب سے پہلا کالج قائم کیا تھا۔ اس وقت تک کمپنی اسے قرین مصلحت نہ سمجھتی تھی کہ ایسی جماعتوں کو کھلم کھلا اپنی سرپرستی میں لے لے۔ کیونکہ حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اسی لیے جب چارلس گرانٹ نے چاہا کہ پارلیمنٹ سے کمپنی کے دساتیر میں اس شق کا اضافہ کرا لیا جائے تو اسے ناکامی ہوئی؛ حالانکہ ولیم ولبر فورس جیسا صاحب تدبر بھی اس کا حامی تھا۔ لیکن ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کے چارٹر میں تجدید ہوئی تو اس وقت اس میں اس شق کا اضافہ کرا لیا گیا۔ اس کے بعد مردانہ اور زنانہ مشن سکول ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گئے۔ اکیلے چرچ آف انگلینڈ کی طرف سے تقریباً بیس اسکول کھل گئے۔ اور پبلک کے چندہ سے جو انگلستان میں جمع ہوا ۱۸۲۰ء میں کلکتہ میں بشپ چرچ کالج کا افتتاح ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں سب سے پہلا زنانہ مدرسہ کھولا گیا۔ پریس کے افتتاح نے مشن کی ان تدابیر میں اور بھی تقویت پیدا کر دی۔ پنجاب اور یوپی میں بیسیوں ایسے مرکز قائم ہو گئے جن سے مشن کے لٹریچر کی اشاعت ہوتی تھی۔ سیرام پور مشن کا

پہلا ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" انہی مقاصد کا آئینہ دار تھا۔

ان عیسائی مشنوں کو "عیسائیت" پھیلانے میں تو کوئی قابل لحاظ کامیابی نہیں ہوئی نہیں، البتہ اس باب میں یقینی کامیابی حاصل ہوگئی کہ لوگوں کے سامنے جب "مذہب" کا نام لیا جائے، تو ذہن ایک ایسے نظریہ کی طرف منتقل ہو جائے جس میں عقل کو کوئی دخل نہ ہو، وہ سرتاسر توہم پرستی، بے دلیل عقیدت، اندھے یقین اور جاہلانہ تعصبات کا مجموعہ ہو، اور عملی دنیا میں وہ ایک قدم بھی انسان کے ساتھ نہ چل سکے۔ ایک طرف تو مذہب کا ایسا تصور جایا گیا، اور دوسری طرف ڈیوڈ ھیر David Hare جیسے معقولی Rationalist) نے ۱۸۱۷ء میں پریزیڈنسی کالج، کلکتہ کی بنا ڈالی جسے آزاد خیالی کی تحریک کا گہوارا سمجھنا چاہیے۔ یہ دونوں قوتیں متوازی کام کرتی رہیں۔

اس کے بعد وہ تحریک شروع ہوئی جسے انگریزی ذریعہ تعلیم کی تحریک کہتے ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں الگزنڈر ڈف نے چاہا کہ ایک ایسا اسکول کھولا جائے جس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ اگرچہ اس وقت کی حکومت نے مصلحۃً اس کی مخالفت کی مگر ۱۸۳۹ء میں لارڈ میکالے کو اس امر کی تحقیق کیلئے متعین کیا گیا کہ طریق و ذریعہ تعلیم کیا ہونا چاہیے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے حامی اپنے خیال کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہو جائیگی جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہنیت کے لحاظ سے انگریزی ہوگی۔ چنانچہ اس دلیل کو وزنی سمجھا گیا، انگریزی ذریعہ تعلیم قرار دی گئی، اور لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۴۴ء میں اعلان کر دیا کہ سرکاری ملازمت کے لیے انگریزی خوان کو ترجیح دی جائے گی۔

ایک طرف انگریزی زبان کی اشاعت و ترویج کے لیے یہ کچھ کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف عربی اور فارسی کو مٹانے کے لیے بھی کچھ کم قوتیں صرف نہیں ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کو لائبریریوں سے خارج کیا جاتا رہا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے حکم دیدیا کہ سامی ثقافت کی ریسرچ میں ایک پائی بھی صرف نہ کی جائے۔ ڈاکٹر روئر Roer جو ایشیاٹک سوسائیٹی کا ۱۸۴۷ء سے

۱۸۵۲ء تک ان کا انچارج رہا؛ اور اس کے بعد پال وغیرہ نے پیہم کوشش جاری رکھی کہ عربی کی طرف سے توجہات ہٹا کر سنسکرت کی ترویج واحیہ میں تمام روپیہ صرف کیا جائے۔ یہ ظلم و تعصب اس حد تک بڑھ گیا کہ مسلمانوں کے وہ اوقاف تک جو خاص انہیں کے لیے وقف تھے غیر مسلموں کی تعلیم میں صرف ہونے لگے۔ چنانچہ محسن ٹرسٹ، پریذیڈنسی کالج کلکتہ پر صرف ہونے لگا جو قریب قریب "ہندو کالج" تھا۔ اعتماد الدولہ ٹرسٹ کا بھی یہی حال ہوا۔ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور قدیم زبانوں کی تخریب کی گئی اور ستم یہ کہ ان کے لیے جدید تعلیم حاصل کرنے کے راستہ میں بھی سخت موانع حائل کیے گئے۔ لارڈ ہارڈنگز کا سرکاری اعلان ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملازمتوں میں انگریزی خوان کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن دوسری طرف ڈاکٹر ہنٹر (Hunter) کے الفاظ میں "کوئی مسلمان قلی، یا دفتری، یا قلم بنانے والے کی اسامی سے اوپر کسی اسامی کا متوقع نہیں ہو سکتا تھا"۔ اور اس طرح اسی ڈاکٹر کے الفاظ میں "بتدریج اسلامی ہندوستان واژگون بنا دیا گیا، اور ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی"۔ سلطنت چھن گئی۔ جماعت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اسلامی قوانین معطل ہو گئے، اسلامی تہذیب کو سہارا دینے والی تعلیم بھی باقی نہ رہی۔ ساری قوم میں جہالت پھیلتی چلی گئی۔ اور اس پر مزید یہ کہ اس کو پیٹ کی مار دی گئی۔ معیشت کے دروازے اس پر ایک ایک کر کے بند کیے گئے۔ اس کو ان لوگوں کے آگے ذلیل و خوار کیا گیا جو کل تک خود اس کے محکوم تھے۔ اور اس کو ایک قلیل مدت کے اندر فقیروں اور قلانچوں کی قوم بنا کر رکھ دیا گیا۔ اس طرح مسلمان کے ایمان کی قیمت گرنی شروع ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ مارکیٹ میں ایک جنس فروختنی کی حیثیت سے آگیا۔

الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ملانوں نے انھیں انگریزی پڑھنے سے روکے رکھا

۱۔ The Indian Musalmans by Dr. Hunter.

اس لیے یہ قوم تعلیم میں پیچھے رہ گئی۔ لیکن مذکورۂ صدر واقعات کو سامنے رکھئے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے والے اُن کے ملّانے تھے یا ایک منظم سکیم تھی؟" ملّانے "جو لوسا بن' کم کیے جاتے ہیں) اُن کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے فتویٰ دیا تھا کہ وہ انگریزی پڑھنا العلوم جدیدہ کا حاصل کرنا اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے" علماء حضرات کو تو مفت میں مورد الزام ٹھیرایا جارہا ہے ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لیے ذیل کے اعداد وشمار ملاحظہ فرمائیے اور خود نتیجہ اخذ کیجیے کہ مسلمان تعلیم جدید سے بھاگتے تھے، یا تعلیم کے دروازے ہی اُن پر مسدود کر دیے گئے تھے بلٹ۱۸۷۱ء میں پنجاب کی تعلیمی رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل تھا۔

	ہندو	مسلمان
ابتدائی تعلیم	۲۳۰۷۴	۱۶۴۴۵
ثانوی (مڈل)	۵۸۰۹	۲۷۴۴
ہائی اسکول	۱۴۱	۴۶
کالج	۹۱	۶
لڑکیاں	۵۷۱	۲۵۷۶

ملاحظہ فرمائیے! ابتدائی حصہ میں تیئس ہزار ہندوؤں کے مقابلہ میں ۱۶ ہزار مسلمان ہیں۔ آگے چلکر مڈل میں پانچ ہزار کے مقابلہ میں دو ہزار رہ جاتے ہیں۔ ہائی اسکول میں قریباً ڈیڑھ سو کے مقابلہ میں چھیالیس (ایک تہائی) اور کالج میں قریب پندرہواں حصہ لڑکیوں کی تعداد بھی قابل غور ہے لیکن مسلمان لڑکیوں کی یہ تمام کثرت صرف ابتدائی مرحلہ میں نظر آتی ہے۔

مختلف سیاسی موانع کے علاوہ مسلمانوں کے راستے میں مذہبی مسئلہ بھی بڑی رکاوٹ پیش کر رہا تھا یہ بات نہیں ہے کہ ان کا مذہب انہیں تعلیم جدید سے روکتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ

تمام مدرسے عیسائی مشنریوں کے تھے۔ اور وہاں اُن بچوں کو عیسائیت کی تعلیم دے کر انہیں اسلام سے دور ہٹایا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء کا واقعہ ہے کہ حیدرآباد (سندھ) کے ایک مدرسہ میں ایک مسلمان بچے کو عیسائی بنایا گیا، اور دوسرے ہی دن دو سو مسلمان بچوں نے اسکول چھوڑ دیا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے تحت یہاں نئی تعلیم کا اجرا ہوا۔ دل میں درد، آنکھوں میں بینائی اور دماغ میں فہم و ادراک رکھنے والے مسلمان اِن حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور کفِ افسوس مَل کے رہ جاتے تھے لیکن اس وقت بھی خدا کے ایسے بندے موجود تھے جو مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو یوں دن دہاڑے لٹتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے حضرت شاہ ولی اللہ رح اور ان کے خاندان کو (علیہم الرحمہ) جنہوں نے ایسے سخت وقت میں اس رَو کے خلاف مقابلہ کا عزم کیا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کی زیرِ قیادت اس تحریکِ عظیم کی بنا پڑی جسے "ترغیبِ محمدیہ" کہتے ہیں۔ حضرت سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ عبدالحی (علیہم الرحمہ) اس تحریک کے علمبرداروں میں سے تھے۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ اس تحریک کے سیاسی گوشے کون کونسے تھے، اور اُن کا کیا انجام ہوا، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے تحفظِ تہذیب و ثقافت کے مسئلہ پر اس تحریک کے عواقب کس طرح اثر انداز ہوئے "وہابی تحریک" کے استیصال کے لیے جو افسرِ اعلیٰ (James O'Kineaty) متعین کیا گیا تھا، اُس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اِن مذہبی سرفروشوں کا عوام پر اثر اس لیے غالب ہے کہ ہم نے عوام میں تعلیم پھیلانے سے تساہل برتا ہے۔ چنانچہ مسٹر بیلی (Bayley.) ہوم سکرٹری نے گورنمنٹ کی پالیسی بدلنے کے لیے جو خریطہ لکھا اس میں اس بات کو واضح کر دیا کہ مسلمان انگریزی حکومت میں یقیناً تباہ ہو چکے ہیں لیکن حکومت کی پالیسی میں تبدیلی ہونی ضروری ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ان کی تباہی تو مسلّم ہے لیکن اس قسم کی تحریکیں جو پیدا

ہوتی جاتی ہیں، ان کے استیصال کے لیے یہ ضروری ہے کہ اب انہیں تعلیم دی جائے نوکریوں کے دروازے اب ان کے لیے کھول دیے جائیں، تاکہ ان کی "جہالت" جو ابھی تک ان کے دل میں جوش ایمانی کے ولولے زندہ رکھے ہوئے ہے، "علم کی روشنی" میں تبدیل ہو جائے، جس سے عشق بلا انگیز پر عقل حیلہ جو کا غلبہ ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسکول اور کالج کھلنے شروع ہو گئے اور یہ "وحشی" بھی "مہذب" بنا لیے گئے۔ علی گڑھ اور حمایت اسلام لاہور اسی تبدیلی کا ثمرہ تھے۔

ڈیڑھ سو سال کی تاریخ چند اشارات میں بیان نہیں کی جا سکتی، اور تاریخ نگاری اس وقت ہمارے پیش نظر ہے بھی نہیں ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کی متاع ایمان کی قیمت گرانے اور پھر اسے سستے داموں خریدنے کے لیے اس سو سال کے عرصہ میں کیا کیا عنوانات قائم کیے گئے تھے جن کا آج یہ اثر ہے کہ ایک نوجوان کو راستہ چلتے میں اپنے جوتے کی ایڑی گھسنے کا تو خیال ہوتا ہے لیکن ایمان گھٹنے کا کبھی خیال نہیں آتا ہم نے دیکھا ہے کہ جو کچھ اس باب میں کیا گیا ہے وہ چند الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

۱۔ مسلمان کو اس کے مذہب سے متنفر یا کم از کم بیگانہ بنا دیا جائے۔

۲۔ معاش کے دروازے اس پر بند کر دیئے جائیں تاکہ روٹی کا سوال اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جائے اور یہی چیز اس کی نگاہ میں سب سے زیادہ گراں قدر بن کر رہے۔

۳۔ اس کی تہذیب و تمدن کی زبان کو مٹا کر اس کی جگہ حاکم قوم کی زبان کو ترویج دی جائے

جب یہ ہو جائیگا تو مسلمان کے قلب و دماغ کی کایا پلٹ جائے گی۔ مذہب سے بیگانہ ہو گا تو اس کی مرکزیت فنا ہو جائے گی۔ معاش کے دروازے بند ہوں گے تو روٹی کے ٹکڑے پر اسے خریدا جا سکے گا۔ زبان دوسری رواج پا جائے گی تو اس کے ذریعے سے غیر محسوس طور پر، بتدریج، دوسروں کی تہذیب اس کی ذہنیت پر اپنا رنگ جما دے گی، اور جب ذہنیت بدل جائے گی تو سب کچھ بدل جائیگا

یہ ماضی کا قصہ تھا۔ اب ذرا حال کی باتیں سنیے تاکہ مستقبل کی تباہی آپ پر خود بخود کھل جائے۔

آج ہندوستان میں پھر ایک تحریک بڑھ رہی ہے، جس کا مقصد حکومت کرنے والے ہاتھوں کی تبدیلی ہے اور اس تحریک کے بانیوں کو بھی وہی سوال پریشان کر رہا ہے جس نے ان کے پیش روؤں کو پریشانی میں ڈالا تھا، یعنی ہندوستان میں ایک قوم ایسی ہے جو اس قدر پس جانے کے باوجود اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کا داعیہ رکھتی ہے۔ اور جل کر راکھ ہو جانے پر بھی اس میں ابھی بہت سی چنگاریاں باقی ہیں جو ہر وقت بھڑک سکتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی اسی ڈھنگ پر سوچنا شروع کیا ہے۔ جس ڈھنگ کبھی ان کے آقاؤں نے سوچا تھا اور خوب سوچ سمجھ کر گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ سے سبق حاصل کر کے انہوں نے بھی مسلمان کی شخصیت کے استیصال کے لیے بالآخر وہی تین عنوان قائم کیے ہیں جو اس سے پیشتر وضع کیے گئے تھے کہ۔۔ ؎

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے — وہی فطرت اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

سب سے پہلا عنوان یہ ہے کہ انھیں مذہب سے متنفر یا بیگانہ بنایا جائے۔ تحریک آزادی کی قیادت آج ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو خدا کا منکر ہے، مذہب کا دشمن ہے، روس کے الحاد و دہریت کا پرستار ہے، اس لیے وہ ہر جگہ یہی پرچار کرتا پھرتا ہے کہ غلامی اور محتاجی کی تمام مصیبتیں مذہب ہی کی پیدا کردہ ہیں، جب تک مذہب دفن نہیں ہوتا، قوم کو ہوش نہیں آسکتا۔ اس کا اثر ظاہر ہے۔ ہزارہا نوجوان جو تحریک آزادی کے اس "قائد اعظم" کو اپنی امیدوں اور تمناؤں کا کعبۂ مقصود سمجھے بیٹھے ہیں مذہب کو علانیہ گالیاں دیتے پھرتے ہیں۔ جو ذرا ان سے متین ہیں یا یوں کہیے کہ جن میں جوانی کا جوش باقی نہیں رہا ہے وہ ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد ہونے کے مدعی ہیں۔ زیادہ صاف الفاظ میں "بھارت ماتا پہلے اور خدا بعد کو" کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور پھر بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ مذہب کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ بھی مذہب کے متعلق بس اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ یہ عابد و معبود

کے درمیان ایک قلبی تعلق کا نام ہے۔ اس کو دنیاوی زندگی کے معاملات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ اور ایسا کہتے ہوئے وہ قطعاً محسوس نہیں کرتے کہ وہ اسلام سے کس قدر بُعد و بیگانگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ رو بڑھتی جا رہی ہے، اور اس سے تحریک وطن پرستی کے لیڈروں کا صاف منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کھیتی میں ان کے پیش رو (انگریز) تخم ریزی کر چکے ہیں اسی کھیتی کی فصل یہ تیار کرنا اور کاٹنا چاہتے ہیں۔

آپ کہہ دیں گے کہ اس میں مسلمانوں کی کیا تخصیص ہے۔ اس قسم کا پروپیگنڈا ہندوؤں میں بھی تو ہو رہا ہے۔ اور ہندو نوجوان بھی تو اپنے مذہب سے متنفر ہوتے جا رہے ہیں پھر آخر ہندوؤں کو اس تحریک وطن پرستی کے خلاف وہ شکایت کیوں نہیں پیدا ہوتی جو تمہیں ہوتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "ہندو" کسی مذہب کا نام ہی نہیں ہے۔ وہ تو دراصل ایک نسلی قومیت کا نام ہے جو چند مخصوص قومی روایات کے زیر اثر صدہا برس سے پرورش پاتی رہی ہے اس نسلی قومیت کے دائرے میں خواہ کتنے ہی مختلف اور متضاد عقائد اور اصول حیات داخل ہو جائیں اس کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے:۔

"ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا...... ممکن ہے کہ ایک شخص علم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارواک تھے) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی ہوں" (ملاحظہ ہو پنڈت جی کی خودنوشت سوانحعمری ترجمہ اردو جلد اول صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳)۔

چونکہ ہندویت کی بنیاد کسی عقیدے اور کسی خاص نظام تہذیب و اصول حیات پر نہیں ہے، اس لئے وہ بیسیوں مختلف و متضاد مذہبی خیالات اور زندگی کے طور طریقوں کو اپنے دائرے میں لے چکی ہے اور پھر بھی "ہندویت" ہے، آئندہ بھی لے سکتی ہے اور پھر بھی ہندویت رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد و دہریت اور اشتراکیت کے انتہائی انقلابی نظریات ——— اخلاقی، تمدنی، معاشی غرض سب قسم کے نظریات ——— پھیلنے پر بھی ہندویت کے سخت سے سخت علمبرداروں تک کو کوئی اعتراض نہیں ہے، کیونکہ ان سب کے باوجود ان کی قومیت جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کی قوم بنی ہی مذہب کے خمیر سے ہے۔ ایک عقیدہ کا اشتراک، ایک قسم کے طریقہائے عبادت کا اشتراک، ایک قسم کے اخلاقی تصورات کا اشتراک، ایک طرح کے ضابطۂ زندگی کا اشتراک، یہی سب چیزیں مل کر اس قوم کو ایک قوم بناتی ہیں۔ ایک سرحدی پٹھان، ایک راجپوت، ایک جاٹ، ایک سندھی، ایک بنگالی، ایک گجراتی، ایک مالاباری اور ایک مدراسی مسلمان کے درمیان کوئی رشتہ باقی ہی نہیں رہتا اگر اس مذہبی اشتراک کا رشتہ درمیان سے ٹوٹ جائے۔ اگر اعتقادات اسلامی سے وہ منکر ہو جائیں، اسلام کے اخلاقی اصول چھوڑ دیں، اسلامی زندگی کے بنیادی قواعد کی پابندی ترک کر دیں، اور مذہبی اخوت و برادری کے تعلق کو منقطع کر کے معاشی طبقات میں تقسیم ہو جائیں اور آپس میں روٹیوں پر لڑنے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ مسلمان قوم دفعۃً صفحۂ ہستی سے مٹ گئی اور اس کے اجزا منتشر ہو کر ہمسایہ قوموں میں جذب ہو گئے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو مسلمان کچھ عقل رکھتے ہیں، انہیں اس تحریک سے کیا خطرہ ہے، اور اب یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ لاکھوں متعصب مہاسبھائی جن سے چند سال پہلے تک سارا ہندوستان بھرا ہوا نظر آتا تھا دفعۃً کہاں غائب ہوگئے اور کیوں غائب ہوگئے۔ کوئی انتہا درجہ کا بے وقوف مہاسبھائی ہوگا جو اب اس "فرقہ وارانہ" جماعت یعنی مہاسبھا میں

شامل رہ کر اپنی پوزیشن خراب کرے گا۔ عقلمند مہابھائی جتنے تھے سب بفضل خدا جنگ آزادی میں شریک ہیں

آپ غور سے دیکھیں گے تو نظر آجائے گا کہ موجودہ تحریک گذشتہ تحریکات یعنی انگریزی سامراج کی تحریک سے کہیں زیادہ گہری اور زود اثر ہے۔ پہلی تحریک نے تو کہیں ڈیڑھ سو سال میں اتنا اثر کیا کہ کالجوں سے نکلنے والے صاحبزادوں کے دماغ ماؤف کر دیے لیکن اس تحریک کا اثر تو آپ کے بڑے بڑے قدامت پسند علماء تک پہنچ گیا ہے۔ ایمان کی قیمت و اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان، اسلام کو تمام مذاہب سے افضل سمجھے اور نوع انسانی کی نجات وسعادت کا واحد اور آخری ذریعہ خیال کرے۔ اور یہ خیال محض خوش عقیدگی یا تعصب کی بنا پر نہیں، بلکہ از روئے قرآن حقیقت نفس الامری کی حیثیت سے ہو لیکن جب ایک مسلمان یہ کہنا شروع کر دے کہ دیگر مذاہب کی پابندی سے بھی اسی طرح نجات حاصل ہو سکتی ہے جس طرح اسلام کے اتباع سے تو یہ گویا اس بات کا اقرار ہے کہ مسلمان اگر مسلمان کی حیثیت سے نہ بھی زندہ رہے تو بھی کوئی مضایقہ نہیں وہ اگر غیر مسلم قوموں میں جذب ہو گیا تو نجات وسعادت سے محروم نہیں رہ سکتا۔ اس اعتراف کی زندہ شہادت مہاتما گاندھی کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے چند سال ادھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ہال میں مسلمانوں کے اجتماع میں کی تھی انہوں نے فرمایا: ـــ

" مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا۔ کہ قرآن کبھی نجات وسعادت کے لیے اسلام ہی کو واحد ذریعہ قرار نہیں دے سکتا، بلکہ اس کی رو سے ہر مذہب کا انسان اپنے اپنے طریقہ پر کاربند رہ کر نجات حاصل کر سکتا ہے۔ مجھے اس کے ثبوت کی ضرورت تھی۔ آخر کار مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب " ترجمان القرآن" میں (جس کی پہلی جلد اس وقت شائع ہوئی تھی) اس بات کو ثابت کر دیا کہ میرا خیال صحیح ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمان القرآن کے ان حصوں کا

گجراتی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے"۔

آپ سمجھے بھی کہ یہ اتنے مشہور عالم دین امام الہند کی کس خدمتِ جلیلہ کا تذکرہ ہو رہا ہے؟ وہ تبلیغی حیثیت جو ایک مستقل مقصد کو سامنے رکھ کر مسلسل نشر و اشاعت کے ذریعہ سے ہندوستان بھر میں عیسائی جا رہی ہے۔ اور اس کی سند مسلمانوں کے اتنے بڑے عالم سے حاصل ہو رہی ہے مسلمان کو اس کے مذہب سے بیگانہ کرنے کے لیے۔ اس سے بڑھ کر اور کونسا حربہ کارگر ہو سکتا ہے۔ اور قیامت ہے کہ اس "جہادِ عظیم" میں مسلمانوں کے اتنے بڑے بڑے نامور لوگ اس دلیری سے حصہ لے رہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ روٹی کا ہے۔ اس باب میں انھیں کچھ زیادہ دشواری نہیں پیش آ رہی ہے۔ ان کے مورث ان کے لیے اس کھیتی کو بھی ڈیڑھ سو سال کی تخم ریزی و آب پاشی کے بعد بڑی حد تک تیار کر چکے ہیں۔ اب صرف فصل کاٹنے کی زحمت ہی ان کے لیے باقی ہے۔ دیوانی بنگال کی سند حاصل کرنے کے بعد سے انیسویں صدی کے آخر تک جس طرح مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کیا جاتا رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ہی ہندوستان کی سب سے زیادہ بھوکی قوم ہے۔ اور اس کی بھوک ہی کو دیکھ کر یہ امید قائم کی گئی ہے کہ صدر کانگریس کی اشتراکی فوج میں سب سے بڑھ کر مسلمان حصہ لیں گے جو بھوک کے شکار ہیں اور جن کو جدید تعلیم نے اپنے مذہب سے بیگانہ، بلکہ ایک حد تک متنفر بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری قوم کے بہت سے اشتراکی نوجوان بے باکانہ کہتے پھرتے ہیں کہ کہاں کی تہذیب اور کیسی کلچر۔ سوال سارا دنیا میں پیٹ کا ہے۔ جو اسی "بھوکی فوج" کے بل بوتے پر صدرِ کانگریس کو یہ کچھ کہنے کی جرأت ہو گئی ہے کہ میں کسی مخصوص تہذیب اور مخصوص تمدن کو نہیں جانتا۔ میں تو صرف دو باتیں جانتا ہوں، جمہور ہندوستانی اور ان کا افلاس۔ بے روزگار نوجوان ان الفاظ کو سن کر جوشِ مسرت سے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اور دل میں سمجھ لیتا ہے کہ بس

ہندوستان کی تمام مصیبتوں کا علاج اسی نظریہ میں ہے اور ان کا نجات دہندہ وہی ہے جو اس نظریہ کا پیش کرنے والا ہے۔ حالانکہ وہ ذرا غور سے دیکھے تو اسے نظر آجائے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے کمیونسٹ، یہ تمام انسانوں کو معاشی مساوات دیدینے کے حامی، یہ کہ جن کے دل گویا مفلسوں، محتاجوں کی ہمدردی کے رستے ہوئے ناسور بن گئے ہیں! دراصل خود سرمایہ دار ہیں، زمیندار ہیں، کارخانہ دار ہیں، سود خوار ہیں، بورژوا ہیں، اور ان کی اشتراکیت محض اسٹیج کی اشتراکیت ہے جس کا مقصد محض بھولے نوجوانوں کو اپنے دام میں پھانسنا اور مسلمانوں کے درمیان الحاد اور طبقات کی جنگ برپا کرکے ان کی قومیت اور تہذیب دونوں کو ختم کردینا ہے۔ کلکتہ کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اور کانپور و احمدآباد کی ہڑتالوں میں اور وزارت مدراس کی تحقیقات میں اس اشتراکیت کی حقیقت خوب ظاہر ہو چکی ہے۔

تیسرا مسئلہ زبان کا ہے مسلمان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس غلط فہمی میں انہیں ارادۃً مبتلا کیا جارہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی اور تمدنی مسئلہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق، کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے لیکن یہ خیال جس قدر جلدی دور ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے۔ قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کردینے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کردینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کررہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ اپنی زبان و رسم الخط کو بدل دینے پر آمادہ ہوجائے اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے اور اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کررہی ہے اس باب میں اگر کوئی شہادت آپ کو درکار ہو تو میں پنڈت جواہر لال نہرو ہی کو گواہوں کے کٹہرے

میں لاکر کھڑا کردیگا۔ وہ اپنے ایک تازہ مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"ایک قوم کے لیے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیے، اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کیسے برتتے ہیں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ ...... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک وسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کردی جاسکتی ہو جس وقت تک کہ اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں"۔

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

"رسم الخط کا ادر ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں، اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے" (میری کہانی۔ جلد اول ص۲۹۵)

اگرچہ زبان اور رسم الخط کی اہمیت پر بہت سی ایسی شہادتیں بھی نقل کی جاسکتی ہیں جو علمی حیثیت سے نسبتہً زیادہ وقیع ہیں۔ مگر میں نے قصداً یہ شہادت اس لیے نقل کی ہے کہ آگے چل کر ہندوستان کی زبان کے متعلق انہی جواہر لال اور انہی کے ہم خیال معماران وطن کی جن کارگذاریوں کا ذکر مجھ کو کرنا

چاہتا ہوں، ان کو پڑھتے وقت ناظرین کو یہ معلوم رہے کہ یہ لوگ زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہیں بلکہ اس کا پورا شعور رکھتے ہیں، اور خوب سوچ سمجھ کر وہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں جس کی تشریح میں آگے کرنے والا ہوں۔

اردو زبان اگرچہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، ان دونوں قوموں کے سیاسی و تمدنی وفاق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، ان کے درمیان باہمی مفاہمت کا بہترین وسیلہ رہی ہے اور بن سکتی ہے، اور اس لحاظ سے ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقا کی شکل کو بنانے یا بگاڑنے میں اس زبان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اس کی اہمیت کو صرف اسی حد تک محدود رکھیں۔ ہندوؤں کے لیے اس زبان کی زندگی و موت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی زندگی و موت کا حکم نہیں رکھتی۔ شمالی ہند میں ان کی ایک بڑی تعداد اس کو بولتی اور لکھتی پڑھتی ہے، مگر ان کی قومیت اور تہذیب کے لیے زندگی کا صرف یہی ایک سہارا نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں صرف یہی ایک زبان ہے جس کی بدولت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب زندہ ہے اور رہ سکتی ہے۔ یہی زبان تمام اقطاعِ ہند کے مسلمانوں میں وحدت قائم کرتی ہے۔ اسی زبان کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تعلق اپنے ماضی کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اسی زبان کا رسم الخط ان کو قرآن کے رسم الخط سے قریب تر رکھتا ہے۔ اسی زبان میں وہ الفاظ اور اسالیبِ بیان پیدا ہو گئے ہیں جو اسلامی خیالات کو ادا کرنے کے لیے مناسب ہیں، اور جن کے ذریعہ سے بولنے والوں اور سننے والوں میں اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ عربی زبان کے بعد دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اسلام، اس کی تاریخ اور تہذیب کے متعلق اتنا لٹریچر موجود ہو جتنا اس زبان میں ہے۔ قلیل التعداد عربی دانوں کے سوا مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کے لیے اس لٹریچر سے واقف ہونے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ زبان بدل جائے یا اس کے الفاظ

اور اسالیب بیان بدل جائیں یا اس کا رسم الخط بدل جائے تو مسلمان اس ملک میں بحیثیت ایک قوم کے باقی نہیں رہ سکتے جس طرح چین میں باہر سے متعدد قومیں فاتحانہ داخل ہوئیں اور وہاں کی زبان اور معاشرت کو اختیار کرکے چینی قوم میں ایسی جذب ہوئیں کہ آج ان کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا، جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں سے پہلے بہت سی قومیں آئیں اور یہاں کی زبان ومعاشرت اختیار کرکے اپنے قومی وجود کو کھو بیٹھیں، اسی طرح اگر مسلمان بھی اردو زبان کو کھو دیں تو یہ گویا ہندوستان کی کان نمک میں ان کے نمک بن جانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا۔ اردو کی یہ اہمیت مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم کے لیے نہیں ہے۔ دوسری قوموں کے لیے یہ محض اظہار خیال کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ مگر اس کو چھوڑ کر بھی وہ اپنے قومی وجود کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

ان تمہیدی گذارشات کو نظر میں رکھیے اور اس کے بعد دیکھیے کہ زبان کے مسئلہ سے سیاسی اغراض کے لیے کیا کام لیا گیا ہے اور اب کیا کام لیا جا رہا ہے۔

ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دیکر جو شاہ ضرب (Master stroke) لگائی تھی اس کا اثر آپ دیکھ چکے ہیں۔ انہوں نے غلاموں کی زبان (ورنا کیولر) کو مٹایا نہیں۔ اسے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کو زندہ رہنے کا حق بالکل اسی طرح عطا کر دیا جس طرح کراچی کے ریزولیوشن میں "بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں عطا کیا گیا ہے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ ذریعہ تعلیم بدل دیا اور صرف اس زبان کے جاننے والوں کے لیے ترقی کے دروازے بند کر دیے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی مگر آپ دیکھیے کہ صرف سو ہی سال کے اندر اس پالیسی کا کیا انجام ہوا ہے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے ہمارے تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان سے، اور اس کے ساتھ اپنے ماضی سے، اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے، اپنی تہذیب وتمدن سے اور اپنے خیالات کے خزانوں سے بیگانہ ہوتے چلے گئے

چاہتا ہوں۔ ان کو پڑھتے وقت ناظرین کو یہ معلوم رہے کہ یہ لوگ زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہیں بلکہ اس کا پورا شعور رکھتے ہیں، اور خوب سوچ سمجھ کر وہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں جس کی تشریح میں آگے کرنے والا ہوں۔

اردو زبان اگرچہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے، ان دونوں قوموں کے سیاسی و تمدنی وفاق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، ان کے درمیان باہمی مفاہمت کو بہترین وسیلہ رہی ہے اور بن سکتی ہے، اور اس لحاظ سے ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقاء کی شکل کو بنانے یا بگاڑنے میں اس زبان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہوگی اگر ہم اس کی اہمیت کو صرف اسی حد تک محدود رکھیں۔ ہندوؤں کے لیے اس زبان کی زندگی و موت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی زندگی و موت کا حکم نہیں رکھتی۔ شمالی ہند میں ان کی ایک بڑی تعداد اس کو بولتی اور لکھتی پڑھتی ہے، مگر ان کی قومیت اور تہذیب کے لیے زندگی کا صرف یہی ایک سہارا نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں صرف یہی ایک زبان ہے جس کی بدولت ان کی قومیت اور ان کی تہذیب زندہ ہے اور رہ سکتی ہے۔ یہی زبان تمام اقطاعِ ہند کے مسلمانوں میں وحدت قائم کرتی ہے۔ اسی زبان کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تعلق اپنے ماضی کیساتھ قائم رہتا ہے۔ اسی زبان کا رسم الخط ان کو قرآن کے رسم الخط سے قریب تر رکھتا ہے۔ اسی زبان میں وہ الفاظ اور اسالیبِ بیان پیدا ہوگئے ہیں جو اسلامی خیالات کو ادا کرنے کے لیے مناسب ہیں، اور جن کے ذریعہ سے بولنے والوں اور سننے والوں میں اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی ہے، عربی زبان کے بعد دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اسلام، اس کی تاریخ اور تہذیب کے متعلق اتنا لٹریچر موجود ہو جتنا اس زبان میں ہے۔ قلیل التعداد عربی دانوں کے سوا مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کے لیے اس لٹریچر سے واقف ہونے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اگر یہ زبان بدل جائے یا اس کے الفاظ

اور اسالیب بیان بدل جائیں یا اس کا رسم الخط بدل جائے تو مسلمان اس ملک میں بحیثیت ایک قوم کے باقی نہیں رہ سکتے جس طرح چین میں باہر سے متعدد قومیں فاتحانہ داخل ہوئیں اور وہاں کی زبان اور معاشرت کو اختیار کر کے چینی قوم میں ایسی جذب ہوئیں کہ آج ان کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا، جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں سے پہلے بہت سی قومیں آئیں اور یہاں کی زبان و معاشرت اختیار کر کے اپنے قومی وجود کو کھو بیٹھیں، اسی طرح اگر مسلمان بھی اردو زبان کو کھو دیں تو یہ گویا ہندوستان کی کان نمک میں ان کے نمک بن جانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا ــــ اردو کی یہ اہمیت مسلمانوں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم کے لیے نہیں ہے۔ دوسری قوموں کے لیے یہ محض اظہار خیال کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ مگر اس کو چھوڑ کر بھی وہ اپنے قومی وجود کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

ان تمہیدی گذارشات کو نظر میں رکھیے اور اس کے بعد دیکھیے کہ زبان کے مسئلہ سے سیاسی اغراض کے لیے کیا کام لیا گیا ہے اور اب کیا کام لیا جا رہا ہے۔

ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دیکر جو شاہ ضرب' (Master stroke) لگائی تھی اس کا اثر آپ دیکھ چکے ہیں۔ انہوں نے غلاموں کی زبان (ورناکیولر) کو مٹایا نہیں۔ اسے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کو زندہ رہنے کا حق بالکل اسی طرح عطا کر دیا جس طرح کراچی کے ریزولیوشن میں "بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں عطا کیا گیا ہے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ ذریعہ تعلیم بدل دیا اور صرف اس زبان کے جاننے والوں کے لیے ترقی کے دروازے بند کر دیے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی مگر آپ دیکھیے کہ صرف سو ہی سال کے اندر اس پالیسی کا کیا انجام ہوا ہے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے ہمارے تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان سے، اور اس کے ساتھ اپنے ماضی سے، اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے، اپنی تہذیب و تمدن سے اور اپنے خیالات کے خزانوں سے بیگانہ ہوتے چلے گئے

انگریزی زبان اپنے ساتھ ایک غیر قوم کے خیالات بھی لیے ہوئے ان کے دل و دماغ میں گھستی چلی گئی، اور اس نے ان کو اندر سے بدلنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہی مقصد تقریباً حاصل ہوگیا جس کو پیش نظر رکھ کر میکالے اور اس کے ہم خیال لوگوں نے یہ شاہ ضرب لگائی تھی یعنی اُس زبان کے ذریعے سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو گی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہو جائیگی۔

"ہندوستانی قومیت" کے معمار بھی انہی استادوں کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے قومیت کو بنانے اور بگاڑنے کی تدبیریں اُنہی سے سیکھی ہیں۔ ان کے استاد اور مورث جس کھیتی کو گذشتہ سو برس سے تیار کرتے رہے ہیں، اسی کی فصل اب یہ کاٹنا چاہتے ہیں، اور چونکہ یہ غیر ملکی نہیں ہیں، اسی ملک کے لوگ ہیں لہذا ان کے لیے وہ انقلاب برپا کرنا زیادہ آسان ہے، جس کی جرأت ان کے استاد نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ وطن کی مشترک فلاح و بہبود چاہنے والے "قوم پرست" بن کر یہ سب کچھ کر سکتے ہیں، خود ہماری قوم کے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اور کوئی ان کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ اس میں "ٹوڈی" اور "رجعت پسند" اور "سامراج پرست" کے گھناونے القاب سننے کی جرأت نہ ہو۔

آزادی ہند کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی جی اُس تحریک کے بھی سب سے بڑے علمبردار ہیں جس کا مقصد ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی "قومی زبان" بنانا ہے۔ وہ اور ان کے مددگار —— جو سب کے سب جنگ آزادی کے جنرل ہیں —— اپنے تمام اثر اور قوت کو اس کام کے لیے استعمال کر رہے ہیں جو انھیں ہندوستان کی مشترک فلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کرنے والے مجاہدینِ حریت ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوتا ہے۔ خدانخواستہ ان کا مقصد یہ نہیں کہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو مٹائیں۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہے —— اور یہ بالکل پاک مقصد ہے —— کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی قومی زبان

بنا دیں۔ اگر اس کا نتیجہ عملاً وہی ہو جو اردو زبان کو مٹانے کی کوشش کا ہو سکتا ہے تو کوئی حرج نہیں اس لیے کہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر محمد اشرف صاحب ہم کو اپنے ایک سرکلر میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنے کا پورا حق ہے اور ان کا یہ فعل "فرقہ پرستی" نہیں ہے۔ ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور "فرقہ پرستی" ہے!

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے۔ (ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۸ء) مگر یہ بات وہ ہندو "فرقہ پرست" ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے، اور نہ اس میں وہ رجحان پایا جاتا ہے جسے پنڈت جواہر لال اپنے ایک تازہ مضمون میں "علیحدگی پسندی کے رجحان" (Separatist tendency) سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیش نظر ہے اس کی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک "ٹھیٹھ قوم پرست" کو اختیار کرنا چاہیے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی "مشترک قومی زبان" کا نام "ہندوستانی" رکھتے ہیں جس کے دو رسم الخط ہیں، یعنی فارسی اور دیوناگری، اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں رسم الخطوں کے ساتھ "ہندوستانی" کو سرکاری زبان ہونا چاہیے۔ مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لے جاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام "ہندی" ہو جاتا ہے اور اس کے دو رسم الخط یعنی فارسی اور دیوناگری قرار پاتے ہیں۔ مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"صرف ہندی زبان ہی جس کا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اردو بھی پڑ گیا، اور جو دیوناگری اور اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ

ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے" (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی کا کمیونک)

اسی رجحان کے تحت "ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اس کا نام "ہندی" اتھوا ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) ہوگیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساھتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدۂ مدراس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اس کے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے بخلاف "قوم پرستی" کس طرح کام کرتی ہے:-

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اس کی تعریف میں اردو آجائے۔ جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی" اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو، اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔"

"اس کے بعد بھارتیہ ساھتیہ پریشد کا زمانہ لیجیے جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اس کے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندوستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پرزور مخالفت کی، مگر میں ان کی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی

کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور کمیٹی کے اوپر ظلم تھا۔ اس لیے کہ یہ لفظ ہندی کمیٹی والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد ومشہور ومعروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو "ہندی" نام سے یاد کیا ہے۔ پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایسی ہندی سے لاگ کھا سکتی ہیں جس میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔"

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقاء کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو "قومیت ہند" کے اس معمار عظیم کے پیش نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق:

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اردو" کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیل نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ (اس مقصد کے لیے اس تاریخی واقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں مسلمانوں نے "اردو" کو "ہندی" کے نام سے موسوم کیا تھا

حالانکہ یہ پرانا واقعہ زمانۂ حال کی اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا کہ اِس وقت یہ دو زبانیں دو الگ ناموں اور الگ رسم الخطوں کے ساتھ دو مستقل زبانیں ہیں۔)

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیب بیان، سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں اور اس طرح "ہندی" کا دامن اردو کو ساتھ لیے ہوئے سکڑنا شروع ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اردو اس طور پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سر دست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریزولیوشن کے کھلونے سے اردو والے دل بہلاتے رہیں۔ جب "قوم پرستی" بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہوگا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائے گا۔

ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھیے کہ پہلے عبد اللہ کا نام پرمیشری داس رکھ دیا جائے۔ جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں برپا کرتے ہو، پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبد اللہ کے ہیں۔ صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں، معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس ذرا سر پر چوٹی رکھ لو، کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا یہی بھوجن جو تم کھاتے ہو، پٹل پر رکھ کر کھانے لگو۔ اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں، اور فائدہ یہ ہے کہ کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے، اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائے گی۔ جب پرمیشری داس صاحب اس معقول

تو بڑ کو بھی مان لیں تو پھر ان کو زیادہ نہ چھیڑو۔ آہستہ آہستہ اسی راستہ پر انھیں بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو ان کے صاحبزادے دھرم چند (جو شاید پہلے فخرالدین ہوتے) یا ان کے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے اگر یہ چال نہ چلی جاتی) خود بخود شدھ پیدا ہوں گے۔ بغیر اس کے کہ ان کی شدھی کے لیے سنگراچاریہ آف شاردھا پیٹھ کی مدد حاصل کی جائے ۔۔۔۔ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

مہاتما گاندھی کے کارنامے کی روداد ختم کرنے سے پہلے میں اس "ہندی" (یعنی ہندی اور اردو کے مرکب) کا ایک نمونہ بھی پیش کردوں جس میں مہاتما جی کے بقول "یہ صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:۔

"اس سبھا کا سبھا پتی تو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک مجھے ساہتیہ کا رنہ ہونا اور اس لیے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو، میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا اکشیتر بڑھا دیں گے۔ یدی ہم شری لنکھوسے لیکر کنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈیبروگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی تھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں۔ (رسالہ جامعہ مورخہ مئی ۱۹۳۶ء)

یہ ہے وہ "ہندی" جس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ "اردو" اس کی تعریف میں آجاتی ہے۔ (باقی)

اطلاع

سررشتہ تعلیمات سرکار آصفیہ کی جانب سے ہر سال ترجمان القرآن کے جو ڈھائی سو پرچے مدارس کے لیے خریدے جاتے تھے اُن کو ماہ شوال ۵۶ھ سے گھٹا کر (۱۱۸) کر دیا گیا ہے لہذا جن مدارس وسطانیہ وتحتانیہ کو آئندہ مہینہ سے پرچہ نہ پہنچے انھیں یاد دہانی کی زحمت نہ اٹھانی چاہیے۔

جو مدارس آئندہ اس رسالہ کی خریداری جاری رکھنا چاہیں وہ اپنے بجٹ سے پرچہ خرید سکتے ہیں۔

منیجر

اطلاع ثانی

ماہ ذی القعدہ ۵۶ھ میں رسالہ ترجمان القرآن کا دفتر حیدر آباد سے جمال پور ضلع گورداسپور (پنجاب) میں منتقل ہو جائے گا۔ صرف ماہ شوال کا پرچہ حیدر آباد سے شائع ہوگا۔ لہذا ممالک محروسہ سرکار نظام کے اضلاع میں جو اصحاب اس رسالہ کے خریدار ہیں وہ براہِ کرم دفتر کو مطلع فرما دیں کہ ان کا پرچہ کس مقام کے انگریزی ٹپہ خانہ کی معرفت بھیجا جائے۔

منیجر

جلد ۱۱ - عدد ۴ - شوال سنہ ۱۳۵۶ھ   رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۱۸۶

۶۸۷

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ (پنجاب)

قیمت سالانہ (۵ر) روپے   قیمت فی پرچہ (۸ر) آنے

(مطبوعہ ثنائی برقی پریس امرتسر)

باہتمام چودھری نیاز علی خاں طابع و ناشر

بچوں کیلئے مفید کتابیں

سراپائے رسول ﷺ

اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک اور آپ کے عادات وخصائل، لباس، معاشرت، اخلاق وآداب واطوار اور عام طرز زندگی کے متعلق تمام معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اور ان کو بہت سہل زبان اور دل کش انداز بیان میں لکھا گیا ہے۔ جیبی تقطیع پر بہت خوبصورت طبع ہوئی ہے۔ قیمت ۴ر

ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ

اس کتاب میں صحابہ کرامؓ کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دل نشین انداز بیان کے ساتھ درج کیے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق ودینداری، حسن معاشرت اور نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ قیمت قسم اول ۸ر قسم دوم ۶ر علاوہ محصولڈاک۔

مسلمان بیبیاں

یہ کتاب ہمارے نبی کے صحابہؓ کی طرح صحابیاتؓ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ان پاک ہستیوں کی زندگی کو مسلمان لڑکیوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان اس قدر سادہ ہے کہ کم سن بچیاں بآسانی اس کو سمجھ سکتی ہیں۔ قیمت ۸ر علاوہ محصولڈاک۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

اطلاع

۱۵ ذی القعدہ ۱۳۵۶ھ (۱۸ جنوری ۱۹۳۸ء) کو دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد میں بند ہوگا اور ۲۰ ذی القعدہ (۲۲ جنوری) کو دارالاسلام (جمال پور متصل پٹھان کوٹ۔ پنجاب) میں کھلے گا۔

تاریخ مذکور کے بعد منیجر یا ایڈیٹر کے نام جسقدر خطوط لکھے جائیں وہ پتہ ذیل پر روانہ کیے جائیں۔

نیز معاصرین کرام سے بھی گذارش ہے کہ تاریخ مذکور کے بعد پتہ ذیل پہ اپنے موقر جرائد ارسال فرمائیں۔

دفتر ترجمان القرآن۔ دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ (پنجاب)

فہرست مضامین

شوال ۱۳۵۶ھ۔ جلد (۱۱) عدد (۴)

اطلاع

ماہ ذی القعدہ کا پرچہ ترجمان القرآن کا خاص نمبر ہوگا۔ جس میں محرم سے رجب تک کے اشارات کا مجموعہ درج کیا جائیگا۔ ان مضامین کو اب از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ اور ان میں بہت سے جدید مباحث کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ نیز آخر میں تمام ان اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے جو ان مضامین کی اشاعت کے بعد کیے گئے ہیں۔

مینیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پنڈت جواہرلال کے جو خیالات گذشتہ اشاعت میں پیش کئے گئے ہیں، انکو محض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھکر سرسری طور پر نظرانداز کردینا صحیح نہیں ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اب پنڈت جی کے ذاتی خیالات نہیں ہیں بلکہ کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد سے جمہور مسلین کے ساتھ ربط قائم کرنیکی جو تحریک (Muslim Mass Contact Movement.) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کئے ہیں۔ پورا مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے مسلمانوں میں اسلامی قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے اسکا بڑے جوش کیساتھ خیرمقدم کیا جاتا ہے اور ہر اس آواز کو جو اسلامی شعور کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے بلند ہوتی ہے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرز عمل کی توضیح کیلئے میں صرف دو مثالیں پیش کرونگا۔ مثالوں کی کمی نہیں ہے اگر تحدی کیجائے تو انکا ایک معتد بہ ذخیرہ میرے پاس محفوظ ہے جسے ضرورت کے وقت پیش کرسکتا ہوں۔ مگر چونکہ میں بحث کو طول نہیں دینا چاہتا اسلئے صرف دو مثالوں پر اکتفا کرونگا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ابھی چار یا پانچ مہینے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ یا در ہے، نقوی نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حقدار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ایک کانگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے:۔

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کیلئے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائیگا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جسکو ہمارے آقاؤں نے اس قدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے اسوقت بیکار ہو کر رہ جائیگا جبکہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہینگے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کر لینگے۔ لہذا مسٹر نقوی کو مستقبل کیلئے ایک فال نیک سمجھنا چاہیئے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں"۔

اس مضمون میں انگلستان کے ان ملاحدہ کو مثال میں پیش کیا گیا ہے جنہوں نے حریت فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں، مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول۔ پھر اسلام سے بغاوت کرنیوالے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دیکر اسکی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا کانگریسی اخبار (تیج) اپنی ۱۴ راگست ۳۷ء کی اشاعت میں ایک مسلمان عورت کا خط شائع کرتا ہے جسکے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"جب میرٹھ میں پوجیہ پنڈت جواہرلال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر جلسہ دیکھنے

گئی اسوقت سے میرا دل بےچین رہنے لگا۔ میں نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا لگا دیا۔ لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ تو کھانا کھایا نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے پیارے پنڈت جواہرلال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر انکی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دونگی۔ چنانچہ میں اسی دن لڑا کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں۔ اب جب تک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا، اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا، میں اسکی شکل بھی نہ دیکھونگی۔

"ایڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھی ہیں جو پردہ کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارے گھر والے ہمکو بہت تنگ کرتے ہیں۔

"اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ اور آپ ہمارے پوجیہ پنڈت جواہرلال سے کہیے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو اور محض ایک جعل ہو لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کیساتھ "لشکر آزادی" کے ان نقیبوں کے مافی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علم بردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ "آزادی کی فوج" کیلئے کس قسم کے سپاہی انکو مسلمانوں میں درکار ہیں، اور کم از کم کس حد تک اصول اسلام سے منحرف ہونا ضروری ہے جسکے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کرسکتے ہیں۔

یہ بغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جارہی ہے بلکہ خود مسلمان بھی اسکی اشاعت کیلئے آلۂ کار بنائے جارہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہل قلم اور مسلمان رسائل و جرائد اپنی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جارہے

ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کیلئے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس کے لئے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو میں پیش کر سکتا ہوں، مگر یہاں میں صرف ان حضرات کی تحریروں سے استناد کروں گا جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی "سرکاری" یا ذمہ وارانہ حیثیت رکھتے ہیں:-

---

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبۂ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"مختصر یہ کہ اخلاقی سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اجنبی تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہل ملک کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے وابستہ کر لیا۔" (جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

آپ سمجھے کہ "یہ جدید نظام مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دین الٰہی کیطرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "قوم پرست مسلمان" ــــ مجموعۂ ضدین ــــ کی معراج تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے جس میں سیاسی اغراض پر مذہب کو قربان کرنے کی ابتدا ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تذکرہ میں اس نامبارک

دور کے جو حالات بیان فرمائے ہیں انکو پڑھیئے تو آپکو اسکی فتنہ سامانیوں کا اندازہ ہوگا۔ یہ پہلا فتنۂ عظیم تھا جس نے پوری طاقت کیساتھ الحاد و بیدینی پھیلا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وطنی قومیت میں جذب کرنیکی کوشش کی۔ اُس دور کے تمام صلحاء امت اس فتنے پر چیخ اٹھے تھے۔ حضرت سید احمد مجدد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ اسی ناپاک دور کے اثرات تھے جنہوں نے دارا شکوہ کی صورت میں جنم لیا اسی زہر کو دور کرنیکے لیے عالمگیر پچاس برس جدوجہد کرتا رہا اور یہی زہر آخر کار مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو گھن کیطرح کھا گیا۔ مسلمانوں میں قوم پرستی کی جدید تحریک دراصل اسی پرانی تحریک کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اس فتنۂ عظیم کو فتنے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خیر القرون" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وسوسہ (Inspiration.) حاصل کرنیکے لئے اُسی کیطرف رجوع کرتے ہیں۔ انکے نزدیک متحدہ قومیت کی آفرینش کا یہ پہلا تجربہ، ہندوستانی مسلمان کی "خدمات" میں شمار ہونیکے لایق ہے۔ ان کے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا تصور یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قسمتوں کو اسی طرح اہل ملک کیساتھ ہمیشہ کیلئے وابستہ کرلیں۔

پنڈت جواہر لال بھی اسکے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں فرماتے ہیں:-

سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی معہ تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جسمیں ایک سے زیادہ "اقوام" بستی ہیں کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر "قوم" علحدہ علحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولتِ ہند (Commonwealth.) میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا کرے؟ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت تک کی کوششیں اسکے برعکس بالکل ناکام رہی ہیں . . . . .

لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی تب تو ہمیں عزم واستقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیئے بلکہ ہمارے پیشے اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیئے بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کیلئے ایک مضرت ہے لیکن اسکا کوئی چارۂ کار نہیں اور چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہئے

یہاں ما فی الضمیر بالکل واضح ہو گیا ہے۔ صوبۂ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی قسمتیں جس شخص کیساتھ وابستہ ہیں جسے بہار کی وزارت میں ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم کا نگراں بنایا گیا ہے، وہ سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل "قومیت" باقی رہے اور آزاد ہندوستان میں انکو ایک ممتاز اجتماعی وجود کی حیثیت سے اپنے مسائل خود حل کرنیکا موقع حاصل ہو۔ اُسکا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف اور جواہر لال نہرو کے نصب العین سے بالکل متحد ہے۔ ہم آزادی اس لئے چاہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس کے غیر مسلم اقتدار نے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اسکی تلافی کر سکیں۔ اور وہ آزادی اس لئے چاہتا ہے کہ ابتک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے، آگے چل کر وہ اپنے طبعی نتیجہ کو پہنچ جائے، یعنی ہماری مضمحل شدہ قومیت ہندوستان کی مشترک قومیت میں جذب ہو جائے، ہماری تہذیب کی کوئی امتیازی شان باقی نہ رہے، ہمارے مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے ہم پیشہ غیر مسلموں کیساتھ گھل مل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کیساتھ "رسوم میں بھی یکسانیت" پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں کیلئے لفظ "اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے وہ ہندوستان کو ایک جغرافی نام نہیں بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلۂ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ "ہر قوم علحدہ علحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترک دولت ہند میں صرف لسانی اور مادی امداد کرے"۔ برعکس اسکے صحیح حل یہ ہے کہ "مسلمان اسی راستہ

پر گامزن ہوں جو اکبر اور ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی" یعنی ہندوستان کی کانِ نمک میں نمک بننے کیلئے تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیئے؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر اور اپنی خاطر ——— غالباً یہاں "اپنے پیٹ کی خاطر" لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوئی ہوگی۔ این ہم غنیمت است!

کیا جواہر لال نہرو کا تصورِ قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے؟

مسلمانوں کو اپنے نام "مسلم" پہ بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام، اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ مگر ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نزدیک اس علحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابلِ اعتراض ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسماء انکے نزدیک محو ہو جانے چاہئیں اور صرف ایک نام "ہندی" تمام باشندگانِ ہند کے لئے استعمال ہونا چاہیئے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس ہی باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:۔

لفظ "ہندی" کو زبان کیلئے نہیں بلکہ "اہلِ ہند" کیلئے اختیار کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے۔ جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اسکا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بنجاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کردینا ہے کہ ہم اس برِ اعظم کی علحدہ علحدہ "مذہبی اقوام" ہیں۔ اسی لیئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کرلیں۔"

"ہم علحدہ علحدہ مذہبی اقوام ہیں" یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہے جسے مٹادینے کی ضرورت ہے! اور وہ دماغی کیفیت ہی لائق صد شرم و ندامت ہے جسکے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک ہندوستان دو زخ نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں! اور یہ ثابت ہو جاتا کہ ہم اس برِ اعظم کی علحدہ علحدہ مذہبی اقوام ہیں، گویا اس بات کا ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم دورِ وحشت کی

یادگار ہیں، اور اس تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کیلئے اب ناگزیر ہوگیا ہے کہ ہم ان ناموں کو بدل ڈالیں جو "ملحدہ مذہبی اقوام" ہونیکے احساس کو زندہ رکھتے ہیں ——

یہ ہیں اس زعیم قوم کے خیالات جسکو مولینا ابو الکلام آزاد نے صوبۂ بہار کی وزارت میں ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کیلئے منتخب[1] فرمایا ہے، اور جو بجنور کی انتخابی مہم میں مسلمانوں کی رہنمائی کیلئے مولینا حسین احمد صاحب کیساتھ دوش بدوش کام کرتا نظر آتا ہے۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم میں کہ اصل محرومی آنکھوں کا بصارت سے محروم ہوجانا نہیں ہے بلکہ ان دلوں کا بصیرت سے محروم ہوجانا ہے جو سینوں میں پوشیدہ ہیں۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ

جو لوگ جناح کی فرنگیت اور بے دینی پر بڑھ بڑھ کر اعتراض کرتے ہیں، ان کے جوش دینداری کو دیکھ کر ہماری زبان سے بے اختیار مرحبا نکلتی ہے۔ مگر جب اسی لمحہ میں وہ خیالات کی تبلیغ کرنیوالوں کیساتھ اشتراک عمل کرتے نظر آتے ہیں، اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کیساتھ اشتراک عمل کرنے کے باوجود جناح پر طعن کرتے ہوئے انھیں شرم بھی نہیں آتی تو ہم حیران ہوکر پوچھتے ہیں کہ یا رب! یہ کیا تماشا ہے؟ یہ دینداری ہے یا سیاسی دھڑے بندی اور عصبیت جاہلیت؟ جناح فرنگی اور بے دین سہی مگر کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا کی آواز تو بلند کر رہا ہے۔ اسکو تو مطعون کیا جاتا ہے محض اس بنا پر کہ نہ اس کی صورت اسلامی ہے نہ سیرت اسلامی۔ مگر یہاں سیرت وصورت دونوں غیر اسلامی ہیں اور اس کیساتھ یہ صدا بھی بلند کی جارہی ہے کہ تعالوا الی کلمۃ سواءٍ بیننا وبین الکفار والمشرکین۔ یہاں عود الی الجاہلیۃ

[1] اس موقع پر مولانا ابو الکلام کے تذکرہ میں ان علماء و مشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے، جنھوں نے دور اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کیساتھ مداہنت برتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولینا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ انشاء اللہ ازدیاد بصیرت کے موجب ہوں گے۔

۲ الاولیٰ کیطرف دعوت دی جارہی ہے اور سیاسی اغراض کیلئے ملتِ ابراھیمی کا نام تک مٹا دینے کی فکر ہے۔ اس کے باوجود آزادی ہند کے ان داعیوں کیساتھ اشتراکِ عمل کیا جاتا ہے اور ان کا اعتبار مسلمانوں میں قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ یہ انگریزی اقتدار کی جڑ کھودنے سے پہلے محمد رسول اللہ کے نخلِ آرزو کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں!

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

یہ تو صرف ایک نظیر تھی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بس یہ ایک ہی نظیر ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبہ اسلامیات قائم کیا ہے جس کے کارکن مسلمان ہیں، اور نشر و اشاعت کے آلۂ کار سب مسلمان اخبارات ہی ہیں۔ مسلمانوں کیلئے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں انکی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات کے قیام کو بھی ایک نمایاں جگہ دی جاتی ہے، چنانچہ جمعیت علماء ہند کا واحد ترجمان "الجمعیت" اس خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"دورِ جدید میں مسلمانوں نے شکایت کی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی اسلامی جوامر نے اس شکایت کو پیش کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسکی معقولیت کو تسلیم کیا اور محض مسلمانوں کی دلدہی اور سہولت کار کیلئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ماتحت اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ کھول دیا" (الجمعیۃ مورخہ ۵ ر رمضان ۵۶ھ)

بیچارے ناواقف عوام جب ان الفاظ کو دیکھیں گے تو کہینگے کہ کیسی مہربان ہے یہ کانگریس! اس نے آج تک کوئی شعبۂ ہندویات و سکھیات و پارسیات نہیں کھولا، مگر ہماری "دلدہی" اس کو اس قدر منظور ہے کہ خاص ہمارے لئے ایک شعبۂ اسلامیات کھولدیا۔

اب ذرا اس شعبہ کی کارگذاری ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب (معتمد شعبۂ اسلامیات) کا ایک مضمون الجمعیتہ ہی میں ۱۰ رجب ۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوا ہے۔ اور ادارہ کی جانب سے اس پر کوئی تردیدی نوٹ یا اختلافی اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی حالات اس درجہ ترقی کر گئے ہیں۔ اور فضا کا تقاضا اس درجہ شدید اور انقلاب انگیز ہے کہ رجعت پسندوں اور سامراج پرستوں کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ علانیہ کانگریس یا آزادی کی جدوجہد کی مخالفت کریں۔ اس لئے ملک کو پیچھے لے جانیوالی طاقتیں اور سامراج کی حامی جماعتیں کسی تعصب کی آڑ لیتی ہیں۔ گذشتہ سات آٹھ سال میں جب کبھی سیاسی یا سماجی ترقی کیلئے قدم بڑھایا گیا، ہندو مسلم سوال ضرور چھیڑ دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ابتدائی تعلیم کے متعلق کانگریسیوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں ایک زمانہ میں سوال چھیڑا تو رجعت پسند مسلمانوں نے فوراً مذہبی تعلیم و تربیت کا سوال شروع کر دیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے لوگ اس موقع پر کونسل چھوڑ کر چل دیئے ساردا ایکٹ کے خلاف جو ہندو اور مسلمان قدامت پسندوں نے ہنگامہ کیا وہ سب کو معلوم ہے ......

ترقی پسندی کیطرح رجعت پسندی بھی ہماری پبلک زندگی کے ہر پہلو پر محاذ قائم کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بوسیدہ چیز خود فنا نہیں ہوتا۔ بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد اسے معزول کر دیتی ہیں۔"

غور فرمایئے مسلمان بچوں کیلئے تعلیم کی کسی اسکیم میں مذہبی تعلیم و ترتیب کا مطالبہ کرنا رجعت پسندی ہے، سامراج کی حمایت ہے، ملک کو پیچھے لے جانیوالی طاقتوں کا کام ہے فضا کا انقلاب انگیز تقاضا اب یہ ہے کہ اس "بوسیدہ" چیز کو بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد معزول کر دیں۔ اور یہ ساردا ایکٹ کا تذکرہ کتنا برمحل آیا ہے۔ اگرچہ اس "ترقی پسند" قانون کی مخالفت "الجمعیتہ" نے اس

وقت کی تھی جب اسکا ایڈیٹر ایک " رجعت پسند" شخص تھا، مگر اس رجعت پسندی میں خود جناب مولینا کفایت اللہ صاحب اور مولینا احمد سعید صاحب اور تمام ارکان جمعیت علماء ہند (یعنی اسوقت جو حضرات فضا کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں سے متاثر ہو کر " ترقی پسند" بن گئے ہیں) اسکے ہم نوا تھے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث شروع کرتے ہیں کہ کانگریس کی شرایت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کا سوال جو اٹھایا جا رہا ہے، یہ دراصل ترقی پسند اور انحطاط پذیر قوتوں کی کشمکش کا ایک عکس ہے۔ " ترقی پسند" اور " انحطاط پذیر" ان دو اصطلاحوں کا مفہوم جواہر لال اور انکے " شعبۂ اسلامیات" کی لغت میں جو کچھ ہے اسکی تشریح میں بعد میں عرض کرونگا۔ یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ " ترقی پسند" قوتیں اسلامی تہذیب کے سوال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

" یہ صحیح ہے کہ مسلمان ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں۔ باوجود اختلافات اور تنوع کے انہیں ایک قسم کی یگانگت اور یکسانیت پائی گئی ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کی زبان ایک تھی یا تمدن کے مظاہر ایک سے تھے، لیکن تاریخی طور پر کسی حد تک یہ صحیح ہے کہ مسلمان حکمراں طبقہ کے رجحانات ایک سمت کی طرف دکھائی پڑتے ہیں۔ لوگ اسلامی تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت پائی تھی اور بہر صورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے صبری کیساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گناتے وقت یہ حدیث سناتے ہیں کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہٖ وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے سماجی حالات کا عکس ہیں۔ جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور

محکوم، راعی اور رعیت میں ہوتی تھی اور مسلمان من حیث القوم حکمراں تھے ......

البتہ اسلامی تمدن اور تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا آج کل ہوگیا ہے آج اسلامی تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کیلئے دو چار ہندو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنیئے یا اگر فصیح و بلیغ اردو نہ بولیئے تو آپ کا تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معیاری اور ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں (چاہے وہ کایستھ یا کشمیری برہمن ہی کیوں نہ ہوں) یا پھر دیوبند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے اور علماء کی وضع کے پابند لوگ۔"

دیکھا آپ نے "ترقی پسندوں" کے علم و فضل اور انکی دانش و بینش کا معیار کسقدر بلند ہے! انکے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آواز کو ایک ریکارڈ میں بھر وادیا ہے، اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے۔ اپنے شیخ طریقت، پنڈت جواہر لال کیطرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے پر اظہار خیال کر کے درحقیقت اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں، بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہیں — یا اگر نا آشنا نہیں ہیں تو عمداً غلط مبحث کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا حکمران طبقے کے آداب و اطوار کا لباس کی وضعوں اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، اور اظہار مافی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات

رونما ہوتے ہیں انکے درمیان یہ کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کونسے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کونسے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو، تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بار ہا بدل چکا ہے، اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے، لہذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے جسطرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی اُن تغیرات کو قبول کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ جنکا تقاضا، فضل کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور انکی امت کے رجحانات کر رہے ہیں ۔۔۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کیلئے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اُس طریق فکر، اس نظریۂ حیات، اور اُس معیار امتیاز و انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتدبہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور جسکے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اُس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے اصول و قواعد کے مطابق اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرز خیال اور ان اصول حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرت رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر ہے وہ اسلامی تمدن ہے خواہ اسکی زبان، اسکے آداب و اطوار، اسکے کھانوں اور مٹھائیوں اور اسکے لباس و طرز معاشرت میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے دائرے سے خارج

نہیں کردیتا، البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لئے کوئی سند جواز نہ ہو تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا موجب ہوگا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لیکر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں مگر ان سب میں ستر عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لہذا یہ سب لباس اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس کہے جائینگے۔ مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہوگا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہیں گے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے جو حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کئے ہیں ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں، اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرہ میں جگہ ملے گی، البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدودِ حلت سے متجاوز ہوگی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجئے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور انکے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے کو کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دور حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے، اور جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اُس گذرے ہوئے تاریخی دور کی میراث کو اس بدلے ہوئے زمانہ میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے، اس لئے یہ رجعت پسند اور ترقی

دشمن ہیں"۔ ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی غلط ترجمانی شاید ایسی بیحیائی کے ساتھ تو یورپ کے سیاسی بازی گروں نے بھی نہ کی تھی، جیسی کہ یہ ہمارے ہم وطن اور ہم قوم کر رہے ہیں۔ ان کو اگر خبر نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اس تمدن کی حفاظت کیلئے نہیں اٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمراں طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا، بلکہ ہم اس لئے اٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقار قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ ہمیں دلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے، بلکہ اس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کے لئے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم دیوبند اور فرنگی محل کے لباس کو محفوظ رکھنے کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ ہم اس لئے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اُس لباس حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اس لئے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں، جن میں اتنی راست بازی و انصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹی روح گھس گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اس کے استعمال میں صداقت، انسانیت اور اخلاق کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبہ اسلامیات جو ہماری "دلدہی" اور "سہولت کار" کے لئے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے جو نظریات آپ پہلے پڑھ

چکے ہیں، انکو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری "دلدہی" کے لئے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کیساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں یہ سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جسکی حفاظت کا تم دعوے کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات سے تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب باقی نہیں۔ اب لے دیکے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلی اور لکھنؤ تک محدود ہے، اور دلی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے بلکہ کایستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلے میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گذر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ سامراج پرستی بھی ہے کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے!

مسلمانوں کو شکایت تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقہ سے اسے دور کیا ہے!

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے سنیئے۔

"جاگیرداروں اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدن بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، تاتاری چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی، ہر طرح کے لباس

مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلاوطن ہوکر ایران پہونچا تو شاہ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کیلئے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں۔ بہتّر فرقے ضرب المثل ہیں۔"

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ متنوع کی تمام مثالیں کس مقصد کیلئے پیش کیجارہی ہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہنکر، ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھاکر، بہتّر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے یکسر محروم ہوکر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت (Social Service.) کیلئے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنے اور لکھنی شروع کردو۔ مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز کی تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کونسا مضائقہ ہو جائیگا؟ — اسی مقصد کو چھپا کر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اسکے تقاضے سے باخبر ہوں"

اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اُس سماجی انقلاب (Social revolution.) کیلئے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے جس کا نقشہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جارہی ہے؟ اس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیتِ علمارِ ہند کا واحد ترجمان ہے۔ کیسے صحیح راستے پر جارہی ہے یہ "آزادی

کی نوح" اشرد ہانند کی شدھی پر شور قیامت برپا تھا۔ جواہر لال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جارہی ہے۔

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے ان میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرمالئے۔ ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا۔ دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب و تمدن پر ضرب لگائی۔ اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔ اخبار "مدینہ" میں اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار کارکن جناب منظر رضوی صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس پر اختلافی نوٹ کے بجائے ادارۂ مدینہ کی جانب سے حسب ذیل تعریفی نوٹ لکھا گیا ہے:۔

"فاضل مقالہ نگار نے جس خوبی کیساتھ اسلامیان ہند کے سامنے مسائل حاضرہ کو پیش کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ قارئینِ مدینہ اس مقالہ کو صبر و سکون کے ساتھ از اول تا آخر مطالعہ فرمائیں۔" ("مدینہ" مورخہ یکم نومبر ۳۸ء)

اب ذرا دیکھئے کہ کس خوبی کے ساتھ اسلامیانِ ہند کو مسائل حاضرہ سمجھائے جاتے ہیں۔

"ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اس کے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیرداروں کی مالگذاری اور لگان بند کرنا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان پایوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) مچیگی۔ بلوے اور فساد ہوں گے۔ اس میں خونریزیاں بھی ہونگی خون کی ندیاں بہینگی اور سب کچھ ہوگا۔ اور اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار، پونجی اور کانوں

کے مالک، تعلقوں اور جاگیروں کے آقا۔ یہی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات
راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند اور سیٹھ ڈالمیا جو مسلم ملت اور ہندو جاتی کے نعرے
لگائے جاتے ہیں اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش
سامراج کے ساتھ ہونگے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے۔ دوسری طرف غریبوں کی قسمت
ہوگی اور ان کی جیون ساتھی کانگریس۔"

"ہماری آنے والی لڑائی در اصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔ اس میں ہندوستان
بھر کے امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے
اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کیلئے ہر ہتیار کو استعمال کریں گے۔"

..... پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، اور سر
سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھا رہا ہے
دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے، امیروں کو نیچے آنا ہے۔ غریبوں کو اوپر جانا ہے۔
ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا اپنے
اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ
مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لئے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر
کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں۔"

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنیکے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:۔

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے:" ہندوستان بھر کے مسلمانو ملجاؤ!" سوال یہ ہے کہ ہندوستان
بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں
تک توحید، رسالت، مذہبی معتقدات، اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپس میں

ملے ہوئے ہیں۔ بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لئے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے اور نہ انکو متحد ہونا چاہیئے مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں"

"ہندوستان میں امیر اور غریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے اور غریبوں کی محنت سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیری کے یہ وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو غربت کو دور کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود پہلوؤں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ شخصی ملکیت کو ختم کیا جائے........ یہ عام اصولی بات ہے۔ اب ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب سب کی ایک ہی حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں۔ جو شاید زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ ہوں گے۔ سات کروڑ مسلمان محنت سے روٹی حاصل کرتے ہیں۔... ... جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو ہم مذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا..... اس کے خلاف وہ ایک کرور مسلمان بھی ہیں جن کے پاس زمین، جائداد، کارخانے اور کان ہیں۔ ان کی بیسیوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ اب ان سات کروڑ غریب مسلمانوں کو ایک کروڑ امیر مسلمانوں سے ملنے کیلئے کہا جاتا ہے"

"نجیر" تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں۔ خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں۔ ان میں کوئی یگانگت نہیں . . . . . .

. . . . . . مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں۔"

فی الواقع مسائل حاضرہ کو ان سطور میں "بڑی خوبی" کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اگر ایسی خوبی کیساتھ ان مسائل کو صرف وہی لوگ پیش کرسکتے ہیں اور ایسی گرمجوشی کیساتھ ان کی داد بھی وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھیں تعلیم قرآن کی ہوا تک نہ لگی ہو، یا جنھوں نے اِتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا کے بمصداق قرآن حکیم کو ایک دور از کار شے سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیا ہو۔

انگریزی سامراج کے مقابلہ میں ان لوگوں کا نقشۂ جنگ خود انہی کی زبان سے آپ نے سن لیا۔ یہ چاہتے ہیں کہ اس سامراج کے قلعے کو ڈھانے کیلئے اشتراکی انقلاب برپا کریں۔ اشتراکی انقلاب برپا کرنیکے لئے ناگزیر ہے کہ پہلے نادار لوگوں کو بلا امتیاز دین و ملت ایک گروہ بنایا جائے، اور مالدار لوگوں کو بلا امتیاز دین و ملت ایک دوسرا گروہ بننے پر مجبور کیا جائے۔ پھر پہلے گروہ میں دوسرے گروہ کے خلاف نفرت، حسد اور بغض کی اتنی آگ پھونکی جائے کہ وہ کرانتی مچانے اور لوٹ مار کا بازار گرم کرنے اور خون کی ندیاں بہانے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ کام جب پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا اور اس قسم کی کرانتی سارے ہندوستان میں مچ جائیگی، تب کہیں سامراج کا قلعہ منہدم ہوگا؛ یا زیادہ صحیح الفاظ میں تب وہ ہتھیار تیار ہوگا جس سے یہ حضرات اس قلعے کی جڑوں پر ضرب لگانا چاہتے ہیں ـــــ اب اگر آپ اسلام کی حقیقت سے واقف ہیں اور امت مسلمہ کے نظام ترکیبی کو تھوڑا بہت بھی جانتے ہیں تو یہ سمجھنا آپ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ اس طریق جنگ سے سامراج کا استیصال تو بعد میں ہوتا رہیگا۔ پہلے تو اسلام کا استیصال بحیثیت ایک نظام اجتماعی کے، اور امت مسلمہ کا استیصال بحیثیت ایک قوم کے

مکمل ہو جائیگا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو حقیقت سے قریب تر ہوگا کہ جس ہتیار سے یہ لوگ انگریزی سامراج کا قلعہ ڈھانا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک تیار ہی نہیں ہو سکتا جب تک اسلام کے قصر کو مسمار کر کے اسکا مسالہ اس ہتیار کی تیاری میں صرف نہ کر دیا جائے۔

پنڈت جواہرلال کے جو خیالات آپ رمضان کے "اشارات" میں پڑھ چکے ہیں انھیں سامنے رکھیئے اور اسکے بعد ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر اشرف، اور منظر رضوی صاحبان کے ان ارشادات کو علی الترتیب پڑھیئے۔ تب آپکو معلوم ہو جائیگا کہ یہ آزادی کی فوج کس طرح بنائی جا رہی ہے، کس طرح اسکی تشکیل میں خود مسلمانوں سے کام لیا جا رہا ہے اور اسکے کیا نتائج مسلمانوں پر مترتب ہونیوالے ہیں۔

ان کا پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دماغ سے اسلامی قومیت کا خیال نکالدیں۔ یہ ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا چاہتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کی مستقل قومیت کو فنا کر دینا انکے نزدیک ہندوستان جدید کی تعمیر کیلئے ناگزیر ہے۔

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب اور ایک تمدن کو اختیار نہ کرلیں۔ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب ہے، اسی کو دور کرنے کیلئے کہا جا رہا ہے اور خود مسلمانوں کی زبان سے کہلوایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی کوئی علحدہ تہذیب ہے ہی نہیں۔ تمدن کی مختلف صورتیں وہ ہمیشہ اختیار کرتے رہے ہیں، اور اب اس صورت کو بھی قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں جو "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے پیدا ہو رہی ہے۔

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظام اجتماعی پر ہے اور یہ سب سے زیادہ خطرناک حملہ ہے کیونکہ یہی حملہ مسلمانوں کو قرآنی مذہب کے دائرے سے نکال کر اشتراکی مذہب میں شامل کر دیتا ہے۔ مسلمانوں کی

عظیم اکثریت بھوک اور افلاس میں مبتلا ہے اور اسکے ساتھ مذہب سے جاہل بھی ہے۔ اس انبوہ کثیر میں اگرچہ اتنی عقل ضرور ہے کہ اگر اس سے علانیہ تبدیل مذہب کے لئے کہا جائے تو شاید وہ مرنے اور مارنے پر تیار ہو جائے، مگر اتنے ہوشمند یہ لوگ نہیں ہیں کہ اشتراکیت کے نتائج کو سمجھ سکیں۔ ان کے سامنے جب یہ کہا جائیگا کہ آؤ ہم تمہاری بھوک کے مسئلے کو حل کئے دیتے ہیں، تو یہ بیچارے ٹڈی دل کی طرح اس مسلک کیطرف ٹوٹ پڑینگے جسمیں انکو پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان نظر آئیگا۔ یہاں ان سے کہا جائیگا کہ تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری طرح بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہیں، اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں یا جنکے پاس تم سے کچھ زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں، آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کیساتھ ملکران مسلمان دشمنوں سے لڑو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سات کروڑ جاہل اور مفلس مسلمان، اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے ان ایک کروڑ مسلمانوں سے نہ صرف علحدہ بلکہ برسر جنگ ہو جائینگے جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو بہرحال کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہیں اور جنکے پاس کسی نہ کسی حد تک اسلامی شریعت کا علم محفوظ ہے (یہاں یہ یاد رہے کہ ان ایک کروڑ مسلمانوں میں سب کے سب نفع طلقدار اور جاگیردار، راجہ محمود آباد اور نواب چھتاری نہیں ہیں اور نہ سب بدیسی سامراج کے ساتھی ہیں بلکہ ان میں مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسے لوگ بھی ہیں اور ہمارے متوسط طبقے کی عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہے) اس قسم کی علحدگی اور دشمنی پیدا ہو جانے کے بعد کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ ان دونوں طبقوں کے مسلمان مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت و عمل میں ایک دوسرے سے ملے رہیں جنکے درمیان روٹی کی لڑائی چھڑ گئی ہو، کیا وہ مسجدوں میں مل کر نماز پڑھ سکتے ہیں؟ جنکے دلوں میں بغض و حسد کی آگ بھڑکا دی گئی ہو، کیا وہ اپنے پیٹ کے دشمنوں کو اپنا دینی بھائی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مالدار مسلمان اپنے اس ہمسایہ کو زکوٰۃ دے جسکے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اس کی جائداد لوٹنے کی فکر میں لگا ہوا

ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مفلس طبقہ کے عوام، متوسط تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں سے اُس مذہب کے معتقدات اور احکام سُنکر قبول کرینگے جو صاف طور پر شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، حلال طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو کمانیوالے کا حق قرار دیتا ہے، اور اس شخص کو مفسد اور ڈاکو سمجھتا ہے جو ایسی دولت کو چھیننے کیلئے ہاتھ بڑھائے؟ پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان معاشی نزاع اور طبقات کی جنگ برپا ہوجانے کے بعد دینی اخوت کا رشتہ کسیطرح باقی ہی نہیں رہ سکتا، اور یہ رشتہ ٹوٹ جانیکے بعد جو سات کروڑ جاہل مفلس مسلمان اپنے سے دوگنی بلکہ تگنی تعداد کے غیر مسلموں میں گھل مل جائینگے جنہیں یہ احساس پیدا کیا جائیگا کہ انکے اصلی بھائی یہی غیر مسلم ہیں، اور جن کو اشتراکی اصول و عقائد کے مطابق ٹریننگ دیجائیگی، انھیں کونسی چیز دائرۂ اسلام سے نکلنے اور غیر اسلامی قومیت میں جذب ہوجانے سے نہیں بچا سکتی ہ

فرمائیے اس تحریک کو اگر میں "شدھی" سے تعبیر کرتا ہوں تو کیا غلطی کرتا ہوں۔ کیا فرق ہے اس شدھی میں اور شردھا نند والی شدھی میں؟ مسلمان جب اسلام سے منحرف ہوگیا اور اسلامی قومیت سے نکل گیا تو ہمارے لئے یکساں ہے خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا کسی اور مت میں۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ شردھا نند کی شدھی ایک کھلی ہوئی چیز تھی، اسکا داعی صاف کہتا تھا کہ میں تمہیں اسلام سے نکالنا چاہتا ہوں، ہر وہ شخص اس سے بچ سکتا تھا جو کفر سے بچنا چاہتا ہو، اور کسی طرح یہ ممکن ہی نہ تھا کہ مسلمان اس شدھی میں خود مددگار بنجاتے۔ بخلاف اسکے یہ شدھی ایسی ہے کہ اسکا نام "آزادی کی جنگ" جیسا قابلِ عزت نام ہے۔ اس میں خود مسلمانوں سے، انکے مقرروں سے، انشاپردازوں سے، لیڈروں سے، ایڈیٹروں سے، حتیٰ کہ انکے علماء تک سے حسبِ حیثیت کام لیا جارہا ہے، اور ہزاروں مسلمان اس کی طرف بگ ٹٹ چلے جارہے ہیں بغیر اسکے کہ انھیں اس امر کا شعور ہو کہ وہ دراصل شدھی کے راستے پر

جا رہے ہیں۔

یہ ہے اس جنگ آزادی کی حقیقت جس سے علٰحدہ رہنے پر "قوم پرست" ہی نہیں بلکہ ہمارے "دین پرست" بھائی اور ہمارے دین کے علمبردار علماء تک مسلمانوں کو بزدلی اور ٹوڈیت اور سرکار پرستی کے طعنے دے رہے ہیں۔ ان حضرات پر کانگریسی پریس کے پروپیگنڈا اور جواہر لال کے مصنوعی الفاظ کا جادو چڑھ گیا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ "آزادی کی جنگ" فی نفسہٖ ایک مقدس جہاد ہے جس میں شریک ہونا ہر مسلمان کا "فرض" ہے ــــ "فرض" کے لفظ کو یاد رکھیے کیونکہ مولانا ابوالکلام جیسے عالم دین نے فرائض کی فہرست میں اس نئے فرض کا اضافہ فرمایا ہے ــــ حالانکہ درحقیقت یہ آزادی مسلمانوں کے لیے آزادی نہیں ہے بلکہ ان کی قومیت، انکی تہذیب، اور انکے نظامِ اجتماعی کی کامل بربادی ہے اور اُس کام کی تکمیل ہے جسے ڈیڑھ سو برس پہلے انگریزی امپیریلزم نے شروع کیا تھا۔ ایسی آزادی کے لئے لڑنا ہرگز مسلمانوں کا فرض نہیں ہے۔ قرآن سے، حدیث سے، اور عقل سے، غرض کسی معیار حق و صداقت سے بھی اس احمقانہ فعل کو فرض ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ "فرض" تو درکنار، میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو ایسی جنگ سے دلچسپی یا ہمدردی رکھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ اسکے برعکس ان پر دین اور عقلِ سلیم دونوں کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے قومی وجود اور اپنی تہذیب کو تباہی سے بچانے کیلئے اجتماعی جدوجہد اور سرفروشانہ جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔

آزادی کی یہ نام نہاد جنگ صرف انگریزی امپیریلزم ہی کے خلاف نہیں ہے جسکے ہم اور جواہر لال دونوں یکساں دشمن ہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ اُس قومیت، اُس تہذیب اور اُس نظامِ اجتماعی کے خلاف بھی جنگ ہے جسکو ہم دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جواہر لال اپنے ہندوستان

جدید کی تعمیر میں سدِ راہ سمجھتے ہیں۔ جواہر لال ہمارے اور اپنے مشترک دشمن سے لڑنے کیلئے جا رہے ہیں لیکن اس لڑائی کیلئے طریقہ وہ اختیار کرتے ہیں جو مشترک دشمن کیساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے خود ہمارا استیصال کر دیتا ہے۔ جب ایسی لڑائی میں ہم انکے ساتھ شریک ہونےسے انکار کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم رجعت پسند ہو، ترقی دشمن ہو اور سامراج کے حامی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ترقی بس اُسی چیز کا نام ہے جسے جواہر لال ترقی کہتے ہیں، اور اسکی مخالفت کرنا رجعت پسندی ہے۔ سامراج کی جڑ کھودنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم اسکے ساتھ اپنی جڑیں بھی کھود ڈالیں، اور اس طریقہ سے انکار کرنا گویا سامراج کی حمایت کرنا ہے۔ سامراج کو انہوں نے ہمارے لئے ایک ہوّا بنایا ہے جس سے ڈرا ڈرا کر وہ ہمکو اس راستہ کیطرف دھکیلنا چاہتے ہیں جسمیں ہماری ہستی ہی فنا ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مصنوعی الفاظ جھوٹے پروپیگنڈا، اور پُر فریب مظاہرات کا ایک جال بچھایا ہے جو بدترین ذہنی استبداد کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہ لوگوں پر اپنی مرضی کو جبراً مسلط کر رہے ہیں اور جو کوئی انکے استبداد کی اطاعت کرنے سے انکار کرتا ہے اس پر اپنے بناوٹی الفاظ ـ رجعت پسندی، فرقہ پرستی، ترقی دشمنی اور سامراج پرستی ـ کی بارش کرتے ہیں تاکہ اسکی آواز بے اثر ہو جائے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو سامراج پرستی کے اصلی مجرم وہ خود ہیں، کیونکہ سامراج سے لڑنے کیلئے انہوں نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسکو ہندوستان کی ۱/۴ آبادی کسی طرح قبول نہیں کر سکتی۔ اس غلط اور احمقانہ طریقہ سے وہ خود سامراج کی مدد کر رہے ہیں اور پھر طعنہ ہمکو دیتے ہیں کہ تم سامراج کے حامی ہو، حالانکہ ہم سامراج کے حامی نہیں بلکہ شدید ترین دشمن ہیں۔ مگر ایسے احمق دشمن نہیں کہ پرائے شگون کیلئے اپنی ناک کاٹنے پر آمادہ ہو جائیں۔

مقالات

متاع کارواں

از "ساربان"

(۲)

اب لشکر آزادی کے سالار دوم (Second in Command) پنڈت جواہر لال نہرو کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔ اس سے پہلے آپ رسم الخط کے متعلق صاحب موصوف کی گراں قدر رائے پڑھ چکے ہیں۔ ان الفاظ کو پھر ایک مرتبہ دیکھ لیجیے اور اسکے بعد "میری کہانی" جلد دوم کا صفحہ ۴۰۰ کھولکر دیکھیے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ

"فارسی اور دیوناگری کے جھگڑے احمقانہ ہیں"

دوسرے الفاظ میں آپکے نزدیک یہ فعل سراسر حماقت ہے کہ کوئی جماعت اپنی زبان کے اُس رسم الخط کی اہمیت پر زور دے جسکے بدل جانیسے خود پنڈت جی ہی کے الفاظ میں یہ اندیشہ ہے کہ "الفاظ کی شکلیں بدل جائینگی، آوازیں بدل جائینگی، خیالات بدل جائیں گے، قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جائیگی اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بنکر رہ جائیگا جو مردہ ہو چکی ہے"

رسم الخط جسکی اہمیت اتنی زیادہ تھی، اب اسکو اتنا غیر اہم قرار دینے کی کوشش کس لیئے ہے؟ اسکی وجہ خود پنڈت جی بیان فرماتے ہیں :۔

"ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ایک متحد قوم پیدا ہو۔" ("جامعہ" مورخہ اکتوبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۹۱)

اس بنا پر جو لوگ اپنی زبان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ "فرقہ پرست" ہیں۔

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے، اور اس بنا پر زبان میں علحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ برابر اپنا اثر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ یہ علحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی۔ ...... ایک علحدگی پسند حامی زبان کو اوپر سے کھرچو اور تم دیکھو گے کہ اندر سے وہ فرقہ پرست ہے، بلکہ زیادہ تر تم اسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے" (یہ پنڈت جی کا ایک تازہ مضمون ہے جو ہندوستان کے اکثر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے)

ان تصریحات سے آپ پنڈت جی کا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو ایک قابلِ نفرت "فرقہ دارانہ مسئلہ" قرار دینا اور "سیاسی رجعت پسندی" سے موسوم کر کے اسکو اور زیادہ ذلیل بنانے کی کوشش کرنا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ پنڈت جی زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ نہیں۔ بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، وہ اسکی اہمیت سے خوب واقف ہیں، اور اسی واقفیت کی بنا پر وہ اسکے خلاف اپنی مخصوص سیاسی زبان کے شدید ترین الفاظ "فرقہ پرستی" "رجعت پسندی" "سامراج پرستی" وغیرہ ــــ پورے زور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تاکہ اس گولہ باری سے یہ قلعہ کسی طرح منہدم ہو جائے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی ایک مخصوص قومی زبان کا محفوظ رہنا در اصل انکی مخصوص قومیت کے محفوظ رہنے کا ہم معنی ہے۔ جب تک یہ زبان ایک علحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اسمیں وہ الفاظ اور اسالیب بیان موجود ہیں جو اسلامی ذہنیت

کی ترجمانی کرتے ہیں، اسوقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور انکی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہوسکتی، اور نہ وہ اس لٹریچر سے بیگانہ ہوسکتے ہیں جو انکے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدر و قیمت پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بیخبری نہیں بلکہ کامل باخبری ہی انکو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں "علحدگی پسندی" کے رجحان کو "فرقہ پرستی" جیسے گھناؤنے القاب سے یاد کرکے آزادی پسند مسلمانوں میں اسکے خلاف نفرت پیدا کریں۔ اس لئے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا اور جداجدا قومیتوں کو فنا کردینا ہے۔ انکے نزدیک "سیاسی رجعت پسندی" یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور "سیاسی ترقی پسندی" یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس "ایک قوم" میں جذب ہوجائیں جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کیلئے منجملہ دوسری تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک "مشترک قومی زبان" پیدا کی جائے، اور ہر ایسی زبان کو مٹادینے یا کم از کم مسخ کردینے کی کوشش کی جائے جو کسی قوم کی جداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہے۔

یہی نصب العین ہے جسکو پیش نظر رکھ کر "ہندوستانی زبان" کا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ آخری منزل مقصود پنڈت جی کے نزدیک بھی یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں "علحدگی پسندی" کے رجحان کو مٹادیا جائے لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ۔ دفعتہً رسم الخط پر ہاتھ ڈالوگے تو شکار ہاتھ سے نکل جائیگا۔ لہذا سردست اس کی حفاظت کا اطمینان دلادو، اور پہلے الفاظ و اسالیب بیان میں "علحدگی پسندی" کا رجحان دور کرنے کی کوشش کرو۔ جب اردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی ہوکر ہندی الفاظ سے بھرپور ہوجائیگی، جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیب بیان اور خود حقیقت بیان میں تغیر پیدا ہوجائیگا

تو سمجھو کہ آدھا معرکہ سر ہو گیا۔ اس کے بعد دیکھیں گے مستقبل نے اگر کوئی مناسب موقع فراہم کر دیا تو رسم الخط میں بھی "علٰحدگی پسندی" کا رجحان مٹا دیا جائیگا، اور "مشترک قومی زبان" کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیگی — ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ پالیسی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں :-

"اس لیئے دانشمندی کیا تھا ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں (رسم الخطوں) کو پوری آزادی حاصل رہے۔ اگرچہ یہ ان لوگوں پر ایک مزید بار ہوگا جنہیں دونوں کو سیکھنا پڑے گا۔ اور یہ ایک حد تک علٰحدگی پسندی کے لیئے بھی مددگار رہوگا۔ مگر ہمیں اپنی نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ہمارے لیئے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ..... مستقبل ہمارے لیئے کیا کچھ لائیگا۔ اس کی مجھے خبر نہیں، مگر سردست دونوں کو باقی رہنا چاہیئے"۔ (پنڈت جی کا مذکورۂ بالا مضمون)

"میں اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اردو دونوں ایک دوسرے کے قریب آکر رہیں گی — خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں، مگر اپنے جوہر اور روح کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوگی۔ جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ افراد ان کی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ یہاں قوم پرستی ہے اور ایک ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی کی فتح ہو کر رہے گی.... اگرچہ ہم خوشی کے ساتھ اس علٰحدگی کو برداشت کرینگے جو اس وقت قائم ہے، اگر ہم کو وحدت قائم کرنے والے اس عمل میں مدد دینی چاہیئے"۔ (مضمون مذکور)

یہاں آکر پنڈت جواہر لال اور مہاتما گاندھی کے راستے مل جاتے ہیں۔ اگرچہ پنڈت جی علٰحدگی کے رجحان کو سخت قابلِ نفرت سمجھتے ہیں، اور مہاتما جی کے طرزِ عمل میں علٰحدگی پسندی کا یہ رجحان بالکل

نمایاں ہے، اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہیے تھا بلکہ انہیں "فرقہ پرست" اور "سیاسی رجعت پسند" کہنا چاہیے تھا، مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے، اور دونوں ایک ہی منزل مقصود کی طرف دو علٰحدہ راستوں سے چل کر ایک مقام پر ملجاتے ہیں اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو ٹھکرا چینے کی ضرورت نہیں سمجھتا، بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مسلم سبھا لوگ خود گاندھی جی کو اس چیز کا مجرم ٹھیراتے ہیں جسکے خلاف انہوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے۔" (ہمارا عقیدہ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۹۰۳)۔

کھلی ہوئی "فرقہ پرستی" کے مقابلہ میں "قوم پرستی" زیادہ کامیاب چیز ہے۔ آپ علانیہ پرندوں کے سامنے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسیگا۔ دام ہم رنگ زمین ہونا چاہیئے، دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیئے، اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو آپکی مدد پر ہونا چاہیئے تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے، پھر دیکھیے کہ پرندوں کے رب النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئینگے۔ ہندوستان کی مشترک فلاح و بہبود کا نام لیکر "قومیت" کا جال بچھا دیجیے۔ اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوشحالی کا دانہ پھیلا دیجیے۔ اور ایک نقیب چھوڑ دیجیے جو اطراف و نواح میں اعلان کرتا پھرے کہ جو پرندہ اس جال کی طرف نہ آئیگا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائیگا۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائے کہ ہمارے سامنے اس وقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کے افلاس اور بیروزگاری کا ہے اور یہ دانہ جو بکھرا ہوا ہے (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجیے) اسی سوال کو حل کرنے کیلیے بکھیرا گیا ہے۔ اسکے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپکی طرف آئینگے اور اس طرح آپ کے جال پر گرینگے جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔

مشترک ہندوستانی قومیت کی تخلیق کیلیے اردو کو ہندی کیساتھ ملانیکی جو تحریک زور شور کیساتھ پھیلائی جا رہی ہے اس کا اثر یہ ہے کہ اردو برابر ہندی کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے، اردو تحریر و

میں روز بروز ہندی الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے، اور ہمارے علمائے کرام تک عربی و فارسی کے الفاظ کو نکال کر ہندی الفاظ اردو میں استعمال کرنے کی نہ صرف حمایت بلکہ تاکید فرما رہے ہیں، مگر ہندی ادب میں اردو کی طرف قدم بڑھانے کا ادنیٰ میلان تک نہیں پایا جاتا۔ اس کی بہترین شہادت سندر لال جی الہ آبادی کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو گاندھی جی کے نام لکھا تھا وہ فرماتے ہیں:-

"اردو رسالوں میں ودوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیئے۔ ایک مسلم اردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ ودوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ "میں حجازی اردو سے اپنے رسالے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا"! اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے میں نے اردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنہیں اگر آپ جوں کا توں ناگری حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا۔۔۔۔ آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سندر ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سن کر اردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ دونوں سمجھتے تھے لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہے وہ

وہ چیز نہیں ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی جیسے ودوان جنہوں نے اپنی یوم النبی کی چھپی ہوئی تقریر میں بجائے حضرت محمدؐ کے سوامی محمدؐ لکھا ہے برسوں سے زوروں کے ساتھ کھلے طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اردو کو سہل ہندوستانی بنانا چاہیئے بلکہ اردو کی جگہ اسے ہندوستانی کہنا چاہیئے۔" (رسالہ "جامعہ" مورخہ اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۵۸۶ - ۵۸۷)

یہ اقتباس کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔ اس کو پڑھ کر وہ تصویر خود بخود آپ کے سامنے مکمل ہو جاتی ہے جسے میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف "قوم پرست" اس ملک کی آبادی کو "ایک قوم" بنانے کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں، اور دوسری طرف ہمارے نیک دل بھائی ابھی تک اسی بھول بھلیاں میں چکر لگا رہے ہیں کہ اردو کو اپنے "طاقتور دلائل" اور اپنے عمل سے ہندوستان کی مشترک زبان ثابت کر دیں۔ یہ حضرات اردو کی تاریخ پر عالمانہ مقالات لکھ رہے ہیں حالانکہ "قوم پرستوں" کو ان مقالات میں صرف ایک ہی کام کی بات ملتی ہے، یعنی یہ کہ اردو کوئی الگ زبان نہیں ہے بلکہ یہی ہندی ہے جس کے مفہوم میں شبلی اور شام سندر داس دونوں کی تحریریں آجاتی ہیں۔ یہ حضرات آدھے رستے پر ملنے (Meeting half-ways.) کا طریقہ اختیار کر کے اردو کو نیم ہندی بنانے کی کوشش کیے جا رہے ہیں، حالانکہ جن سے یہ آدھے رستے پر ملنا چاہتے ہیں وہ بجائے آگے بڑھنے کے اور پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں ـــ کہیں پیچھے ہٹنے کا مفہوم "رجعت پسندی" نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہ اصطلاح صرف مسلمانوں کیلئے وضع کی گئی ہے ـــ اور اس فکر میں ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اردو زبان عربی و فارسی سے بعید تر اور سنسکرت سے قریب تر ہوتی چلی جائے۔ یہ حضرات اردو کا نام "ہندوستانی" رکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ گویا بڑی ہی دانشمندانہ چال چل گئے ہیں، جس کے بعد اردو المعروف بہ ہندوستانی کو ہندوستان کی "قومی زبان" تسلیم کر لیا جائیگا، حالانکہ وہاں قومی زبان کا نام پہلے ہی

"ہندی اعنی ہندوستانی" تجویز ہو چکا ہے۔ اور اس کو بدلنے کیلئے وہ طاقت چاہیئے جو کانگریس کے ڈکٹیٹر یعنی "جنگ آزادی" کے سالار اکبر کو حاصل ہے ــــ غرض یہاں استدلال اور رواداری پر عمل کا بھروسہ کیا جا رہا ہے اور وہاں کام ہی دوسرا ہو رہا ہے۔

اگر آپ اس خوابِ غفلت میں مبتلا نہیں ہیں جس میں آپ سے پہلے اسپین کے مسلمان مبتلا ہو کر اپنا انجام دیکھ چکے ہیں تو کان کھول کر سن لیجیئے کہ "قوم پرست" یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ مسلمان کی جداگانہ ہستی ہندوستان میں نہ رہنے دی جائیگی، اور اس مقصد کیلیئے زبان کا بدلنا نہایت ضروری ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ اردو پر اعتراض اسکے رسم الخط کی دشواریوں کی وجہ سے ہے یا طباعت کی مشکلات اور عربی و فارسی الفاظ کی زیادتی، اور عامتہ الناس کی نافہمی کی وجہ سے ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس پر اصلی اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ رسم الخط، اپنے ذخیرۂ الفاظ اور اپنے اسالیب بیان کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر انکے اس امتیازی قومی وجود کا احساس زندہ رکھے ہوئے ہے جسے پنڈت جواہر لال نہرو "علحدگی پسندی کے رجحان" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ یہ اعتراض اگر آپ کو رفع کرنا منظور ہے تو اپنی رواداری کا ثبوت دیئے جایئے، اور اگر آپ اس کو رفع کرنا نہیں چاہتے ـــــ اور خدا کرے کہ ابھی تک آپ اس مقام پر نہ پہنچے ہوں ـــــ تو جتنے جلدی آپ ہوش میں آجائیں اتنا ہی بہتر ہے۔

مسلمان کو اسکی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے ـــــ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے بشرطیکہ خودکشی پر آمادہ نہ کردے ـــــ دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے۔ ہاتھ باندھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جا رہا ہے کہ مہاراج! ہم اردو کا نام بدلے لیتے ہیں۔ ہم اس کے رسم الخط کو بھی درست کرلیں گے۔ ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائینگے۔ آپ خود دیکھ لیجیئے کہ ہم ہندی کے الفاظ کس کثرت سے

اس زبان میں داخل کر رہے ہیں ہم آپکے ہر پرستاؤ کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سارے ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدھار کیلیے ہے۔ پرنتو آپسے کیول اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس کو زندہ رکھنے کی آگیا دیدیجیے۔ یہ روش بڑی تباہ کن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر "قوم پرستوں" پر نہیں پڑسکتا۔ انکو آپکی زبانکی "موشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جسکے تحت اسپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرۂ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کھرچ ڈالے تھے، اس لئے نہیں کہ انکو آرٹ سے دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لئے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے علحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانیکی تدبیریں کیجارہی ہیں۔ اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بین بین راستہ پیدا ہو جائیگا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بنکر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے" تو کیوں نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے، ہماری زبان رہیگی اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

داستان طویل ہوتی جارہی ہے لیکن ابھی ایک عنوان اور بھی ہے جسے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ہم زبان کا تحفظ چاہتے کس لئے ہیں؟ زبان بذاتِ خود تو کوئی اہم چیز نہیں ہے اسلیئے محض اسکا تحفظ مقصود بالذات قرار نہیں دیا جاسکتا۔ زبان کا تحفظ ہم اسلیئے چاہتے ہیں کہ اسکے ذریعہ ہمارے تمدن، ہمارے کلچر کی حفاظت ہوتی ہے۔ لیکن کیا جو کچھ آجکل عام طور پر ہماری ادبی پیداوار ہے وہ ایسی ہی ہے کہ جسے اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا آئینہ دار کہا جاسکے؟ جواب

ظاہر ہے! ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک جماعت تو ایسی ہے جس نے اپنی تمام مساعی کو اس بات کیلیے وقف کر رکھا ہے کہ مذہب اور شعائر ملت کے خلاف "جہادِ عظیم" کیا جائے۔ اول تو کالجوں کی تعلیم ہی اس نہج کی رکھی گئی ہے کہ بی۔ اے کرنے تک دماغ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو جاتا ہے۔ اس پر آزادئ ہند کے قائدِ اعظم کے یہ ارشادات کہ ملک میں جسقدر مصائب موجود ہیں۔ ان سب کا ذمہ دار مذہب ہے، نوجوانوں کو مذہب کی مخالفت، نہیں بلکہ تضحیک و تمسخر کے لیے بالکل مسلح کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اشتراکیت کی ایک خیالی جنت کے نشہ میں اسدرجہ مدہوش و بیباک ہو جاتے ہیں کہ سوقیانہ استہزا اور بازاری تمسخر انکے نزدیک عین معیارِ شرافت قرار پا جاتا ہے۔ اس پر کسی نیتا کسی جوش کی شاباش سمندِ ناز پر تازیانہ کا کام کرتی ہے، اور اس بدمستی میں، بقول یلدرم ان کے منہ سے بوئے فحش کے ایسے بھپکے نکلتے ہیں کہ نکیرین بھی پناہ مانگیں۔

ایک اور جماعت ہے جو جدید رومانیت کی علمبردار ہے۔ ہماری قدیم غزل گوئی کے خلاف ان کا وعظ سنیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتذال اور سوقیانہ پن کا لفظ تک سننے کیلیے یہ تیار نہیں ہیں۔ اس شاعری میں انہیں دنیا بھر کے عیب نظر آئینگے۔ لیکن انشا، رنگین، جرأت، جان صاحب اور مرزا شوق کو مبتذل اور فحش گو کہنے والے ذرا یہ تو دیکھیں کہ جس قسم کی عریاں فحاشی ان کے افسانوں اور (Sonates.) میں آجکل ملتی ہے، ان بچاروں کے تصور میں بھی اس قسم کے نقشے نہ آسکتے تھے۔ وہ تو پھر ایک فرضی معشوق کی چوٹی کو ہی نمایاں کرتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ سچ مچ عشق بازی کی جاتی ہے اور نام لے لے کر واردات قلب کے مرقع تیار کیے جاتے ہیں۔ جن سے اور کچھ نہیں تو ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کوشی کی لذت تو فرور مل جاتی ہے یہ سب کچھ اس مغربی معاشرت کا نتیجہ ہے جو غیر محسوس طور پر ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ پر چھا گئی ہے اور جسکے ماتحت حیا سوز سفلی جذبات کے اظہار کا نام رومانیت رکھا جاتا ہے۔ اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ اس رومانیت سے یورپ کی اخلاقی

زندگی پر کیا اثر پڑا ہے تو ایک اطالوی مصنف کی کتاب (The Romantic Aqony.) ملاحظہ فرمائیے پھر یہ بھی دیکھیے کہ اس قسم کی افسانہ نگاری اور شاعری کا اخلاق کے علاوہ نوجوانوں کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ایسے نوجوان کا دماغ شروع سے ہی حقائق کی دنیا میں رہنے کے بجائے ایک افسانوی دنیا کے تصورات و تخیلات میں محو رہتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب دنیا کی حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے تو انکو اپنے افسانوی معیار پر پورا اُترتے نہیں دیکھتا۔ اس لیے وہ ان چیزوں سے بیزار ہو جاتا ہے یاس و قنوطیت کا المناک حلقہ اس کے تمام اعمال و افکار پر چھا جاتا ہے اور وہی نوجوان جس کی قوتِ عمل سے قوم کو زندہ ہونا تھا، خود ایک چلتا پھرتا جنازہ بن کے رہ جاتا ہے۔

ایک تیسری جماعت اور ہے اور وہ (Art for art's Sake.) (آرٹ محض آرٹ کی خاطر) کا قائل ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور جملے ایسے مہمل گورکھ دھندے ہیں جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوتے بے معنی تراکیب، بے مطلب فقرے، نثر منظوم، نظم منثور، ٹیگوری رنگ میں مجذوبوں کی سی بڑیں۔ نہ جنکا سر نہ پاؤں۔ یا تو یہ لوگ عمداً دوسروں کو بناتے ہیں یا خود بنتے ہیں۔ غالب کے تتبع میں غزلیں کہی جاتی ہیں جن میں شوکتِ الفاظ اور ندرتِ ترکیبات کے زور پر سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عصمتِ ناہید و کوثر تو بہارِ نغمہ ہے — شعلۂ جوالہ ہے۔ اعتبارِ نغمہ ہے
بوئے رنگیں عنبر افشاں۔ مرمریں رنگِ شباب — کیفِ صہبائے تمنا۔ جوئبارِ نغمہ ہے

یا مثلاً نثر میں پیازی اردو کہ چھلکے پر چھلکا اتارتے جائیے۔ اندر سے کچھ بھی نہ نکلے۔ "ریحانہ، نور و سرور کی داستانِ شیریں، مجسم افسردۂ یاسمین کا بلوریں مجسمہ، گویا قدرت کا ایک حسین خواب تھا جو رشید کی نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی سنہری راتوں میں بہارِ صد گلستاں بداماں، کیف زا

نوائے رنگین پیدا کرتی تھی"۔

آرٹ سے مقصود کیا ہے۔ اس کے متعلق دورِ حاضر کے سب سے بڑے باریک بین مفکر علامہ اقبال کی رائے قابلِ غور ہے۔ انہوں نے رسالہ نیو ایرا میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"حیات تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے۔ انسانی اعمال کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسکی زندگی شاندار، موثر اور افزوں ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصد عظمیٰ کے ماتحت رکھا جائے اور جو شے زندگی کو جس قدر فراوانی عطا کرے اُسی قدر اعلیٰ و اشرف خیال کی جائے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفتہ قوتِ ارادی کو بیدار کر دے، تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں۔ جو ہمیں گردو پیش کے ان حقایق سے غافل کر دیں جنکی معرفت ہی پر زندگی کا انحصار ہے، وہ دراصل بربادی و موت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونک دے، نہ کہ وہ جو ہم پر حالتِ سکر طاری کر دے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے، وہ نادانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے اور ہماری زندگی اور توانائی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لہذا از بس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں"۔

اسی نظریہ کو وہ ضربِ کلیم میں ان اشعار میں بیان فرماتے ہیں:۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

اقبال کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ وہ خود ایک پیغام برؐ ہے اور اسکی شاعری یکسر پیامی ہے اسلیئے اس نے آرٹ کی یہ تعریف کی ہے لیکن یہ تعریف صرف اقبال ہی کے ہاں نہیں تھی، بلکہ معترضین کے "سندیافتگانِ سخن" یعنی شعرائے مغرب بھی یہی کچھ کہتے ہیں۔ ورڈز ورتھ کی شاعری کا مطمحِ نگاہ کسے معلوم نہیں۔ اسکا دوست کالرج (Biographia Literaria) میں لکھتا ہے کہ "کوئی شخص آج تک ایسا نہیں گذرا جو بہت بڑا شاعر ہوا لیکن اسکے ساتھ ایک مفکرِ اعظم بھی نہ ہوا" میتھو آرنلڈ لکھتا ہے کہ "ایک شاعر کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیالات کا انطباق مسائلِ حیات سے کس طرح کرتا ہے اور اس سوال کا حل کیا پیش کرتا ہے کہ زندگی کیسے بسر کی جائے"۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاعر جب پیغامبر یا مصلح ہو جاتا ہے تو اسکی شاعری میں فنی لطافتیں ادبی نفاستیں، حسنِ ترنم، اور طرفگی اندازِ بیان باقی نہیں رہتا۔ اول تو یہ کلیہ غلط ہے۔ ہمارے سامنے دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر اقبال موجود ہے۔ جو درحقیقت ایک بالغ نظر مفکر، اور بلند پایہ پیغامبرؐ لیکن بایں ہمہ اُسکے کلام میں ادبی لطافتیں اس حسن و خوبی سے موجود ہیں کہ باید و شاید۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کلام کے پیامی ہونے سے اس میں ادبی خوبیاں کم ہو جاتی ہیں تو یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی قیمت بہت زیادہ وصول ہو جاتی ہے۔ آرٹ کے متعلق جب نظریہ صحیح ہو جائے تو پھر دیکھیے کہ کونسا ادب اور کونسی شاعری آپکو حیات بخش نظر آتی ہے اور کونسی محض تفننِ طبع اور کونسی غارتگرِ حیات؟ اسی نظریہ کا فرق ہے کہ ایک طرف حقائق کی جستجو کرنے والوں نے اقبال کے کلام سے نئی زندگیوں کی تعمیر کر لی، اور دوسری طرف آگرہ اور لکھنؤ ہنوز اسی الجھن میں گرفتار ہیں کہ اس نے

ؐ پیغمبر کے مفہوم سے جدا کرنے کیلئے یہ طریقِ املا اختیار کیا گیا ہے۔

بلبل کو مذکر باندھا ہے یا مونث، اور نہ معلوم ابھی کب تک اس تحقیق عظیم کا سلسلہ جاری رہیگا کہ بلبل فی الواقع مونث ہے یا مذکر؟

مقصد اس طویل داستان سے یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپکو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی تو اسلامی ہونا چاہیئے۔ بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع ایک عظیم الشان خطرہ کا سامنا ہے یہ وقت وہ ہے کہ جو کچھ جسکے بس میں ہو اس متاعِ گرانمایہ کی حفاظت کیلیے کر گذرے۔ یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ طریق کار خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہماری تمام جدوجہد کا رُخ اسی ایک نصب العین کی طرف ہونا چاہیئے۔ ادیب اپنے ادب سے، شاعر اپنے شعر سے، افسانہ نگار اپنے افسانوں سے، رسائل اپنے صفحات سے، خریدار اپنے ذوق ادب و شعر سے، غرض ہر مسلمان اپنے اپنے دائرۂ امکان میں اپنی ہر کوشش اسی مقصد کے حصول میں صرف کردے۔ ہمارے رسائل میں "مذہبی" اور "ادبی" کی تفریق دراصل اُس تفریق پر مبنی ہے جو کلیسا اور سلطنت کی تفریق سے پیدا ہوتی ہے، اور جو یکسر غیر اسلامی تفریق ہے۔ ہمارے ہر پرچہ کو اسلامی ہونا چاہیئے، اور اس کی ادبی و صحافتی خدمات اسی عنوان کی تفسیرات ہونی چاہئیں۔ ادب پسند حضرات کو بھی اس تبدیلی نصب العین سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیئے کیونکہ "اسلامیات" اور "مولویات" میں درحقیقت بہت نمایاں فرق ہے۔ لیکن آج کل تو ہمارے ہاں یہ حال ہو رہا ہے کہ کوئی پرچہ جو اپنی پیشانی پر "علمی و ادبی مجلہ" کا عنوان لکھ لیتا ہے۔ اسلام اور مسلم کا لفظ بھی اسکے اندر لکھنا کفر سمجھتا ہے۔ میں ادب و شعر کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ادب و شعر ہماری عمارتِ ملی کی جڑ نہیں ہیں، محض تزئین و آرائش کی چیزیں ہیں جب کسی عمارت کی بنیادیں ہی خطرہ میں ہوں تو کوئی صاحبِ دانش و بینش اس وقت اپنی کوششیں

اسکی تحسین و تزئین میں صرف نہیں کرتا بلکہ سب سے مقدم کام خود عمارت کے استحکام کو سمجھتا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ جب ہم اس تبدیلی کا اعلان کرینگے تو اطراف و جوانب سے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی۔ لیکن بقول مولانا حالی مرحوم "لغریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے"

آپنے دیکھ لیا کہ اس "تحریک آزادی" میں آپکے لئے کیسی کیسی خوبصورت "زنجیریں" تیار ہوئی ہیں۔ اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ زنجیریں کیا کرینگی، تو ہندوستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے یہاں یونانی آئے، پارتھین آئے، ہن آئے، اور متعدد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں۔ لیکن آج ذرا چراغ لیکر ڈھونڈو تو سہی کہ ان قوموں کا کہیں سراغ بھی مل رہا ہے؟ یہ کہیں باہر تو واپس چلی نہیں گئیں۔ پھر آخر کیا ہوئیں؟ کیوں نظر نہیں آتیں؟ اسکا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ انہوں نے خود فراموشی کا جرم کیا تھا۔ اسلئے فنا ہوگئیں۔ جب یہ ہندوستان آئی تھیں تو اپنی الگ زبان، الگ تہذیب، الگ تمدن، الگ مذہب رکھتی تھیں۔ مگر انہوں نے اپنے امتیازی وجود کی حفاظت نہ کی، اپنے آپکو اس ملک کی عام آبادی میں محو کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں انکا نام و نشان تک باقی نہیں ہے صرف افسانے رہ گئے۔ اب کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپکے بجائے صرف آپکے افسانے باقی رہجائیں؟

ہوسکتا ہے کہ ہم اس آنے والے سیلاب کا پوری طرح مقابلہ نہ کرسکیں "لیکن جب اس کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے ہاتھ شل ہو جائینگے، ہمارے بازوؤں میں قوت نہ رہیگی، جب ہمیں موجوں کے تھپیڑے بالکل نیم مردہ کرکے ساحل کی ریت پر پھینکدیں گے تو آخری وقت میں کم از کم اتنا اطمینان تو ضرور ہوگا کہ بزدلی کی زندگی جینے سے یہ مردانگی کی موت ہزار درجہ بہتر ہے"

دَارُ الاِسلام

(اسی اشاعت میں صفحۂ اول پر یہ اعلان ناظرین کے ملاحظہ سے گذر چکا ہے کہ دفتر ترجمان القرآن ماہ ذی القعدہ میں "دار الاسلام" کیطرف منتقل ہو رہا ہے۔ اسکو دیکھ کر فطرۃً آپ کے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ یہ دار الاسلام کیا چیز ہے؟ ذیل کا مضمون اسی سوال کا جواب ہے)

مقام پنجاب کے ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس سے چند ہی میل کے فاصلہ پر کوہستان ہمالیہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور اسکے قریب ہی وہ مقام واقع ہے جہاں سے دریائے راوی پہاڑوں کی آغوش سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقہ میں آتا ہے۔ مناظر کے لحاظ سے یہ علاقہ بہت فرحت بخش ہے آب و ہوا اچھی ہے، زمین زرخیز ہے، پانی کی افراط ہے، قدرت نے میلوں تک جنگلوں کو باغ بنا رکھا ہے۔

اسی علاقہ میں پٹھانکوٹ سے چار میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں جمال پور واقع ہے جہاں چند بندگان خدا نے "دار الاسلام" کی بنا رکھنے کا ارادہ کیا ہے اس غرض کیلئے ساٹھ ۶۰ ستر ۷۰ ایکڑ زمین حاصل کر لی گئی ہے جو راہ خدا میں وقف ہے ایک مسجد، ایک کتب خانہ کی عمارت، ایک دار الاقامہ (جو بیس ۲۰ پچیس ۲۵ آدمیوں کیلئے کافی ہو سکتا ہے) اور دو مکان تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ سر دست کام کی ابتدا کرنے کے لئے اتنی عمارتیں کافی ہیں۔ زمین وقف میں اتنی گنجایش ہے کہ آئندہ جیسی ضرورتیں پیش آئیں اسکے مطابق جدید عمارتیں بنالی جائیں۔ نیز اطراف واکناف میں پھیلنے کیلیے بھی بہت کافی جگہ موجود ہے اور وقف کی زمین اتنی زرخیز و شاداب ہے کہ اگر اسے صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے۔ تو پانچ چھ ہزار روپیہ سالانہ آمدنی دے سکتی ہے۔ یہ اُن ابتدائی کاموں کیلئے کافی ہے جو پیش

نظر ہیں شہری آبادیوں سے یہ جگہ دور بھی ہے اور یہاں وہ آسانیاں بھی ہم پہونچ سکتی ہیں جو شہری زندگی کیلئے درکار ہیں۔ ریلوے اسٹیشن سرنا (جو امرتسر پٹھانکوٹ لائن پر واقع ہے) یہاں سے صرف دس منٹ کی مسافت پر ہے۔ قریب ہی سے برق آبی (ہائیڈرو الکٹرک سسٹم) کا سلسلہ گذرا ہے جس سے ضرورت کے وقت نہایت سستی بجلی حاصل کیجا سکتی ہے۔ دوسری طرف ایک بہت بڑی نہر (جس میں پورا دریائے راوی منتقل کر دیا گیا ہے) زمین وقف سے متصل ہو کر ہی گذری ہے اور یہ پانی حاصل کرنیکا ایسا ذریعہ ہے جو تمام ضروریات کیلئے کافی ہو سکتا ہے غرض یہاں ترقی کے امکانات غیر محدود ہیں، اور اس کے ساتھ یہ مقام شہری آبادیوں سے اتنی دور ہے کہ ہمکو ایک آزاد ماحول بیسر آسکتا ہے جس میں ہم اپنی دنیا الگ بنا سکتے ہیں۔

مقصد اس الگ تھلگ، با ہمہ و بے ہمہ مقام پر جس تخیل کو ہم عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں اسکے لیے "دارالاسلام" کے سوا اور کوئی نام جامع و مانع نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ایک نام ہے جو اسکے تمام حدود پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اصطلاح فقہی سے قطع نظر کر لیجیے کر اسکے لحاظ سے تو دارالاسلام صرف اس جگہ کو کہینگے جہاں اسلامی حکومت ہو اور اسلامی قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے پوری طرح نافذ ہو۔ بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسی کوئی جگہ تو ہم کو میسر نہیں آسکتی۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت جیسے کچھ حالات بھی ہندوستان کے ہیں، انہی میں کم از کم زمین کا ایک گوشہ ایسا بہم پہونچایا جائے جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جا سکے۔ جہاں اخلاق اسلامی ہوں، معاشرت اسلامی ہو، عملی زندگی مسلمانوں کی سی ہو، گرد و پیش ہر طرف اسلام اپنی روح اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو۔ جہاں کسی چیز کے صحیح ہونیکے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسول نے اس کا حکم دیا ہے یا اسکی اجازت دی ہے، اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس دلیل سے تسلیم کیا جائے کہ خدا اور اسکے رسول نے اس سے منع کیا ہے یا اسکو ناپسند کیا ہے۔ جہاں یہ بغاوت اور سرکشی کا ماحول،

یہ غیر اسلامی فضا نہ ہو جس نے سارے ہندوستان کا احاطہ کر لیا ہے۔ جہاں ہمکو کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی دنیا کے جن اثرات کو ہم روح اسلامی کے موافق پائیں صرف انہی کو داخل ہونے دیں اور جنکو منافی پائیں انکو اپنی زندگی پر مسلط ہونے اور اپنے دل و دماغ میں نفوذ کرنے سے روک سکیں۔ سیاسی اقتدار کے بغیر محض اجتماعی کوشش سے جس حد تک بھی اسلامی ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اسے پیدا کریں اور ایسے ماحول میں رہکر مسلمان کی طرح سوچیں، مسلمان کی نظر سے دیکھیں، مسلمانوں کی سی صفات اپنے اندر پیدا کریں، اپنی زندگی کو مسلمانکی زندگی بنائیں اور اپنے اندر سے ان گندگیوں اور آلائشوں کو نکالیں جو غیر اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور نشو و نما پانیکی وجہ سے ہمارے افکار و اعمال میں گھس گئی ہیں، جنکا شعور تک بھی بسا اوقات ہمکو نہیں ہوتا اور جنکو اگر ہم محسوس بھی کر لیتے ہیں تو ماحول کی طاقت اتنی جابر و قاہر ثابت ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کرنیکے ہم اپنے آپکو اور اپنے متعلقین کو ان سے نہیں بچا سکتے۔ اس قسم کی اخلاقی تربیت سے جو قوت ہمارے اندر پیدا ہو ہم چاہتے ہیں کہ اسے اس نصب العین کی خدمت میں صرف کریں جو مسلمانکی زندگی کا واحد نصب العین ہے، یعنی یہ کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اسکے مقابلے میں سب کلمے دب جائیں۔ اسکے معنی بس اتنے ہی نہیں ہیں کہ محض تبلیغ اسلام کیجائے جسطرح عیسائی مشنری مسیحیت کی تبلیغ کرتے ہیں بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ اس نظام زندگی کو عملاً نافذ کر کے بتایا جائے جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ ان اصولوں کو واقعات کی دنیا میں برت کر دکھایا جائے جنکی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ آج اس بیسوی صدی میں ہندوستان کے اندر ہمارے سامنے زندگی کے جو مسائل درپیش ہیں انہیں علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اصول اسلام کے مطابق حل کیا جائے اور تیرہ سو برس کے اسلام کو اس جدید دور دنیا میں کام کرتے ہوئے دکھایا جائے تاکہ مسلمان اور غیر مسلم سب اسکو اس کی اصلی صورت میں ایک زندہ، متحرک، کارکن، کارفرما اور پیش رو طاقت کی حیثیت سے دیکھیں، اور اسکا بہترین نظام زندگی ہونا ہمارے زبانی ادعا سے نہیں بلکہ دماغوں کو مطمئن کرنے والے عملی

استدلال اور آنکھوں کو نظر آنے والے عملی نظاہرے سے ثابت ہو جائے۔

ضرورت | اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے، نہ وہ محض چند مذہبی" اعمال کا مجموعہ ہے بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کیلئے ایک مفصل اسکیم ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ سب مل کر ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ بناتے ہیں، جسکے اجزاء کا ربط بالکل ایسا ہی ہے، جیسا ایک زندہ جسم کے اعضاء میں ہوتا ہے۔ آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں، آنکھیں اور کان اور زبان جدا کر دیں، معدہ اور جگر نکال دیں، پھیپھڑے اور گردے الگ کر دیں، دماغ بھی پورا پاکم و بیش کاسۂ سر سے خارج کر دیں، اور بس ایک دل اس کے سینے میں رہنے دیں۔ کیا یہ باقی ماندہ حصۂ جسم زندہ رہ سکیگا؟ اور اگر زندہ بھی رہے تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا؟ ایسا ہی حال اسلام کا بھی ہے۔ عقائد اس کا قلب ہیں۔ وہ طریق فکر، نظریۂ حیات، مقصدِ زندگی اور معیارِ قدر، جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے، اس کا دماغ ہے۔ عبادات اس کے جوارح اور قوائم ہیں جن کے بل پر وہ کھڑا ہوتا ہے اور کام کرتا ہے۔ معیشت، معاشرت، سیاست اور نظم اجتماعی کے دوسرے اصول جو اسلامی زندگی کے لیے اس نے پیش کیے ہیں وہ اس کے لیے معدے اور جگر اور دوسرے اعضائے رئیسہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اسکو صحیح و سالم آنکھوں اور بے عیب کانوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمانے کے احوال و ظروف کی ٹھیک ٹھیک رپورٹیں دماغ تک پہنچائیں اور دماغ ان کے متعلق صحیح حکم لگائے۔ اس کو اپنے قابو کی زبان درکار ہے تاکہ وہ اپنی خودی کا کماحقہٗ اظہار کرے، اس کو پاک صاف فضا کی حاجت ہے جس میں وہ سانس لے سکے۔ اس کو طیب و طاہر غذا مطلوب ہے، جو اس کے معدے سے مناسبت رکھتی ہو اور اچھا خون بنا سکے۔ اس پورے نظام میں اگرچہ قلب بہت اہمیت رکھتا ہے، مگر اسکی اہمیت اسی لیئے تو ہے کہ وہ تمام اعضاء و جوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے۔ جب اکثر و بیشتر اعضاء کٹ جائیں

جسم سے خارج کر دیئے جائیں یا خراب ہو جائیں تو اکیلا قلب تھوڑے بہت بچے کھچے خستہ و بیمار اعضاء کیساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے؛ اور اگر زندہ بھی رہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

اب آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ اپنی اسی ہندوستان کی دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔ قوانین اسلامی قریب قریب معطل ہیں۔ اخلاق میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصولِ اسلامی کا نفاذ پانچ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے؛ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کچھ کم و بیش غیر مسلم بنا دیا ہے؛ آنکھیں دیکھتی ہیں مگر ان کا زاویۂ نظر بدل گیا ہے، کان سنتے ہیں مگر انکے پردے متغیر ہو چکے ہیں، زبان بولتی ہے مگر اسکی گویائی میں فرق آگیا ہے، پھیپھڑوں کو صاف ہوا میسر نہیں کہ ایک زہریلی فضا چاروں طرف محیط ہے۔ معدے کو پاک غذا نہیں ملتی کہ رزق کے خزانے مسموم ہو چکے ہیں۔ عبادات جو اس جسم کے جوارح اور قوائم ہیں قریب قریب ۶۰ فی صدی تو مفلوج ہیں اور چالیس فیصدی جو باقی ہیں وہ بھی کوئی اثر نہیں دکھا رہے ہیں۔ کیونکہ دوسرے اعضاء رئیسہ سے انکا تعلق باقی نہیں رہا۔ اسی لئے فالج کا مادہ ان میں پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پورا اسلام ہے جو آپکے سامنے ہے؟ کتنے ہی اعضاء کٹ گئے۔ کتنے مفلوج ہو گئے۔ کتنے موجود ہیں مگر بیمار ہیں اور ٹھیک کام نہیں کر رہے ہیں۔ انکے ساتھ ایک قلب باقی ہے اور وہ خود بیمار ہو رہا ہے کیونکہ جسطرح وہ ان اعضاء کو زندگی کی طاقت بخشتا تھا اسیطرح خود بھی تو انسے طاقت حاصل کرتا تھا۔ جب دماغ اور پھیپھڑوں اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہو گیا تو قلب کیسے صحیح و سالم رہ سکتا ہے؟ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے مگر کیا اس اعضاء بریدہ اسلام میں کوئی کشش ہو سکتی ہے کہ یہ اپنی طرف لوگوں کو کھینچے؟ کیا اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندوستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کر سکے؟ بلکہ خاکم بدہن میں تو یہ پوچھوں گا کہ اس

نوبت پہنچ کیا یہ ان حوادث کے مقابلہ میں جنکا سیلاب روز افزوں تیزی کیساتھ آرہا ہے اپنے بقیہ اعضاء کو مزید قطع و برید سے اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے؟

اسی کا نتیجہ ہے کہ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کے برعکس اب خود مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں اور اسکے اطراف و اکناف میں کہیں بھی نظام اسلامی اپنی پوری مشینری کیساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ لوگ اسکے جمال و کمال کو دیکھیں اور درخت کو اسکے پھلوں سے پہچانیں۔ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ یہی اعضاء بریدہ اسلام ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ بس اسلام یہی ہے۔ اسکو دیکھ کر بعض تو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو مسلمان ہونے سے بس انکار نہیں کرتے باقی تمام باتیں ایسی کرتے ہیں کہ ان میں اور منکرین اسلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بہت سوں کے دل پھر گئے ہیں مگر چونکہ ابھی صریح بغاوت برپا نہیں ہوئی ہے۔ اس لیئے وہ منافقت کیساتھ مسلمانوں میں شامل ہیں اور بغاوت کے جراثیم پھیلا رہے ہیں۔ تاکہ جب عام بلوئی شروع ہوجائے تب خود بھی اپنا جھنڈا لیکر کھڑے ہوں۔ کچھ لوگ صاف نہیں کہتے مگر دبی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ نئی قومیت اور نئی تہذیب میں جذب ہونے کیلئے تیار ہوجاؤ۔ کیونکہ یہ تن مردہ جسے تم لیئے بیٹھے ہو، نہ خود تمہیں کوئی فائدہ پہونچاتا ہے اور نہ ان فوائد ہی سے متمتع ہونے دیتا ہے جو دوسروں میں جذب ہونے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اب مسئلہ کا صحیح حل یہ ہے کہ اسلام کا باضابطہ مُثلہ کر ڈالا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل کی حد تک مسلمان رہنا چاہیئے۔ باقی زندگی کا سارا پروگرام وہی اختیار کر لینا چاہیئے جو غیر مسلموں نے سکھایا ہے اور جسکو غیر مسلم اختیار کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ خود دھوکے میں ہیں یا دھوکہ دینا چاہتے ہیں، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ تمام معاملات زندگی میں غیر اسلامی نظریات اختیار کرنے اور غیر اسلامی اصول پر عامل ہوجانیکے بعد مذہبی عقائد اور مذہبی حرکت و عمل خود ہی بے معنی

ہو جاتے ہیں۔ نہ ان پر زیادہ مدت تک ایمان باقی رہ سکتا ہے اور نہ عمل جاری رہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ عقائد اور یہ عبادات تو وہ بنیادیں ہیں جنکو اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ زندگی کی پوری عمارت ان پر تعمیر ہو۔ جب یہ عمارت دوسری بنیادوں پر تعمیر ہو گئی تو ان آثار قدیمہ سے بیفائدہ و بے ضرورت دلچسپی کب تک باقی رہ سکے گی۔ نئے نظام زندگی میں جو بچہ پرورش پاکر جوان ہوگا وہ پوچھیگا کہ چند لاحاصل عقیدوں اور چند بے نتیجہ رسموں کا یہ قلادہ کیوں میرے گلے میں ڈال رکھا ہے؟ میں کیوں اُس قرآن کو پڑھوں اور کیوں اُس پر ایمان رکھوں جسکے سارے احکام اب بیکار ہو چکے ہیں؟ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو ایک انسان گذر چکا ہے آج اس کو میں کس لئے خدا کا رسول مانوں؟ جب اس زندگی میں وہ میری رہنمائی ہی نہیں کرتا تو محض اسکی رسالت تسلیم کر لینے سے فائدہ کیا اور نہ تسلیم کرنے سے نقصان کیا؟ یہ نظام حیات جس پر میں عمل کر رہا ہوں، اس میں نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے اور روزہ رکھنے یا نہ رکھنے سے کیا فرق واقع ہوتا ہے؟ کیا ربط ہے ان اعمال اور اس زندگی کے درمیان؟ یہ بے جوڑ پیوند میری زندگی میں آخر کیوں لگا رہے ہو؟ — یہ منطقی نتیجہ ہے دین اور دنیا کی علٰحدگی کا اور جب یہ علٰحدگی اصولاً اور عملاً مکمل ہو جائیگی تو یہ نتیجہ رونما ہو کر رہیگا۔ جسطرح نظام جسمانی سے الگ ہو جانیکے بعد قلب بیکار ہو جاتا ہے، اسیطرح زندگی سے بے تعلق ہو جانیکے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عقائد اور عبادات اسلامی زندگی کو قوتِ حیات دیتے ہیں اور اسلامی زندگی عقائد اور عبادات کو طاقت بہم پہونچاتی ہے جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، ان دونوں میں ایک زندہ نظامِ جسمانی کے اعضاء کا سا تعلق ہے جسے منقطع کر دینے کا لازمی نتیجہ دونوں کی موت ہے۔ غیر اسلامی زندگی میں اسلامی عقائد اور عبادات کا پیوند بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے گوریلا کے جسم میں انسانی دماغ اور انسانی دست و پا۔

یہ نہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کی موجودہ حالت کا یہ اثر صرف نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک مختصر گروہ پر ہی

مترتب ہو رہا ہے۔ نہیں آج جو لوگ سچے دل سے مسلمان ہیں جنکے دلوں میں اس مذہب کی محبت اور عزت موجود ہے، خواہ نئے گروہ کے لوگ ہوں یا پُرانے گروہ کے، ان سب پر کم و بیش ان حالات کا اثر پڑ رہا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی کا درہم برہم ہو جانا ایک عام مصیبت ہے جسکے طبعی نتائج سے کوئی مسلمان بھی محفوظ نہیں ہے اور نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہم سب کو اسمیں سے حصہ مل رہا ہے، اور ہمارے علماء و مشائخ بھی اسمیں اتنے ہی حصہ دار ہیں۔ جتنے مدرسوں اور کالجوں سے نکلے ہوئے لوگ۔

لیکن سب سے زیادہ خطرہ میں ہمارے وہ عوام ہیں جو کروروں کی تعداد میں ۱۶ لاکھ مربع میل کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ انکے پاس صرف "اسلام" کا نام باقی ہے جس سے انکو غیر معمولی محبت ہے۔ نہ علمی حیثیت سے یہ غریب اس چیز سے واقف ہیں جس پر یہ اسطرح جان دے رہے ہیں اور نہ عملی حیثیت سے کوئی ایسا نظامِ زندگی موجود ہے جو انہیں غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رکھ سکے۔ انکی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ہر گمراہ کرنیوالا انکے عقائد کو اور ان کی زندگی کو اسلام کی صراطِ مستقیم سے ہٹا سکتا ہے۔ بس انھیں اتنا اطمینان دلا دینا کافی ہے کہ یہ ضلالت جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، یہی عین ہدایت ہے یا کم از کم اسلام کے خلاف نہیں ہے، اسکے بعد آپ جس راستے پر چاہیں انھیں بھٹکا لے جا سکتے ہیں، خواہ وہ قادیانیت کا راستہ ہو یا اشتراکیت کا۔ پھر انکے روز افزوں افلاس اور انکی ہولناک معاشی خستہ حالی نے جو مسائل پیدا کر دیئے ہیں، انکو موجود بے نظمی کی حالت میں اصول اسلام کے مطابق حل کرنیکی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں کوئی منظم جماعت ایسی موجود نہیں جو اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کے معاشی و تمدنی اصولوں کو لے کر اٹھے اور ان مسائل کو حل کر کے دکھا دے جو عام مسلمانوں کے لیئے فی الواقع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کروروں مفلس و فاقہ کش مسلمانوں کی یہ بھیڑ اشتراکی مبلغین کیلئے نہایت سہل الحصول شکار بن گئی ہے۔ یورژوا طبقہ کے جن لوگوں میں حوصلہ مندی

اور اقتدار کی حرص ذرا اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ ہمیشہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کیلئے نئی نئی تدبیریں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب روسی انقلاب نے اس طبقہ کے ایک گروہ کو ایک اور تدبیر سکھا دی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسان اور مزدور کے حامی بنکر غریب عوام کو اپنے .... ہاتھ میں لیں انکے اندر خود غرضی حرص اور حسد کی آگ بھڑکائیں، انکے جائز حقوق سے بڑھ کر انہیں دولت میں حصہ دلوانیکا لالچ دلائیں، خوشحال طبقوں کی جائز دولت تک چھین کر ان میں تقسیم کر دینے کا وعدہ کریں، اور اس طرح ملک کے سواد اعظم کو اپنی مٹھی میں لیکر وہ اقتدار حاصل کریں جو سرمایہ داری نظام کے پادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور کروڑپتیوں کو حاصل ہے۔ یہ لوگ غیر مسلم عوام سے بڑھ کر مسلم عوام سے توقعات رکھتے ہیں کیونکہ معاشی حیثیت سے مسلمان زیادہ خستہ حال ہیں۔ یہ انکے دلوں پر قبضہ کرنیکے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں "جس سے امیری اور غریبی کی تفریق مٹتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے" پھر جب بیچارا بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر انکی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں، اور یہ جذبہ اسکے دل میں پیدا کرتے ہیں کہ دین اور ایمان کوئی چیز نہیں، اصل چیز روٹی ہے، وہ جس طریقہ سے ملے وہی دین ہے اور اسی میں نجات ہے۔

"غریبوں مفلسوں اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اسکا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری تک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔"

یہ ابتدائی سبق ہے مذہبِ اشتراکیت کا اور جس آن یہ سبق بیچارے جاہل و مفلس مسلمانوں کو دیا جاتا ہے اسی آن انھیں اس امر کا اطمینان بھی دلا دیا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگرس میں اخلاقی اور روحانی طاقت ہے، زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے[1]"

گذشتہ ۲۰ سال کے اندر روسی اشتراکیت کے جو اثرات مسلمانانِ روس کی نوخیز نسلوں پر مترتب ہوئے ہیں وہ جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہی مستقبل مسلمانانِ ہند کے سامنے بھی دھمکیاں دیتا ہوا آ رہا ہے۔ پیٹ کی آگ متاعِ ایمان کو خاکستر کر دینے کیلیے بڑھ رہی ہے ابھی تک یہ سرچشمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے ایک سلائی سے بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غفلت کے چند سال یوں ہی گذار دیئے گئے تو یہ اتنا بڑا سیلاب بن جائیگا کہ اسکے مقابلہ میں ہاتھیوں کے پاؤں اکھڑ جائینگے۔

طریقِ کار ان حالات میں محض مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کر دینا لاحاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کیلئے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں بھی شائع کر دیئے جائیں تو یہ حالات رو براہ نہیں آ سکتے۔ محض زبان اور قلم سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کر دینے سے کیا فائدہ؟ ان خوبیوں کو واقعات کی دنیا میں سامنے لانیکی ضرورت ہے۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ اسلام کے اصولوں میں زندگی کے مسائل کا حل موجود ہے یہ مسائل خود بخود حل ہو جائینگے۔ اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے اسکو بالفعل بنانیکی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کشمکش اور جدوجہد کی دنیا ہے اسکی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جا سکتی۔ اسکو بدلنے کیلئے انقلاب انگیز جہاد کی ضرورت ہے۔ اگر اشتراکی اپنے غلط اصولوں کو لیکر نصف صدی کے اندر دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اپنا اثر و اقتدار قائم کر سکتے ہیں، اگر فاشسٹ اپنے غیر معتدل طریقوں کو لیکر دنیا پر اپنی دھاک بٹھا سکتے

[1] یہ دونوں فقرے جو یہاں نقل کئے گئے ہیں، ایک مسلمان صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو "مدینہ" جیسے کثیر الاشاعت مسلم اخبار کی ۔۔۔ [illegible]

ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جنکے پاس حق اور عدل کے غیر فانی اصول ہیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں اپنا سکہ نہ جما سکیں۔ مگر یہ سکہ نرے وعظ و تلقین سے نہیں جم سکتا۔ اس کیلئے سعی و عمل کی ضرورت ہے اور انہی طریقوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے جن سے سنت اللہ کے مطابق دنیا میں سکہ جما کرتا ہے۔

اسوۂ رسول اللہ | "انقلاب انگیز جد و جہد" ایک مبہم لفظ ہے۔ اسکی عملی صورتیں بہت سی ہیں اور بہت سی ہو سکتی ہیں۔ جس قسم کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو اسکے لئے وہی صورت اختیار کرنی پڑیگی جو اس انقلاب کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہو۔

ہم جو انقلاب چاہتے ہیں اسکے لئے ہمیں کوئی نئی صورت تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ انقلاب اس سے پہلے برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک انسان نے (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلی مرتبہ یہ انقلاب برپا کیا تھا، وہی اسکی فطرت کو خوب جانتا تھا، اور اسی کے اختیار کئے ہوئے طریقہ کی پیروی کر کے آج بھی یہ انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ اس پاک ہستی کی سیرت ایک لحاظ سے معجزہ ہے مگر دوسرے لحاظ سے اسوہ بھی ہے۔ وہ اخلاق، وہ تقویٰ، وہ حکمت، وہ عدالت، وہ شخصیت، وہ انسانیت کبریٰ کی عظیم الشان خصوصیات اب کوئی انسان کہاں سے لا سکتا ہے؟ اس لئے اب کوئی انسان اتنا کمال درجہ کا انقلاب بھی کہاں برپا کر سکتا ہے؟ اس لحاظ سے وہ معجزہ ہے اور قیامت تک کیلئے معجزہ ہے۔ لیکن اس انسان اکبر نے جو نمونہ چھوڑا ہے اسکا طبعی خاصہ وہی انقلاب انگیزی ہے جسکی نظیر سارھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کے سامنے آچکی ہے۔ اس نمونہ کی جتنی زیادہ پیروی کیجائیگی اور جسقدر زیادہ اس سے مماثلت پیدا کیجائیگی، اسیقدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج بھی ظاہر ہوں گے اور وہ اُس پہلے انقلاب سے اتنے ہی زیادہ اقرب ہونگے جو اصل نمونہ کی طاقت سے برپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اسوہ ہے اور قیامت تک کیلئے اسوہ ہے۔ بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی، ہندوستان ہو یا امریکہ یا روس، جہاں اور جسوقت چاہیں آپ اسی نوعیت کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ

اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی دنیا میں انقلاب برپا کیا تھا، اسکی تفصیلات یہاں بیان کرنیکا موقع نہیں۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ "دار الاسلام" کا تخیل اسی اسوۂ پاک کے غائر مطالعہ سے پیدا ہوا ہے۔

آنحضرت جب مبعوث ہوئے تو روئے زمین پر ایک شخص بھی مسلم نہ تھا۔ آپ نے اپنی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی اور آہستہ آہستہ متفرق طور پر ایک ایک دو دو چار چار آدمی مسلمان ہوتے چلے گئے یہ لوگ اگرچہ پہاڑ سے زیادہ مضبوط ایمان رکھتے تھے، اور ایسی فدویت ان کو اسلام کے ساتھ تھی کہ دنیا انکی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، مگر چونکہ متفرق تھے، کفار کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ بے بس اور کمزور تھے، اس لئے اپنے ماحول سے لڑتے لڑتے انکے بازو شل ہو ہو جاتے تھے اور پھر بھی وہ ان حالات کو نہ بدل سکتے تھے جنکو بدلنے کیلئے وہ اور ان کے ہادی و مرشد فداہ ابی و امی کوشش فرما رہے تھے۔ ۱۳ سال تک حضور اسی طرح جد و جہد کرتے رہے اور اس مدت میں سرفروش اہلِ ایمان کی ایک مٹھی بھر جماعت آپ نے فراہم کرلی۔ اسکے بعد اللہ نے دوسری تدبیر کیطرف آپکی ہدایت فرمائی اور وہ یہ تھی کہ ان سرفروشوں کو لیکر کفر کے ماحول سے نکل جائیں، ایک جگہ انکو جمع کرکے اسلامی ماحول پیدا کریں، اسلام کا ایک گھر بنائیں جہاں اسلامی زندگی کا پورا پروگرام نافذ ہو، ایک مرکز بنائیں جہاں مسلمانوں میں اجتماعی طاقت پیدا ہو، ایک ایسا پاور ہاؤس بنا دیں جس میں تمام برقی طاقت ایک جگہ جمع ہو جائے اور پھر ایک منضبط طریقہ سے وہ پھیلنی شروع ہو یہاں تک کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس سے منور ہو جائے۔ مدینہ طیبہ کی جانب آپکی ہجرت اسی غرض کیلئے تھی۔ تمام مسلمان جو عرب کے مختلف قبیلوں میں منتشر تھے، ان سب کو حکم دیا گیا کہ سمٹ کر اس مرکز پر جمع ہو جائیں۔ یہاں اسلام کو عمل کی صورت میں نافذ کرکے بتایا گیا۔ اس پاک ماحول

میں پوری جماعت کو اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دیگئی کہ اس جماعت کا ہر شخص ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کرنے کیلئے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لئے آیا ہے۔ ان پر اللہ کا رنگ (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ) اتنا گہرا چڑھایا گیا کہ وہ جہاں جائیں دوسروں کا رنگ قبول کرنے کے بجائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھا دیں۔ ان میں کیرکٹر کی اتنی طاقت پیدا کی گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں اور جو انکے مقابلے میں آئے ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے۔ ان کی رگ رگ میں اسلامی زندگی کا نصب العین اس طرح پیوست کر دیا گیا کہ زندگی کے ہر عمل میں وہ مقدم ہو اور باقی تمام دنیوی اغراض ثانوی درجہ میں ہوں۔ انکو تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعہ سے اس قابل بنا دیا گیا کہ جہاں جائیں زندگی کے اُسی پروگرام کو نافذ کر کے چھوڑیں جو قرآن وسنت نے انھیں دیا ہے، اور ہر قسم کے بگڑے ہوئے حالات کو منقلب کر کے اسی کے مطابق ڈھال لیں۔

یہ حیرت انگیز تنظیم تھی جس کا ایک ایک جزو گہرے مطالعہ اور غور و فکر کا مستحق ہے۔ اس تنظیم میں کام کو چار بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(۱) ایک گروہ ایسے لوگوں کا تیار کیا جائے جو دین میں تفقہ حاصل کریں اور جن میں استعداد ہو کہ لوگوں کو دین اور اسکے احکام بہترین طریقہ پر سمجھا سکیں۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ (التوبہ: ۱۵)

(۲) کچھ لوگ ایسے تیار کئے جائیں جنکی زندگیاں اسلام کے نظام العمل کو قائم کرنے اور پھیلانے کی سعی و جہد کیلئے وقف ہوں۔ جماعت کا فرض ہے کہ ان کو کسب معیشت سے بے نیاز کر دے لیکن خود انہیں اسکی پروانہ ہو۔ چاہے معیشت کا کوئی انتظام ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ اپنے دل کی لگن سے مجبور ہوں اور ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے اس کام میں لگے رہیں جو انکی زندگی کا دائم

نصب العین ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران: ۱۱)

(۳) پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہر شخص اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھے۔ وہ اپنے دنیا کے کاروبار چلاتا رہے مگر ہر کام میں یہ مقصد اسکے سامنے ہو۔ تاجر اپنی تجارت میں، کسان اپنی زراعت میں، صناع اپنے پیشے کے کام میں اور ملازم اپنی ملازمت میں اس مقصد کو کبھی نہ بھولے وہ ہمیشہ اس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ یہ سب کام جینے کیلئے ہیں اور جینا اس ایک کام کیلئے ہے۔ وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرے، اپنے اقوال، افعال اور اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصول کی پابندی کرے اور جہاں دنیوی فوائد میں اور اصولِ اسلام میں تناقض واقع ہو جائے وہاں فوائد پر لات مار دے اور اصول کو ہاتھ سے دے کر اسلام کی عزت کو بٹہ نہ لگائے۔ پھر وہ جتنا مال اور جتنا وقت اپنی ذاتی ضروریات سے بچا سکتا ہو، اسکو اسلام کی خدمت میں صرف کر دے اور ان لوگوں کا ہاتھ بٹائے جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کام کیلئے وقف کی ہیں۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۲)

(۴) باہر کے لوگوں کو موقع دیا جائے کہ دار الاسلام میں آئیں اور اس ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر ہے۔ کفر کے ماحول کی بہ نسبت اسلام کے ماحول میں وہ قرآن کو زیادہ بہتر سمجھینگے اور زیادہ گہرا اثر لیکر واپس جائیں گے۔ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ (التوبۃ)

صرف آٹھ برس کی قلیل مدت میں دنیا کے اس سب سے بڑے ہادی و رہبر نے مدینہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ اس نے دیکھتے دیکھتے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے

نکل کر اسکی روشنی روئے زمین پر پھیل گئی، حتیٰ کہ آج تیرہ سو برس گذر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس اب بھی طاقت کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

ہم اسی پاور ہاؤس کی نقل اتارنا چاہتے ہیں۔ وہ عظیم الشان طاقت تو ہم گنہگار کہاں سے لائینگے مگر جب ہم اسکی نقل اتارینگے تو کچھ نہ کچھ طاقت تو ہم میں پیدا ہوگی ہی محدب شیشہ جب آفتاب سے نسبت پیدا کریگا تو کچھ نہ کچھ حرارت تو اسمیں مرتکز ہو ہی جائیگی۔ ساری دنیا نہ سہی، ہندوستان ہی سہی اور سارا ہندوستان بھی نہ سہی، اسکا ایک حصہ ہی سہی۔ اگر ایک حصہ میں بھی ہم آفتاب رسالت سے حاصل کی ہوئی روشنی اور حرارت پھیلا سکے تو ہماری زندگی کا مقصد حاصل ہوگیا۔ اللہ دوسروں کو بھی توفیق دیگا کہ یہی کام ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی کریں۔

دارالاسلام کی مختصر اسکیم دارالاسلام کا منصوبہ دراصل اسی نمونہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب نظام اسلامی میں بہت کچھ برہمی پیدا ہوگئی تو صوفیائے اسلام نے بھی اسی طریقہ کی پیروی میں جگہ جگہ خانقاہیں قائم کی تھیں۔ آج خانقاہ کا مفہوم اس قدر گر گیا ہے کہ یہ لفظ سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسی جگہ کا تصور آجاتا ہے جہاں ہوا اور روشنی کا گذر نہ ہو، جہاں صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے۔ مگر اصل میں یہ خانقاہ بھی اسی نمونہ کی ایک نقل تھی جسے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم کیا تھا۔ صوفیاء کرام جن لوگوں میں اچھی استعداد پاتے تھے انکو بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک خانقاہ میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دیکر انھیں اسی کام کیلئے تیار کرتے تھے جسکے لئے مرشدِ اعظم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تیار کیا کرتے تھے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جو لوگ سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، جنکے دلوں میں حوصلے ہیں مگر پراگندگی و انتشار کیوجہ سے مایوس ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں انکو جہاں تک ممکن ہو رفتہ رفتہ ایک مرکز پر جمع کریں اور دارالاسلام میں ان کی اجتماعی طاقت سے

خالص اسلامی ماحول پیدا کریں۔ پھر کام کو اسی طرح چار شعبوں میں تقسیم کیا جائے جس طرح وحیٔ خداوندی کے تحت سرکارؐ نے تقسیم کیا تھا۔

(۱) ایک شعبہ ایسا ہو جس میں اعلیٰ درجہ کی علمی استعداد کے لوگ شامل ہوں۔ ان میں سے جو لوگ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں، انھیں مغربی زبانوں سے اور علوم جدیدہ سے روشناس کیا جائے اور جن حضرات نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی ہو انہیں عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے۔ پھر یہ لوگ قرآن اور سنت کا گہرا مطالعہ کرکے دین میں تفقہ اور بصیرت حاصل کریں۔ اسکے بعد انکے مختلف گروپ بنادیے جائیں، ہر گروپ ایک ایک شعبۂ علوم کو لیکر اسمیں اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز پر مرتب کرے، زندگی کے جدید مسائل کو سمجھے اور اصول اسلام کے مطابق انکا حل تلاش کرے، علوم کی بنیاد میں جو مغربی نقطۂ نظر پیوست ہوگیا ہے اسکو نکال کر اسلام کے نقطۂ نظر سے علوم کو از سرِ نو مدون کرے، اور اپنی تحقیقات سے ایسا صالح لٹریچر پیدا کرے جو اسلام کی موافقت میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنیکی طاقت رکھتا ہو۔

(۲) دوسرا شعبہ ایسا ہو جسمیں خدمت اسلام کیلئے اچھے کارکن تیار کرنیکی کوشش کیجائے پاکیزہ اخلاق، مضبوط سیرت، دُھن کے پکے اور اپنے نصب العین کیلیے سب کچھ قربان کردینے والے لوگ، جو دیہات اور شہروں میں جائیں، اصول اسلام کے مطابق مسلمانوں کی تنظیم کریں، ان کے اخلاق کی اصلاح کریں، انھیں اسلام کا علم پھیلائیں انکے معاشی و تمدنی مسائل کو صحیح طریق پر حل کریں اور اس حل کو اتنی کامیابی کے ساتھ عمل میں لاکر بتائیں کہ ہمارے غیر مسلم ہمسائے جو کسی بہتر حل سے واقف نہ ہونے ہی کی وجہ سے اشتراکیت کے راستے پر چلے جارہے ہیں، اس سے بہتر چیز کو کامیاب ہوتے دیکھ کر اسی سے استفادہ کرنے پر مائل ہوجائیں۔ ان لوگوں کو ایک سلک میں منسلک کیا جائیگا تاکہ جہاں جہاں یہ کام کریں انکا ایک ہی پروگرام ہو اور ایک ہی مرکز سے وابستہ رہیں۔ نیز اس

امر کی بھی کوشش کیجائے گی کہ جتنے لوگوں کو تنظیم و اصلاح کی خدمت پر لگایا جائے انکی ضروریات زندگی حدود رجہ مختصر ہوں، اور ان مختصر ضروریات سے انہیں بے نیاز کر دیا جائے۔

(۳) تیسرے شعبہ میں ایسے لوگ رہیں جو صرف تھوڑی مدت کیلئے دارالاسلام میں مقیم رہکر واپس جانا چاہتے ہوں۔ انہیں دین کا علم اور اخلاقی تربیت دیکر چھوڑ دیا جائے کہ جہاں چاہیں رہیں مگر مسلمان کیطرح رہیں، دوسروں سے متاثر ہونیکے بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں، اپنے اصولوں میں سخت ہوں، اپنے عقائد میں مضبوط ہوں، بے مقصد زندگی نہ بسر کریں، ایک نصب العین ہر حال میں انکے سامنے ہو، پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور اس کا ایک حصہ ان لوگوں کی اعانت میں صرف کریں جنہوں نے اپنی زندگی اسی مشترک نصب العین کی خدمت کیلئے وقف کی ہے، نیز جتنا وقت بھی اپنی ضروریات سے بچا سکیں اسکو اسی خدمت میں صرف کریں۔

(۴) چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کیلئے ہو جو محض عارضی طور پر دارالاسلام میں آکر کچھ عملی استفادہ کرنا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنیکے خواہشمند ہوں۔ ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائینگی اور اس امر کی کوشش کیجائے گی کہ وہ دارالاسلام سے اچھا اثر لے جائیں۔

رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں یہ ایک سرسری ساخاکہ ہے اس نظام کا جسے ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہماری کامیابی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ ہمارا یہ نظام اپنی روح اور اپنے جوہر میں مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کیساتھ زیادہ سے زیادہ مماثلت پیدا کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنیکا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اسوقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کرکے اس مرتبہ تمدنی پر واپس جانیکے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباع رسولؐ و اصحابؓ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے، اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ انکے نزدیک

سلفِ صالح کی پیروی اسکا نام ہے کہ جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں، جس قسم کے وہ کھانے کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں جیسا طرزِ معاشرت انکے گھروں میں تھا بعینہٖ وہی طرزِ معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو، تمدن و حضارت کی جو حالت انکے عہد میں تھی اسکو ہم بالکل ایک متحجر (Fossilised) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں، اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کرکے اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جسکی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونیکی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے، درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بنکر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈراما بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اسکا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے، بلکہ اسکے بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستہ پر چلانیکی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے، اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے۔ ہم کو "خیر امت" جو بنایا گیا ہے، تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب بنکر (Rearguard.) کی حیثیت سے لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے، ہم مقدمۃ الجیش بننے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں، اور ہمارے خیر امۃٍ ہونے کا راز اُخرِجت للناس میں پوشیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی

چاہا ہے یہ ہے کہ انہوں نے قوانین طبیعی کو قوانین شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اسکے قالب میں اسلامی تہذیب کی روح پھونکی۔ اسوقت جتنی طبیعی قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو چکی تھی، ان سب کو انہوں نے اس تہذیب کا خادم بنایا، اور غلبہ و ترقی کے جسقدر وسائل تمدن نے فراہم کئے تھے ان سے کام لینے میں وہ کفار و مشرکین سے سبقت لے گئے تاکہ خدا سے بغاوت کرنیوالوں کی تہذیب کے مقابلہ میں خدا کی خلافت سنبھالنے والوں کی تہذیب کامیاب ہو۔ اسی چیز کی تعلیم خدا نے اپنی کتاب میں ان کو دی تھی کہ اَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ۔ ان کو یہ سکھایا گیا تھا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی قوتوں سے کام لینے کا حق کافر سے زیادہ مسلم کو پہنچتا ہے بلکہ اسکا اصلی حقدار مسلم ہی ہے۔ پس نبیؐ و اصحاب نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانین طبیعی کے انکشاف سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں انکو ہم اسیطرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانیکی کوشش کریں جسطرح صدر اول میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں ہے۔ ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو دارو غہ ارباب نشاط یا ناشر کذب و افتراء بناتی ہے اور اس ناپاک تہذیب کو فروغ اسی لئے ہو رہا ہے کہ اس کو فروغ دینے کیلئے خدا کی پیدا کی ہوئی تمام ان طاقتوں سے کام لیا جا رہا ہے جو اسوقت تک انسان پر منکشف ہوئی ہیں۔ اب اگر ہم اُس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں جو اپنی تہذیب کو فروغ دینے کیلئے ہم پر عائد ہوتا ہے تو ہمیں بھی انہی طاقتوں سے کام لینا چاہیئے۔ یہ طاقتیں تو تلوار کیطرح ہیں کہ جو اس سے کام لیگا وہی کامیاب ہوگا، خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیئے کام لے یا پاک مقصد کیلئے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی ہی کو لیئے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اُسے بھگتنی پڑیگی۔ کیونکہ اس عالم اسباب

ہیں خدا کی جو سنت ہے، اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جاسکتا۔

فرقہ بندی نہیں اس تصریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "دارالاسلام" کی تحریک تو ایک ارتجاعی (Reactionary.) تحریک ہے اور نہ اس قسم کی ارتقائی تحریک ہے جسکے پیش نظر صرف مادّی ارتقا ہو، اس کے لیئے گروکل کانگڑی، ستیہ گرہ آشرم، شانتی نکیتن، اور دیال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے اس کے لیئے اگر کوئی صحیح نمونہ ہوسکتا ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول ہے۔

دارالاسلام کے دروازے تمام مسلمانوں کیلئے کھلے ہوئے ہیں، خواہ وہ اسلام کے کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں[1]۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون کس مذہب فقہی یا کس مذہب کلامی کا پیرو ہے ہم اصل اسلام اور پوری امت مسلمہ کی خدمت کیلئے اٹھے ہیں، اس لیئے ہر وہ شخص ہمارا رفیق بن سکتا ہے جسکے پیش نظر یہی مقصد ہو۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ آپ کھلے دل اور آزاد نظر سے اسلام کے ماخذ اصلیہ کا مطالعہ کیجیئے۔ اسکے بعد فرق اسلامیہ میں سے جس فرقہ کے طریقہ کو آپ پسند کریں اسے اختیار کرسکتے ہیں۔ مگر اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھئے کہ تاویل سے جو مذہب پیدا ہوتا ہے وہ "دین" نہیں ہے بلکہ دین کے مذاہب میں سے ایک مذہب ہے، اور اس مذہب سے جو فرقہ وجود میں آتا ہے وہ "امت" نہیں ہے بلکہ امت کے اجزاء میں سے ایک جزو ہے، لہذا آپکے اندر اسلامی عصبیت کے سوا کوئی اور عصبیت نہ ہونی چاہیئے۔ فقہ اور عقائد کے جزئیات میں اختلاف ہونا تو ایک امر فطری ہے، عقول و اذہان کا اختلاف جب تک باقی ہے اسکو بند نہیں کیا جاسکتا، اور شارع کا مقصد بھی اس کو بند کرنا نہیں ہے۔ البتہ جس چیز کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد پر دین اور امت کے ٹکڑے کرڈالے جائیں اور ہر ٹکڑا اپنی علٰحدہ عصبیت قائم کرکے دوسرے ٹکڑے سے اسطرح جدا

---

[1] قادیانی حضرات ہمیں معاف فرمائیں انھیں اسلامی فرقوں میں شمار کرنے سے ہم معذور ہیں۔ انہوں نے ہمارے اور اپنے درمیان جدید نبوت کی دیوار ایسی کھڑی کردی ہے جسکی وجہ سے ہم اور وہ ایک امت کے دائرہ میں جمع نہیں ہوسکتے۔

ہو جائے کہ گویا اس کا دین الگ ہے اور اسکی امت الگ ہے۔ یہی مصداق ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ کا، اور اسی سے یہ کہکر روکا گیا ہے کہ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ۔

فرقہ بندی کی اس بیماری سے بچنے کیلئے دارالاسلام کے قواعد میں یہ بات شامل کی گئی ہے کہ جو لوگ وہاں رہیں وہ اختلافی مسائل پر بحث و جدال و مناظرہ سے پرہیز کریں، اور سب بلا امتیاز مذہب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھیں۔

مالی مسئلہ اس تمام داستان کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ سوال ناظرین کے دل میں کھٹکا ہوگا کہ کام تو بہت اچھا ہے اور کرنے کا ہے، مگر روپے کا کیا انتظام ہوگا؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ دنیا نے جس چیز کو قاضی الحاجات سمجھ رکھا ہے، ہم اسکو قاضی الحاجات نہیں سمجھتے۔ اصل چیز روپیہ نہیں ہے بلکہ عزم و ارادہ ہے یہ کام جو ہم کرنا چاہتے ہیں، اسے ہم نے پیشہ کے طور پر اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ یہ ہمارا مقصدِ زندگی ہے، اور خدا کے بھروسہ پر ہم یہ ارادہ کر چکے ہیں کہ اپنی زندگی کے اس مقصد کو پورا کر کے چھوڑیں گے ہمارے اس ارادے میں جتنی زیادہ قوت ہوگی، خدا کیطرف سے اتنے ہی زیادہ اسباب ہماری مساعدت کیلئے جمع ہوتے چلے جائینگے، البتہ خدا کی یہ سنت ہمیشہ رہی ہے اور اس میں کسی کیلئے استثنا نہیں ہے کہ وہ ارادوں کی طاقت کا امتحان ضرور لیا کرتا ہے، سو ہم تو یہ امتحان دینے کے لئے تیار ہیں، اور پہلے سے کہے دیتے ہیں کہ جو لوگ ہماری رفاقت کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اسکے لئے تیار ہو کر آئیں۔ ہمارے پاس نہ تنخواہیں ہیں، نہ وظائف ہیں، نہ یہاں چندے کا کاروبار ہے اور نہ جلوسوں اور نعروں کی بہار۔ جن لوگوں کو روزگار کی تلاش ہو یا جنہیں شہرت یا ناموری مطلوب ہو انکے لیئے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے البتہ جو لوگ اپنی زندگی کا وہی مقصد رکھتے ہوں جو ہماری زندگی کا ہے، اور وہی امتحان

و دینے کیلئے تیار ہوں جسکے لئے ہم تیار ہوئے ہیں، تو انکے لیئے دار الاسلام میں جگہ موجود ہے جس حد تک وہ اپنی روزی کا انتظام کر سکتے ہوں وہ خود کریں، اور جس حد تک ہم ان کی مدد کر سکیں گے اس میں دریغ نہ کرینگے۔ یہ تو مشترک مقصد کیلئے ایک مشترک جہاد ہے۔ اس میں خدمت کے معاوضہ کا کوئی سوال ہی نہیں، یہاں نہ کوئی معاوضہ دینے والا ہے نہ لینے والا۔ البتہ خدمت میں باہمی امداد و معاونت بلحاظ استطاعت سب پر لازم ہے۔

یہ ابتدا ہی سے ارادہ کر لیا گیا ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا جائیگا۔ اب تک جو کچھ کام ہوا ہے دار الاسلام کے رفقار نے اپنی ذات سے کیا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی کریں گے اپنی ذات سے کرینگے۔ اگر کوئی شخص خود اپنے فرض کو محسوس کرے اور اس کام میں روپیہ صرف کرنے کو خود اپنی غرض سمجھے جس طرح ہم سمجھتے ہیں تو وہ لائے، ہم اس سے بخوشی لیں گے لیکن اگر کوئی اسے اپنی غرض نہیں بلکہ ہماری غرض سمجھتا ہے تو ہم غرضمند نہیں ہیں۔ ہم اسکے پاس مانگنے کیلئے کبھی نہ جائینگے۔

آئندہ سے ترجمان القرآن میں وقتاً فوقتاً دار الاسلام کی اطلاعات شائع ہوتی رہینگی تاکہ ناظرین اس کام کی رفتار سے واقف ہوتے رہیں۔

کتابتِ قرآن

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ

از

جناب مولوی قمر الدین صاحب جمالپوری۔ مدرستہ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ)

(ذیل کا مضمون علامہ موسیٰ جار اللہ روستوفدنی کی تاریخ القرآن سے ماخوذ ہے۔ علامہ ممدوح روس کے اکابر علماء میں سے تھے اور زمانۂ جدید میں دنیائے اسلام نے جو عالم رجال پیدا کئے ہیں انکی صفِ اول میں مرحوم نے جگہ پائی تھی۔ ان کی یہ کتاب جس سے یہ مضمون ماخوذ ہے ۱۳۲۳ھ میں سینٹ پیٹرس برگ سے شایع ہوئی تھی۔)

اہمیت کتابت اس عالم کون و فساد میں کسی چیز کو بقاء دوام نہیں۔ کسی چیز کو ابدیت کا جامہ پہنانے کی کوشش، حقیقتہً گردشِ ایام کے خلاف جنگ ہے، اگر اس عالم میں کوئی چیز ایسی ہے جو کسی حد تک اسکے آہنیں ہاتھوں کی دست رس سے محفوظ ہے تو وہ کتابت ہی ہے، اگر کوئی شخص کسی علم کو ابدی و دوامی حیثیت دینا چاہتا ہو تو اسکے لیے کتابت سے بہتر و محکم تر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کتابت ایک ایسی محافظ ہے کہ جو چیز اسکے حوالہ کر دیجائے وہ کم ضائع ہوتی ہے ایک ایسا خزانہ ہے جس کے محزونات میں کوئی ردو بدل نہیں ہو سکتا۔ نہ موت کا خطرہ نہ نسیان کا ڈر۔ جب انسانی دل و دماغ اسکے اندر تحریف کرنا چاہتے ہیں تو یہی وہ چیز ہے جو ناطق یا مُحِق ثابت ہوتی ہے۔ فردوسی نے جب سلطان محمود جیسے اولوالعزم شہنشاہ کی شان میں کسی شکر رنجی اور کبیدگی خاطر کیوجہ سے ہجو لکھی تو وہ شاہانہ سطوت و جبروت کے

باوجود اس ہجو کا ایک حرف بلکہ ایک نقطہ بھی محو نہ کرسکا۔ کتابت دراصل انسان کی شریف ترین صفات میں سے ہے۔ اسی نے علوم وفنون کو ہم تک پہنچایا، گذشتہ قوموں کے حالات و واقعات سے ہم کو آگاہی بخشی، اسرار و معارف اور حکم نادرہ سے ہمیں مطلع کیا، اور معلومات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے بکھیر دیا۔ یہ صدیوں کی دیرینہ خبریں آنیوالی قوموں تک پہنچا دیتی ہے، گذشتہ اقوام کے کارناموں، عبرتناک حوادث اور انکے فلسفۂ عروج وزوال سے واقف و آگاہ کرتی ہے۔

ابتدائے تاریخ تدوین قرآن کریم

کتابت کے انہی فوائد کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا ہی سے قرآن مجید کو لکھوانیکا انتظام فرمایا تھا۔ اگرچہ قرآن کی حفاظت کیلئے انسان کی دوسری اہم ترین صفت یعنی قوت حافظہ سے بھی پوری مدد لی گئی، مگر آپ نے صرف اسی پر اعتماد نہیں کرلیا، بلکہ ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعہ سے بھی قرآن کو محفوظ کرنیکی کوشش فرمائی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ کلام مجید ایک ہی مرتبہ اس مرتب صورت میں جیسا کہ فی الحال ہماری نظروں کے سامنے ہے نازل نہیں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ حوائج انسانی کا اندازہ داں ہے، اس نے جب کوئی ضرورت دیکھی فوراً جبرائیل وحی لیکر آموجود ہوئے۔ اس وحی کو آنحضرت صحابہ کرام کو سنا دیتے اور انھیں حفظ بھی کرادیتے تھے۔ دربار رسالت میں کاتبین وحی موجود رہتے، وہ فوراً لکھ لیا کرتے تھے لیکن حاشا کہ اللہ یہ سلسلۂ تحریر سہوونسیان کے خوف سے جاری نہ تھا، کیونکہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کی تسکین بخش تسلی سے حضور کو مطمئن کردیا گیا تھا کہ آپ قرآن کا کوئی لفظ بھول نہیں سکتے۔ پس درحقیقت لکھوانیکا مقصد یہ نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی یادداشت کیلئے قرآن کو محفوظ کرارہے تھے، بلکہ مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کیلئے یہ ہدایت نامہ محفوظ ہوجائے اور وہ آیندہ کیلئے بھی اسکی حفاظت کا اہتمام کریں۔ جسطرح آپکے زمانے میں کلام پاک کا حفظ کرنا واجب تھا اسیطرح اسکا ضبط کرنا بھی زمانہ نبوت کے بعد واجب ہوگیا تھا جسکی آپ نے تاکید بھی کی تھی۔ کتابت کی فرضیت کا سبب یہ تھا کہ خداوند قدوس

نے وعدہ کیا تھا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (یعنی ہم نے قرآن نازل کیا اور اسکی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں) خدا نے مسلمانوں کو اس وعدہ کا امین بنا دیا۔ امین کا یہ فرض ہے کہ امانت کی حفاظت میں سخت احتیاط برتے اضبوط سے مضبوط طریقہ کار عمل میں لائے اور ہر ممکن تدبیر اختیار کرے۔ انہیں اسباب کی بنا پر ہمارے اسلاف نے مصاحف کی تدوین کی۔ کلام مجید کی حفاظت میں ہر ممکن تدبیر سے کام لینا ان کا اولین فرض تھا کہ کسی مکار اور کسی بہکانیوالے کی وسوسہ اندازی کا قرآن مجید میں دخل نہ ہو، نہ وہم کا امکان ہو نہ ظن باطل کا گذر، کیونکہ کلام پاک کی تحریف خواہ وہ نظم و ترتیب میں ہو خواہ رسم الخط میں عمداً یا سہواً بالقصد ہو یا بغیر قصد امت مسلمہ کیلئے گمراہ کن ثابت ہوگی۔ یہ خیال انکے دماغ پر اس طرح مسلط ہوگیا تھا کہ کوئی چیز ہر وقت انکو قرآن کی حفاظت کیلئے نت نئی تدبیروں پر اکساتی رہتی تھی اور وہ دائماً اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ باطل کسی طرف سے بھی اس کتاب پاک کے قریب نہ آسکے۔

تاریخ تعلیم قرآن فتح مکہ کے بعد آنحضور صلعم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو مکہ میں اسی خدمت (تعلیم قرآن) پر مامور فرمایا۔ اکابر صحابہؓ میں جنکی تعداد ہزاروں تک تھی ایسے شخص موجود تھے جو کلام پاک کی تعلیم کے اور حفظ قرآن کے دلدادہ تھے۔ انکے اعتنا و اہتمام کا یہ عالم تھا کہ دن رات میں کتنی ہی بار وہ قرآن کی آیتوں کو دہرایا کرتے تھے۔ انکی مشغولیتوں اور مصروفیتوں کا یہ حال تھا کہ کلام پاک کے ضبط و حفظ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ مسجد نبوی میں جب حفاظ قرآن کریم کی تلاوت سے آوازیں گونجتیں اور آپ سنتے تو خدا کے شکر گذار ہوتے اور فرماتے احسان اور فضل ہے اس مالک کا جس نے میری امت میں ایسے سرگرم لوگوں کو پیدا کیا۔ فی الحقیقت اسی اہتمام و سرگرمی عمل کا نتیجہ تھا کہ آغاز اسلام ہی میں کلام پاک سینوں میں محفوظ ہوگیا تھا۔ تھوڑا تھوڑا حصہ نازل ہوتا جاتا تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نہایت صحت اور احتیاط کیساتھ اسکو یاد کرتے جاتے تھے۔ ایک طرف خود حضور کو اللہ تعالیٰ نے اطمینان

وَلَايَاتَ اَكَ سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰیٓ (ہم تمہیں پڑھائینگے اور تم اسے بھولو گے نہیں) اور دوسری طرف آپکے متبعین اپنے سینوں میں اس کو محفوظ کر رہے تھے اور کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ تھی جسکو یاد رکھنے والے کثیر التعداد لوگ نہ ہوں لیکن آنحضور نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا۔ متعدد صحابہ کو جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اس خدمت پر مامور کیا کہ جوں جوں آیات اترتی جائیں وہ ان کو آپ کی ہدایت کے مطابق اپنی اپنی جگہ پر لکھتے چلے جائیں۔ احادیث شاہد ہیں کہ نبی اکرم صلعم صحابہ کرام کو سورتوں کی ترتیب و نظم سے واقف کرادیا کرتے تھے اور پوری تشریح و توضیح کیساتھ بتادیا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں سورہ میں اس آیت کے بعد یا قبل رکھو اور اس آیت کو اس جگہ ترتیب دو وغیرہ وغیرہ بلکہ کلام پاک کے نظم و ترتیب سے واقف کرنیکا سب سے بڑا ذریعہ نماز تھی۔ جس طرح وہ آیتوں کو وحی کے بعد قلم بند کرلیا کرتے تھے، اسیطرح نماز میں وہ کلام پاک کی ترتیب سے واقف ہوجاتے تھے متعدد احادیث میں (جنکا اس موقع پر ذکر کرنا باعث طول ہوگا) یہ تصریح موجود ہے کہ آنحضور صلعم ختم قرآن سنا دیا کرتے تھے اور صحابہ کرام بھی پورا پورا کلام مجید آپکو سناتے رہتے تھے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہم نے کلام پاک آپکے سامنے پیش کیا تو آپکو یہ بات بہت پسند آئی اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپکے زمانے ہی میں کلام پاک پورا لوگوں کو یاد تھا اور کتابی صورت میں لوگوں کے پاس مرتب تھا۔ صحابہ منزل من اللہ آیتوں کو اسی وقت کاپیوں اور کاغذوں، تختیوں اور پتوں وغیرہ پر لکھ لیا کرتے تھے۔ کتابت وحی انکے نزدیک فرض تھی جس سے کسی صورت میں بے اعتنائی اور بے توجہی جائز نہ تھی حتیٰ کہ جس زمانے میں اسلام گھروں کے اندر محصور تھا، لوگ خوف و خطر کیوجہ سے اسلام کا اظہار نہیں کرتے تھے اس فرض کی طرف سے اسوقت بھی تغافل نہ ہوا، مسلمان ظلم و ستم کی بارشوں سے بچنے کیلئے گھروں میں چھپ کر تلاوت اور کتابت کا کام انجام دیتے تھے کہ کہیں کفار کے جبر و استبداد کی بارشوں سے اسلام کے ابھرنے والے نقوش

سطح عالم سے مٹ نہ جائیں حضرت عمرؓ کے اس واقعہ سے جو ان کی بہن اور بہنوئی بھائی کیساتھ اسلام لانے سے قبل پیش آیا تھا پتہ چلتا ہے کہ مسلمان خوف وخطر میں گھر کر بھی کس طرح اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

عرب اور کتابت | آنحضور صلعم کی ولادت کیوقت یا اس سے قبل عرب میں لکھنے کا رواج عام نہ تھا لیکن اعلیٰ اور اہم چیزیں ضرور قلم بند کی جاتی تھیں مثلاً فصیح و بلیغ قصائد و خطب صحابہ کرام میں بھی ایسے لوگ کافی تعداد میں تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے تھے کہ یہ (چند احادیث کے مجموعہ کیطرف اشارہ کرکے) احادیث ہیں جنکو میں نے نبی اکرم صلعم سے سنکر لکھ لیا تھا۔ اور بھی بہت سے صحابہ تھے جو زبانی یاد کی ہوئی آئتیں لکھ لیا کرتے تھے اور آنحضور سے اس کی تصیح بھی کرا لیا کرتے تھے۔ انھیں میں سے چند لوگ وحی کے منصب کتابت پر مامور تھے مثلاً حضرات علیؓ، عثمانؓ، عمرؓ، زیدؓ بن ثابت، ابن مسعودؓ، ابن مالکؓ، عبداللہ بن سلام وغیرہم۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو انکو آپ املا کراتے تھے اور انکو یکے بعد دیگرے سنکر تصدیق فرماتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح آپ کی زندگی ہی میں کلام پاک پورا ضبط ہو چکا تھا۔ لکھنے کے وسائل اگرچہ اس زمانہ میں عربوں کے پاس بہت کم تھے، لیکن مہتم بالشان چیزوں کو محفوظ کرنے کیلئے جو وسائل اس زمانہ میں استعمال کئے جاتے تھے وہ سب انہوں نے اس کلام عزیز کی حفاظت کیلئے صرف کر دیئے تھے۔

جو لوگ قرآن کی حفاظت میں شک کرتے ہیں انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ مسلمان اس کلام پاک کے حفظ اور اسکی ترتیب و کتابت سے کیسے قطع نظر کر سکتے تھے جبکہ ابتدا ہی سے یہ بات انکے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی کہ یہی کلام ان کیلئے دینی و دنیوی سعادتوں کا سرچشمہ ہے اور اسکا ضائع ہونا انکے مذہب کی بنیاد کا منہدم ہونا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ کلام مجید ہی تقرب الی اللہ

کا واحد ذریعہ ہے۔ اس لیئے انکی یہ تمنا اور کوشش تھی کہ یہ محفوظ رہے۔

وصال نبوی کے بعد تکمیل وتمیم اسلام اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا کی آیت نازل ہونیکے بعد جب سید کونین آنحضور صلعم دار فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے تو آپنے امت کو اس حال میں چھوڑا کہ اسلام جزیرۂ عرب میں پوری طرح تسلط پاچکا تھا، عرب کا چپہ چپہ نور اسلام سے منور ہو چکا تھا، یمن و بحرین، عمان و نجد کی پہاڑیوں میں زندگی بسر کرنیوالے مضر و ربیعہ و قضاعہ کے مقبوضہ ممالک، طائف اور مکہ سب کے سب مشرف باسلام ہو چکے تھے، مسجدیں اس کثرت سے تعمیر ہو چکی تھیں کہ کوئی شہر یا گاؤں یا محلہ ایسا نہ تھا جس میں مسجد نہ ہو اور اسکے اندر اوقات نماز میں کلام پاک کی آیتیں تلاوت نہ کی جاتی ہوں۔ ہر مرد و عورت، بوڑھا اور جوان کلام پاک جانتا اور پڑھتا تھا۔ اس وقت مسلمان اپنی اصلی حالت پر تھے۔ اسلامی اعتقادات میں کچھ فرق نہ تھا۔ سب ایک امت تھے۔ سب کا دین واحد تھا اور ان کے اندر کامل اتحاد و اتفاق تھا۔ آپ کی طاقت ور شخصیت اٹھ جانے کے بعد امت میں پہلا فتنہ جو برپا ہوا وہ ارتداد کا فتنہ تھا۔ اس فتنہ میں اہل عرب چار جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ پہلی جماعت وہ تھی جسکے اندر کسی طرح کا تغیر نہ تھا۔ وہ اسی اپنی اصلی حالت پر تھی۔ دوسری جماعت وہ تھی جس نے زکواۃ دینے سے انکار کردیا تھا۔ تیسری جماعت وہ تھی جو دین سے پھر گئی تھی اور اپنے ارتداد کا بیباکانہ اعلان کرتی پھرتی تھی۔ چوتھی جماعت وہ تھی جو ان میں سے کسی میں بھی شامل نہ تھی بلکہ وہ انتظار کر رہی تھی کہ دیکھیں فتح و نصرت کا پلہ کسطرف جھکتا ہے، اسی طرف ہم بھی ہو رہیں گے۔ یہ فتنہ اگرچہ بہت بڑا فتنہ تھا، اور اس نے ایک وقت میں اسلام کی زندگی ہی کو خطرہ میں ڈالدیا تھا، لیکن قرآن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جیسا متفق علیہ تھا ویسا ہی رہا، اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا۔

حضرت فاروق اعظمؓ اور قرآن کی تدوین کا احساس

یہ فتنہ جب فرو ہو چکا تو حضرت عمرؓ کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی دوسرا فتنہ نہ اٹھے اور اس سے قرآن پر کوئی آنچ آ جائے چنانچہ آپ نے رائے دی کہ کلام پاک کاتبین وحی اور حافظین وحی کی سعی و کوشش سے صحابہ کرام کے سامنے جمع کیا جائے تاکہ پھر کسی کو شبہ اور اختلاف نہ ہو حضرت ابوبکرؓ نے اس سے اتفاق فرمایا اور زید بن ثابتؓ کو بلا کر مشورہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ٹال دینا اور دریا کا رخ بدل دینا کلام پاک کی تدوین سے کہیں آسان و سہل ہے۔ لیکن بعد کو مصالح معلوم کر کے وہ بھی اسی نقطہ پر آ گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان حفاظ قرآن کو بلایا جو قابل اعتماد تھے اور جنکی دیانت عام طور پر مسلّم تھی ان میں سب سے زیادہ کلام پاک کی تدوین میں جنکی ضرورت تھی اور جو قابل اعتماد تھے وہ مندرجہ ذیل اشخاص ہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت ابن عباسؓ۔ حضرت ابن سائبؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت طلحہؓ۔ حضرت سعدؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت سعیدؓ، حضرت سالمؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت ابو زیدؓ، حضرت ابو درداءؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عمرو ابن العاصؓ۔ یہ تمام حضرات پہلے حضرت عمر فاروقؓ کے مکان میں جمع ہوئے۔ کلام پاک کے ضبط و تدوین کی صورتوں پر غور و فکر کیا اور ہر شخص کے فرائض کی تقسیم ہوئی۔ پھر رائے یہ ٹھیری کہ خدا کا کلام خانۂ خدا ہی میں جمع کیا جائے۔

ضبط و تدوین کا کام شروع ہوا۔ مدینہ کے اطراف میں اعلان کیا گیا کہ جس کے پاس جسقدر بھی کلام مجید کا حصہ محفوظ ہو وہ جامعین قرآن کے حوالہ کر دے۔ اس اعلان کے مطابق جس کے پاس کلام مجید کا جتنا مجموعہ تھا خواہ کاپیوں یا منتشر اوراق پر یا جھلیوں اور ہڈیوں پر یا کھجوروں کے

پتوں پر لا کر حاضر کر دیا جس سے کلام پاک کی تدوین میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئیں،

کن حضرات کی تحریریں قابل اعتماد تھیں لیکن تحریر اس شخص کی مقبول ہوتی تھی جو ثقہ ہو اور جسکی تحریر آنحضور صلعم کی آنکھوں کے سامنے ہوئی ہو۔ جسکے پاس جو سرمایہ کلام الٰہی کا محفوظ تھا وہ پیش کرتا تھا۔ پھر ایک شخص کی تحریر دوسرے کی تحریر سے ملائی جاتی تھی تاکہ احتمال کی گنجائش باقی نہ رہے کتابت کی خدمت حضرت زیدؓ بن ثابت کے ذمہ تھی جسے انہوں نے کامل جانفشانی کیساتھ انجام دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں سورۂ توبہ کی اس آیت پر پہونچا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ۔ تو اسکے بعد کی آیت نہیں ملتی تھی جس کی بنا پر سخت تشویش لاحق ہوئی، بہت تلاش و جستجو کے بعد حضرت خزیمہ ابن اوسؓ بن زید انصاری کے پاس ملی۔ جب ہم سورۂ احزاب تک پہنچے تو پھر ایک آیتہ کا سراغ نہیں ملتا تھا جسے میں نے رسولؐ اللہ کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ بڑی فکر ہوئی کہ کسی طرح مل جائے۔ خدا خدا کر کے یہ آیت بھی حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے یہاں مرقوم ملی اور وہ آیت اسی سورہ میں شامل کر دی گئی۔ اس طرح کلام پاک کی تدوین پوری ہوئی۔ نہایت صحیح اور مکمل تدوین۔

اختتام تدوین کی شاندار تقریب جب قرآن کی تدوین کا کام بخیر و خوبی انجام کو پہنچا تو اسکی تقریب میں مسرت و شادمانی کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں تمام حفاظ اور دیگر صحابہ جمع ہوئے حضرت عمر فاروقؓ نے کلام پاک پڑھ کر سب کو سنایا تمام صحابہ کرام نے بغور سنا۔ اس وقت صحابہؓ کی جانب سے نہ اعتراض ہوا نہ اختلاف اور نہ اسکے بعد کبھی اسکی نسبت کچھ سننے میں آیا۔

کلام پاک کی اس جمع و ترتیب پر تمام صحابہ کا اجتماع و اتفاق ثابت ہونے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ یہ کہنا کسی صداقت پسند آدمی کے لئے ممکن ہے کہ کسی نے شاذ کوئی من گھڑت آیت قرآن میں شامل کر دی ہو۔ تدوین کا کام صحابہ کی ایک کثیر جماعت نے ملکر انتہائی احتیاط کیساتھ کیا

تھا۔ یہ سب کے سب پورے یا کچھ کم وبیش قرآن کے حافظ تھے اور آنحضرت صلعم کی زندگی میں ہزاروں مرتبہ آپ سے سن چکے تھے ہر ہر آیت جو لکھے ہوئے پرچوں سے لیکر مصحف میں شامل کی گئی، اس کے آیت قرآنی ہونے پر کثیر التعداد گواہ موجود تھے۔ ایسی حالت میں کسی کیلئے کوئی موقع ہی نہ تھا کہ ایک حرف بھی قرآن میں گھٹا یا بڑھا سکتا۔

حضرات شیخینؓ کا وصال اور شورشوں کا سیلاب

اس فرض کی تکمیل کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کا وصال ہو گیا آپ آسمان اسلام کا سب سے زیادہ روشن ستارہ تھے جو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا سچ پوچھئے تو قرآن پاک کی تدوین کا سہرا آپ ہی کے سر ہے آپکے بعد حضرت عمرؓ کے ایام حکومت میں شام، مصر، ایران اور الجزیرہ فتح ہوئے۔ ان ممالک میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جسمیں بکثرت مسجدیں تعمیر نہ ہوئی ہوں۔ مصاحف کی کتابت اور حفظ کا اہتمام ہر جگہ تھا۔ ائمہ نمازوں میں قرآن پاک پڑھتے اور لوگ تلاوت کرتے تھے۔ مشرق سے مغرب تک مدرسے جاری ہو چکے تھے جنمیں بچوں کو باقاعدہ کلام مجید کی تعلیم دیجاتی تھی یہ صورت عمل دس سال اور کئی ماہ تک جاری رہی اس مدت میں قرآن مجید کی اتنی اشاعت ہوئی کہ پورے قرآن کے حافظوں کی تعداد ہزاروں سے اور اجزاء قرآن کے حافظوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو گئی اور ہزاروں ہی مصاحف تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئے۔ حضرت عمرؓ نے قرآن کی اشاعت کا جو اہتمام کیا ہوگا اسکا اندازہ ہر تاریخ داں کر سکتا ہے جو شخص ایک ایک مسلمان فقیر اور ایک ایک یتیم کی خبر گیری میں اتنا اہتمام کرتا ہو کہ راتوں کو چین سے سو نہ سکتا ہو، جس نے حرمین کی آبادی کو قحط سے بچانے کیلئے نہر خلیج نیل سے کھدوا کر بحر قلزم میں ملائی ہو کہ مصر سے غلہ کی کشتیاں بآسانی حجاز تک پہنچ جائیں، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا شخص اس چیز سے کیسے غفلت کر سکتا تھا جس پر اسلام کے وجود اور مسلمانوں کی زندگی کا مدار تھا؟

خلافت عثمانی

جب حضرت عمرؓ کا وصال ہوا اور حضرت عثمانؓ ابن عفان خلیفہ ہوئے تو آپ کے

عہد میں کچھ ایسے فتنہ پرداز اور کج فہم لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے کلام مجید میں تحریف کر کے مسلمانوں میں اختلاف و افتراق اور تفرق و تشتت کا بیج بونا چاہا اور ان کے درمیان نزع کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی۔ اسوقت صورت حال اسکی مقتضی ہوئی کہ قرآن مجید کا ایک مستند ایڈیشن نکالا جائے اور اسے کثرت سے پھیلایا جائے تاکہ مسلمان ان فتنہ پردازوں کے شر سے محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے صحابہ کو جمع کیا جنکی تعداد بارہ ہزار سے زیادہ تھی اور کلام اللہ کا وہ نسخہ جو حضرت حفصہؓ (ام المومنین) کے یہاں محفوظ رکھا تھا طلب کیا یہ وہی نسخہ تھا جو تمام صحابہ کے اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔ حضرت عثمان نے زیدؓ بن ثابت، عبداللہ ابن زبیرؓ سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ اسکی پانچ نقلیں کریں۔ صحابہ کے مجمع میں انکی تصدیق کرائی۔ پھر حضرت زیدؓ کو مدینہ، حضرت عبداللہؓ بن سائب کو مکہ، حضرت مغیرہؓ بن شہاب کو شام، حضرت ابوعبدالرحمن سلمیؓ کو کوفہ، حضرت عامر بن قیسؓ کو بصرہ ایک ایک نسخہ دیکر اس غرض سے بھیجا کہ فتنہ پردازوں کی فساد انگیزی کے جو پودے ابھی نکل رہے ہیں انکا فوراً استیصال کر دیا جائے۔ چنانچہ جب یہ لوگ اپنے اپنے متعینہ مقامات پر پہنچے تو وہاں کے مسلمان اپنا اپنا قرآن مجید لے کر جوق در جوق ان لوگوں کے پاس آئے اور انہیں سنا کر اختلافات کی اصلاح کی اور اپنی غلطیوں پر متنبہ ہو کر واپس گئے۔ اسطرح اس فتنے کی بیخ کنی ہو گئی

خلافت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد اسلام کو سخت خطرات اور نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ باہمی اختلافات میں اضافہ ہوتا گیا اور فرق باطلہ کا آغاز ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ تخت خلافت پر متمکن ہوئے جنکی خلافت کا زمانہ پانچ سال نو ماہ ہے اسوقت مسلمان دو فرقوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ایک طرف حضرت علیؓ کے جاں نثاروں کی جماعت تھی، دوسری طرف حضرت معاویہؓ کے جانبازوں کی اگرچہ یہ فتنہ ایسا سخت تھا کہ اس نے اسلام کی جڑیں ہلا دیں مگر اس دور میں

کلام مجید کی نسبت کوئی اختلاف نہ ہوا۔ ہر جگہ کے لوگ کلام پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ حضرت علیؓ خود امامت فرماتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما کی تدوینِ کلام مجید پر تعریفیں کیا کرتے تھے اگر خدانخواستہ خلیفہ اول و دوم یا خلیفہ سوم کی جانب سے کلام مجید میں کوئی کمی یا بیشی، تقدیم یا تاخیر ہوئی ہوتی یا تحریف کا دخل ہوتا تو کیا حضرت علیؓ انکے مدون کردہ کلام مجید پر اتفاق کرسکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ انہوں نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد خلفاء ثلاثہؓ کے اس کارنامۂ عظیم پر ستایش اور تعریفیں کیں حالانکہ اگر تغیر و تبدل ہوتا تو وہ اسکی مذمت کرتے اور حکومت کی باگ سنبھالنے کے بعد اسے علی حالہٖ ہرگز باقی نہ رہنے دیتے اگر یہ مان لیا جائے کہ اہلِ بیت کے بارے میں کچھ حصہ نازل ہوا تھا (جیسا کہ ایک جماعت کا خیال ہے) تو کیا اور آیتوں کیطرح عوام کا اس پر تواتر نہ ہوتا؟ ضرور ہوتا، وہ آیتیں بھی آنحضور صلعم سے سنی گئی ہوتیں اور شائع و ذائع ہوتیں۔ ایسی چیز کا چھپا دینا آفتاب کو غائب کر دینے سے مشکل تر تھا۔

بدگمانیوں کا منشا

ابتک تاریخ قرآن کی نسبت جو کچھ ہم نے تحریر کیا ہے وہی واقعیت اور حقیقت ہے۔ لیکن ایک آدمی اگر اسوقت ٹھوکر کھائے جبکہ آفتاب نصف النہار پر چمک کر سارے عالم کو روشن کر رہا ہو تو یہ اسکا قصورِ نظر ہے۔ آج جو کوئی بھی قرآن کے محفوظ ہونے میں شک کرتا ہے اسکے پاس بدگمانی ہی بدگمانی ہے دلیل کوئی نہیں، اور جو شخص محض مخالفت پر تلا ہوا ہو لیکن اپنے پاس کوئی دلیل نہ رکھتا ہو اسکی بات کا دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔

کلام پاک کے بارے میں جو بدگمانیاں پھیلائی گئی ہیں انکی نسبت ایک ایسی جماعت کی طرف سے جنہوں نے معتمد و صحیح حدیثوں سے بے پروا ہو کر بہت سی لایعنی اور ناقابلِ توجہ خبروں (حدیثوں) کو روایت کر دیا ہے اور ایسے اقوال پیش کیے ہیں جنکا تمام عالم میں کوئی شاہد نہیں۔

عدمِ تحریف پر ناقابلِ انکار دلائل

اس امر کا تو کوئی شخص تصور ہی نہیں کرسکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی زندگی میں قرآن کے اندر تحریف ہوسکتی تھی پھر جب آپ اس دارِ فانی سے تشریف لیگئے تو صحابہ کرام کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی اور انمیں کوئی ایسا نہ تھا جسکو کلام پاک کا ایک کافی حصہ یاد نہ ہو۔ ہزاروں ایسے بھی تھے جنکو پورا کلام مجید حفظ تھا۔ یہ لوگ تمام عرب میں پھیلے ہوئے تھے اور زمانۂ ما بعد میں عرب سے باہر بھی اسلام کے مفتوحہ ممالک میں پھیل گئے تھے ان لوگوں کی زندگی میں قرآن مجید کے نسخے لکھے گئے اور انکی ہزار ہا نقلیں ممالک اسلامیہ میں شایع ہوئیں۔ اگر کلام پاک کے اندر ایک لفظ کی تحریف و تصحیف بھی کوئی شخص کرتا تو اختلافِ عظیم برپا ہو جاتا۔ جھگڑے اور فساد ہوتے۔ خون خرابوں تک نوبت پہنچتی۔ کوئی کہتا کہ یہ لفظ قرآن کا ہے اور کوئی کہتا کہ نہیں ہے ممکن نہ تھا کہ اس پر اختلافات برپا نہ ہوتے اور ان اختلافات کی آگ ساری دنیائے اسلام میں پھیل جاتی۔ لیکن تاریخ اسلام میں کہیں کوئی ادنیٰ سی مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ مسلمانوں کے درمیان کبھی اس قسم کا کوئی اختلاف برپا ہوا ہو۔ ہم نے آج تک کبھی نہیں سُنا کہ کسی مسلم یا غیر مسلم نے کلام پاک کی کسی آیت میں اختلاف کیا ہو یا دعویٰ کیا ہو کہ یہ اصل قرآن کی آیت نہیں ہے۔ اگر رائی کے ایک دانہ برابر بھی اختلاف ہوا ہوتا تو زمانۂ مابعد میں فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق کہ ایک پودا پہلے زمین سے اُگتا ہے پھر آہستہ آہستہ ایک موٹا تناور درخت بنجاتا ہے، تغیرات و اختلافات کی بھرمار ہوجاتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عالم واقعہ میں ایسی کوئی چیز پیش نہیں آئی۔ کلام الٰہی اپنی عمر کی ۱۳۵۰ منزلیں طے کر چکا ہے اور آجتک کوئی ایسا نسخہ نہ ملا جس میں تحریف ہو۔

(۲) کلام پاک ہی نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ دین ظاہر ہوا تو اسی کے ذریعہ سے اسلام کی شان و شوکت، جاہ و جلال میں چار چاند لگ گئے تو اسی نے۔ یہی وہ چیز ہے جسکے سامنے بڑے بڑے جباروں اور روسائے جنکے دل سخت سے سخت دردناک واقعات اور لرزہ بر اندام کر دینے والے حادثات اور دل ہلا دینے والے سانحات سے بھی متاثر نہ ہوئے، بالآخر سر جھکا دیا، گھٹنے ٹیک دیے

اور اسکے اوامر ونواہی کے آگے سر تسلیم خم کردیا۔ ممکن نہ تھا کہ امت مسلمہ کلام ربانی کا یہ کرشمہ دیکھکر اسمیں تحریف کی فکریں کرتی اور اگر خدانخواستہ ایسا کرنیکی کوئی جراٴت بھی کرتا تو آپ دیکھتے کہ یہ قوم اپنے خون کا آخری قطرہ بہادینے میں بھی دریغ نہ کرتی۔

(۳) جس شخص کو صحابہ کی تاریخ معلوم ہوگی اور وہ صحیح احادیث پر ایک نظر ڈالیگا اسے معلوم ہوجائیگا کہ وہ کلام پاک کے حفظ اور اسکے ضبط میں کسقدر توجہ اور احتیاط سے کام لیتے تھے کلام پاک تو کلام پاک ہے احادیث کے ضبط وروایت میں اور انکی نشرواشاعت میں وہ جس توجہ اور اعتناء کو کام میں لاتے تھے جس حزم ودانائی سے قدم رکھتے تھے عیاں اور آشکارا ہے عقل سلیم یہ کبھی تسلیم نہیں کرسکتی کہ جن لوگوں نے کلام بشر کی اسطرح حفاظت کی ہو وہ کلام خدا کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھ سکتے تھے۔ ان لوگوں کا حال تو یہ تھا کہ عہد جاہلیت کے اشعار تک کی حفاظت کرتے تھے۔ حالانکہ ان سے کوئی دینی غرض وابستہ نہ تھی اور ان پر قوم کی زندگی اور دین ودنیا کی فلاح کا مدار نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی شخص قدماء کے اشعار میں تغیر وتبدل کرتا تھا تو اس پر طعن وتشنیع کی بوچھار ہونے لگتی تھی یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ غور کیجیے جب ان اشعار میں تحریف وتصحیف ممکن نہ تھی تو اسکا وقوع کلام مجید میں کیسے جائز ہوسکتا تھا جسکے متعلق لوگ جانتے تھے کہ یہی وہ چیز ہے جو نبوت کی دلیل بن سکتی ہے، یہی شریعت کی روح ہے، یہی رشد وہدایت اور صراط مستقیم کی معرفت کا ذریعہ ہے، خیر وشر میں مابہ الامتیاز ہے، آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہے اور اصل دین بھی کلام پاک ہے اگر یہ نہ ہوتا تو وہ راہ ہدایت سے دور رہتے ضلالت وگمراہی میں پڑے رہتے، ہاتھ پاؤں مارتے رہتے اور اصل راستہ کا پتہ نہ پاتے۔

(۴) عہد نبوت سے لیکر آج تک ہر زمانہ میں قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان اس طرح ظاہر اور نمایاں رہا ہے جیسے آفتاب تمام دنیا والوں کے سامنے ظاہر اور نمایاں ہے۔ اگر آفتاب کی سطح پر ذرا سا بھی تغیر ہو تو بیک وقت تمام دنیا والوں پر وہ عیاں ہوجائیگا۔ اسیطرح قرآن کے اندر ادنی تغیر وتبدل بھی

ممکن نہیں کہ چھپا رہ جائے ہر زمانہ میں لاکھوں اور کروڑوں آدمی مختلف اغراض اور مختلف نقطہائے نظر سے قرآن اور اسکے ایک ایک لفظ سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ کسی کو حفظِ قرآن سے دلچسپی ہے کسی کو قرات و تجوید سے دلچسپی ہے، اور وہ ایک ایک لفظ کا صحیح تلفظ کرنیکی کوشش کر رہا ہے، کسی کو رسم القرآن سے دلچسپی ہے اور وہ ایک ایک لفظ کے صحیح املاء سے اعتنا کر رہا ہے کسی کو احکام القرآن سے دلچسپی ہے اور وہ کلام پاک کے ایک ایک نقطہ پر غور کر رہا ہے تاکہ اس سے شرعی احکام کا استنباط اور قوانین اسلام کی تشریح کرے۔ کچھ لوگوں کی غرض اسکی تفسیر، معانی کی معرفت، اسرار و غوامض سے واقفیت اور حقائق پر دسترس حاصل کرنا ہے کچھ لوگوں کی توجہات کو اسکی حد درجہ کی فصاحت، کمال بلاغت، اسلوب بیان نظم و ترتیب اور جملوں کے عجیب و غریب دروبست نے اپنی طرف مائل کر رکھا ہے۔ ایک جماعت اسے محض اسکی کرامت کا خیال کر کے پڑھتی ہے اور برکت و سعادت حاصل کرنیکے لیے ختم پر ختم کیے جاتی ہے اب اگر کوئی شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اس کلام میں شاید کوئی تحریف ہوئی ہو، اسے ایسا گمان کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ تمام دنیا کے مختلف گوشوں میں اتنے کثیر التعداد لوگ جو اتنے مختلف نقطہائے نظر سے اتنے مختلف زمانوں میں اس کلام سے اسقدر دلچسپی لیتے رہے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ ان سب نے بیک وقت متفق ہو کر کسی ایک آیت یا ایک لفظ میں ترمیم کر ڈالی ہو؟ ادنیٰ درجہ کی عقل بھی جس شخص کو میسر ہوگی وہ ایسا امکان تسلیم نہیں کر سکتا، اور جب یہ ممکن نہیں ہے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ قرآن میں کبھی کوئی ایک شخص یا ایک گروہ کسی قسم کی تحریف کرے اور وہ تمام دنیا میں تسلیم کر لی جائے، یا تمام دنیا سے مخفی رہ جائے۔

(۵) صدر اول کے مسلمان یہود و نصاریٰ وغیرہم سے گھرے ہوئے تھے اور ہمیشہ رہے ہیں خصوصاً آنحضور صلعم سے تو انھیں سخت عداوت تھی آپکے لیے اور آپکی پوری قوم کیلیے فساد کا ایک جال بچھا رکھا تھا۔ پوری فضا زہر آلود بنا رکھی تھی۔ خود ہی بغض و عناد سے بھرے نہیں تھے بلکہ دوسروں کو بھی آپکی دشمنی و عداوت پر آمادہ کرتے تھے۔ اس ماحول میں اگر غلطی سے صحابہ کرام معمولی تحریف و تصحیف کے

بھی مرتکب ہوئے ہوتے تو دشمنوں کی یہ جماعت ان پر فتنہ و فساد کی بوچھاڑ کر دیتی۔ تمام قبائل میں ان کا راز فاش کرتی اور اس غلطی سے فائدہ اٹھا کر عام مسلمانوں کے سامنے انکے سرداروں کو مجرم کی حیثیت سے لا کھڑا کر دیتی۔ یہی اسلام کا شیرازہ منتشر کر دینے کا سب سے زیادہ کارآمد ذریعہ اور انکی یکسوئی کو نفاق و انتشار سے بدل دینے کا سب سے بڑا وسیلہ ہوتا۔ کفار کے علاوہ منافقین کی بھی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ یہ مسلمانوں کی مجلس میں شریک ہوتے انکے ساتھ نمازیں ادا کرتے اور اس طرح ان کے تمام اندرونی حالات سے باخبر رہتے تھے۔ ان کو ہر وقت اسی بات کی تلاش رہتی تھی کہ مسلمانوں سے کوئی غلطی یا چوک ہو اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ معمولی باتوں، بے بنیاد خبروں اور بے اصل امور کو اچھال کر آسمان پر پہونچا دیتے تھے۔ رائی کو پہاڑ بنانے کی بے سود کوشش کرتے تھے۔ انکے دست و بازو کی تمام کارفرمائیاں، دل و دماغ کی ساری کاوشیں اور اختراعات مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کیلیے وقف تھیں۔ اگر صحابہ کرام یا تابعین کے گروہ میں سے کوئی شخص قرآن میں ذرا سی بھی تحریف کرتا تو یہ لوگ زمین و آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ منافقین اور یہود و نصاریٰ جیسے شدید دشمنوں کی موجودگی میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہ تھا کہ تحریف قرآن جیسا جرم عظیم چھپا رہ جاتا اور اس پر کوئی فتنہ برپا نہ ہوتا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس کی مدت میں کبھی ایک مرتبہ بھی ان اعدائے اسلام کو ایسا کوئی موقع نہ ملا۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے قرآن کی حفاظت کا کام مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ کافروں اور شدید ترین اعدائے اسلام سے بھی لیکر دکھا دیا ہے۔

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے

(۱) اسلامی جہاد کی حقیقت۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

(۲) مدافعانہ جنگ۔ وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

(۳) مصلحانہ جنگ۔ اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

(۴) اشاعت اسلام اور تلوار۔ اشاعت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

(۵) قوانین جنگ۔ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات

(۶) جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات اور ان پر تبصرہ

(۷) جنگ اور تہذیب جدیدہ۔ بین الاقوامی قوانین جنگ سے اسلامی قوانین جنگ کا مقابلہ۔

قیمت غیر مجلد [illegible]۔ مجلد [illegible]

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے۔

[illegible] ۱۹۴۱ء

اشاعتِ خاص

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ ضلع پنجاب

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

[illegible]
[illegible] ناشر

رسالۂ دینیات

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے محکمۂ تعلیمات نے خاص طور پر میٹرک کے طلبا کو پڑھانے کے لئے لکھوایا ہے۔ علمائے دکن کی ایک مستند مجلس اس کی تالیف میں شریک مشورہ رہی ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اس میں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو سمجھایا گیا ہے، اور ان تمام شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بھی اس رسالہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ نیز علماء بھی اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں، کیونکہ یہ رسالہ ان کو بتائے گا کہ نئے زمانہ والوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ قیمت ( ) ضخامت ۱۶۰ صفحے

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

[illegible]

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

یعنی

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ حالت

سید ابوالاعلیٰ مودودی
ایڈیٹر ترجمان القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

آنکھیں بند کر کے چلنا ایک شخص کے لئے جتنا مہلک ہو سکتا ہے، اس سے بہت زیادہ مہلک ایک قوم کے لئے ہوتا ہے۔ آپ کھلے میدان میں بھی بند آنکھوں کے ساتھ چل کر ٹھوکر سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ لیکن سڑک پر جہاں آمدورفت کا ہجوم ہو۔ اور رہ نوردوں کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو۔ اگر آپ آنکھیں بند کر کے چلیں گے تو یقیناً آپ کو کسی مہلک حادثہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایسی ہی حالت ایک قوم کی بھی سمجھ لیجئے۔ معمولی حالات میں جبکہ فضا میں کوئی غیر معمولی ہنگامہ نہ ہو۔ اس کیلئے آنکھیں —— جسمانی نہیں، عقل و بصیرت کی آنکھیں —— بند کر کے چلنا بعض نقصان اور مضرت کا موجب ہوتا ہے، مگر جب کوئی انقلاب درپیش ہو، جب قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا ہو، جب زندگی و موت کا فیصلہ درپیش ہو۔ ایسے وقت میں اگر وہ آنکھیں بند کر کے چلے گی تو اسے تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہی خیالات تھے جن کے تحت میں نے محرم ۱۳۵۶ھ سے "ترجمان القرآن" میں ان مضامین کا سلسلہ شروع کیا جن کا صرف ایک حصہ اس مجموعہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد سے کامل پندرہ برس تک مسلمان جس انتشار فکر و عمل میں مبتلا رہے اس کو دیکھ دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا، مگر ہمیشہ یہی خیال لب کشائی

سے روکتا رہا کہ میدان میں مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ اور قوت و اثر رکھنے والے موجود ہیں، وہ کبھی نہ کبھی حالات کی اصل خرابی کو محسوس کریں گے، اور ان کو رفع کرنے کے لئے مستعد ہو کر وہ تدبیریں اختیار کریں گے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو اختیار کرنی چاہئیں۔ لیکن دن پہ دن گذرتے چلے گئے، اور یہ امید بر نہ آئی، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جو ہندوستانی مسلمان کے لئے قسمت کے فیصلہ کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائے گی، اور اس کے ساتھ چشم دل ہی نہیں، چشم سر نے بھی یہ دیکھا کہ جن کی تدبیر و تدبّر پر اس قوم کے مستقبل کا انحصار ہے وہ اب بھی حالات کو اُس فراست کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جسے "فراست مومن" کہا گیا ہے، اور اسی کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو ان مختلف راستوں کی طرف چلائے جا رہے ہیں جن میں سے کوئی بھی منزلِ نجات کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اب دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو، ان کے عوام اور خواص علماء اور زعماء، سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے جو "مسلم قوم" ہونے کی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں، اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی یاد دلایا جائے کہ تمہارے لئے ہدایت کا اصلی سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سیرت پاک میں ہے، جسے چھوڑ کر محض اپنی فکر و تدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

اس مجموعہ میں صرف وہ مضامین درج کئے جا رہے ہیں جو "ترجمان القرآن"

میں محرم سے رجب ۵۶ھ تک شائع ہوئے ہیں۔ میں نے ان میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ حالت پر محض ایک مورخ یا ایک سیاسی آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ ایک خالص تاریخی، یا سیاسی، یا معاشی نظر رکھنے والے آدمی کو میرے بیان سے اختلاف ہو، لیکن میں یہ گمان نہیں کرتا کہ جو شخص میری طرح ایک مسلمان کی نظر سے دیکھے گا اسے میرے بیان سے اختلاف ہوگا۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے موجودہ حالات اور ان کی کارفرما قوتوں کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں بھی میرے پیش نظر اسلامی معیار تحقیق ہے، اور ان حالات میں مسلمانوں کے اصل قومی مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی جو کوشش میں نے کی ہے وہ بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کی ہے۔ درحقیقت اس تمام بحث میں میرے مخاطب صرف وہی لوگ ہیں جو اول بھی مسلمان ہیں، آخر بھی مسلمان ہیں، اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو صرف "ہندوستانی" ہیں، یا پہلے "ہندوستانی" اور پھر سب کچھ ہیں، تو ان سے مجھے کوئی سروکار ہی نہیں۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں، اور میں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں۔ ان کی منزل مقصود دوسری ہے اور میری منزل مقصود دوسری۔ ان کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں۔ اور مجھے وہ آزادی درکار ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنی زوال پذیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں، اپنی زندگی کے مسائل کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے حل کروں اور ہندوستان میں مسلم قوم کو پھر سے ایک خود مختار قوم دیکھوں۔ ان کے لئے ہندوستان کا سیاسی و

معاشی استقلال بجائے خود ایک مقصد ہے۔ اور میرے لئے وہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے جو اگر حصولِ مقصد میں مددگار نہ ہو تو مجھے بجائے خود اس ذریعہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پس میرے اور ان کے درمیان مقصدی اختلاف ہے، اس لئے ان سے بحث کرنا تو میرے نزدیک محض تضیع وقت ہے۔ البتہ جو لوگ اس مقصد میں مجھ سے متفق ہیں۔ ان کو میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان تمام مضامین کو غور سے ملاحظہ فرمائیں، جو کچھ حق پائیں اسے قبول کریں، اور جس چیز میں غلطی پائیں اس کا غلط ہونا دلیل و حجت سے ثابت کر دیں تاکہ میں بھی اپنے خیالات کی اصلاح کر سکوں۔

میں جانتا ہوں کہ جو لوگ مقصد میں مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں، ان میں سے بھی بہت سے حضرات میرے ان خیالات سے متفق نہیں ہیں جن کا اظہار میں نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ مگر اس قسم کے جن حضرات نے اخبارات میں اور پرائیویٹ خطوط میں میرے مضامین پر تنقیدیں کی ہیں ان کی تنقیدوں کو دیکھ کر میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا کہ آخر انہیں اختلاف کس چیز سے ہے۔ عموماً ان کی تحریروں کو دیکھ کر تو میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ وہ محض سرسری نظر میں یہ دیکھ کر کہ ایک شخص ان کے طریق کار سے اختلاف کر رہا ہے، پوری طرح اس کے خیالات کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، اور تنقید لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر حضرات نے میرے اوپر وہ اعتراضات کئے ہیں جن کا جواب میں خود ہی اپنے مضامین میں دے چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر انہوں نے ان مضامین کو پڑھا بھی ہے تو دل کے دروازوں کو بند کر کے پڑھا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ یہ طریقہ اہل حق کے لئے مناسب نہیں ہے۔ ہم کوئی مجلس مناظرہ تو قائم نہیں کر رہے ہیں جس کا مقصد محض دماغی زور آزمائی ہوتا ہے اور جس میں ہر فریق پہلے سے یہ فیصلہ کر کے شریک ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات نہ مانے گا اور اپنی بات پر اڑا رہے گا۔ ہمارا مقصد تو

اس ملّت کی حفاظت اور سربلندی ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو یکساں عزیز ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر جو شخص کچھ کہہ رہا ہے اس کی بات کو کھلے دل کے ساتھ سُنئے، پوری طرح سُنئے، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیجئے، اور یہ فرض نہ کر لیجئے کہ جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے، اس لئے اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے وہ بہرحال باطل ہی ہونا چاہئے۔ وہ غریب آپ سے لڑنے کے لئے نہیں اُٹھا ہے بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کے لئے اُٹھا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ قدم اُٹھانے سے پہلے اپنی منزل مقصود متعین کریں، اور اس منزل کی طرف جانے کے لئے وہ راستہ معلوم کریں جو یقیناً صحیح ہو، جس کی صحت اتنی ہی یقینی ہو جتنی ہدایت ربانی کی صحت یقینی ہے پس آپ جویائے حق بن کر اس کے معروضات کا مطالعہ کریں اور دوران مطالعہ میں صواب کو خطا سے ممیز کرتے چلے جائیں۔ جو کچھ صواب نظر آئے اسے قبول کر لیں اور جس چیز میں خطا پائیں اس کے متعلق واضح طور پر بتا دیں کہ اسے کس بنا پر آپ خطا سمجھتے ہیں۔ آیا وہ کتاب اللہ کے خلاف ہے؟ سنت رسول اللہ کے خلاف ہے؟ عقل کے خلاف ہے؟ یا کسی اور ایسی چیز کے خلاف ہے جو تمیز حق و باطل کی معیار ہو؟ اس توضیح سے راقم کو بھی اپنے خیالات پر نظرثانی کرنے کا موقع ملے گا اور نیک نیتی کے ساتھ مباحثہ کر کے ہم سب ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ یا اگر اختلاف باقی بھی رہا تو کم از کم غلط فہمیاں باقی نہ رہیں گی +

اس مقدمہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ "ترجمان القرآن" میں اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھوں گا اس میں میرا مقصد مسلمانوں کے کسی گروہ کی حمایت کرنا اور کسی دوسرے گروہ کو جمہور مسلمین کے سامنے خطاکار ٹھیرانا نہیں ہے۔ اس لئے تمام ناظرین سے میری استدعا ہے کہ وہ ان مضامین کو پڑھتے وقت اپنے ذہن کو پارٹی فیلنگ اور

بدگمانی سے محفوظ رکھیں۔ میں گروہ بندی سے ہمیشہ دامن کش رہا ہوں اور مجھے فطرۃً اس چیز سے نفرت ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام گروہ اپنے احزابی تعصبات سے دل کو پاک کر کے خالص اسلامی نظر سے اپنی قوم کے اور ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھیں اور اسلامی ذہنیت ہی کے ساتھ اپنے لئے راہ نجات تلاش کریں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ جب ایک نظر اور ایک ہی ذہنیت کے ساتھ مشاہدہ اور تفکر کیا جائے گا، اور نفسانیت کا شیطانی عنصر بیچ میں نہ رہے گا تو یہ نزاعات جو عین خانہ بربادی کے موقع پہ گھر والوں کے درمیان برپا ہیں، خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

جو حضرات "ترجمان القرآن" میں ان مضامین کا مطالعہ فرما چکے ہیں ان سے میں عرض کروں گا کہ اس مجموعہ کو پھر ایک مرتبہ اوّل سے آخر تک ملاحظہ فرمائیں، اس لئے کہ نظر ثانی کے بعد اب اس میں بہت سے مباحث کا اضافہ کر دیا گیا ہے جن کی طرف تسوید اوّل کے موقع پر ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔ نیز قریب قریب ان تمام اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے جو ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے اخبارات میں اور نجی خطوط میں کئے ہیں۔

ابوالاعلیٰ

۲۹ رمضان المبارک ۵۶ھ — ایڈیٹر ترجمان القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آنے والا انقلاب اور مسلمان

ہندوستان میں تیزی کے ساتھ ایک نیا انقلاب آرہا ہے جو بلحاظ اپنے اثرات اور اپنے نتائج کے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بھی زیادہ شدید ہوگا۔ بلکہ اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دُنیا میں ہو رہا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ یہ وسیع تر انقلاب ہندوستان پر اثرانداز ہو کر یہاں کے متوقع انقلاب کا رخ اچانک پھیر دے، اور اس کو ہماری توقعات سے بہت زیادہ پُرخطر بنا کر چھوڑ دے +

جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رَو پر بہنے کے لئے تیار ہیں اور جن کو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں دی ہے کہ اپنے لئے زندگی کا کوئی راستہ معین کر سکیں، ان کا ذکر تو قطعی فضول ہے۔ انہیں غفلت میں پڑا رہنے دیجئے، زمانہ کا سیلاب جس رخ پر بھی بہے گا وہ آپ سے آپ اسی رخ پر بہ جائیں گے۔ اسی طرح اُن لوگوں سے بھی قطع نظر کیجئے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر سمجھ بوجھ کر ایمان لائے ہیں اور بالارادہ اسی رخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا جا رہا ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مسلمان مرنا چاہتے ہیں، اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے، اور ہماری آیندہ نسلیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ راست پر قائم رہیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ وقت رواداری سے گذار دینے کا نہیں، بلکہ گہری سوچ اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت

میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے تو ایک جرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملے گی بلکہ اسی دُنیا کی زندگی میں اُن پر چھا جائے گی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تہذیب اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا، اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے۔ زمانہ ان کے قومی وجود کو ملیامیٹ کرے گا، ایک ایک کرکے ان امتیازی حدود کو ڈھائے گا جن سے اسلام غیر اسلام سے متمیز ہوتا ہے، ہر اس خصوصیت کو فنا کر دے گا جس پر مسلمان دُنیا میں فخر کرتا رہا ہے، وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ ان کی اپنی اولاد اُس فوج کی سپاہی بن کر اُٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائے گا۔ وہ اپنے ان جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے۔

یہ انجام یقینی ہے اگر کام کے وقت کو غفلت میں کھو دیا گیا۔ انقلاب کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، اور اب فکر و عمل کے لئے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی گذشتہ تاریخ پر ایک نظر

اسلامی ہند کی تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں اُن سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتدا ہی سے کمزور ہے۔ صدر اول میں اور اس سے

متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس وخاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں، اس لئے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دارالاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے عموماً بھاگ بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے۔ چنانچہ سندھ اور کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ انہی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کی طرف رخ کیا تو وہ خود بھی کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روح جہاد اور علماء میں روح اجتہاد سرد ہو چکی تھی۔ ہمارے حکمراں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو خراج اور توسیع مملکت کی فکر تھی۔ اور ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی، نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دیئے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے، نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعت اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہئے ویسی ہو سکی۔ علماء اور صوفیاء کے ایک مختصر گروہ نے بلاشبہ نہایت زرین خدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ علم دین اور کچھ اتباع شریعت پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا جب کہ قوم کے عوام جاہل، اور ان کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں +

اسلام کی عام کشش سے متاثر ہو کر ہندوستان کے کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے مگر اسلامی اصول پر ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی اسلامی آبادی کا سوادِ اعظم ان تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و عقائد میں گرفتار رہا جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں رائج تھے ۔

جو مسلمان باہر سے آئے تھے ان کی حالت بھی ہندوستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی ۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی ۔ نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا ۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے ۔ زیادہ تر دُنیا اُن کی مطلوب تھی ۔ خالص دینی جذبہ ان میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا، وہ یہاں آکر بہت جلدی عام باشندوں میں گھل مل گئے، کچھ ان کو متاثر کیا اور کچھ ان سے متاثر ہوئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن اسلامیت، عجمیت اور ہندیت کی ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا ۔

عام طور پر جو طرزِ تعلیم یہاں رائج ہوا وہ اسی ڈھنگ کا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں اختیار کیا ۔ اس کا بنیادی مقصد حکومت کی خدمات کے لئے لوگوں کو تیار کرنا تھا قرآن اور حدیث کے علوم جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہے یہاں کے نظامِ تعلیمی میں بہت ہی کم بار پا سکے ۔

طرزِ حکومت بھی قریب قریب اسی ڈھنگ کا رہا جس کی تقلید بعد میں انگریزوں نے کی، بلکہ اپنی قومی تہذیب کی حفاظت اور ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت کا جتنا خیال انگریزوں نے رکھا ہے، اتنا بھی مسلمان حکمرانوں نے نہ رکھا ۔ خصوصیت کے ساتھ مغل فرمانرواؤں نے اس باب میں جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس کی

مثال تو شاذ و نادر ہی دنیا کی کسی حکمران قوم میں نہ مل سکے گی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دستکش ہو جائیں اس کو زوال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

انحطاط کا آغاز اور اس کے ابتدائی آثار

گیارھویں صدی ہجری میں انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا مگر عالمگیر کی طاقتور شخصیت اس کو روکے ہوئے تھی۔ بارھویں صدی کی ابتدا میں۔ جب قصر اسلامی کا یہ آخری محافظ دنیا سے رخصت ہوا تو وہ تمام کمزوریاں یکایک نمودار ہو گئیں جو اندر ہی اندر صدیوں سے پرورش پا رہی تھیں۔ تعلیم و تربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال اور نظام اجتماعی کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعتہً درہم برہم ہو گیا۔ قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا۔ انفرادیت اور خود غرضی پوری طرح ان پر مسلط ہو گئی۔ ان میں ہزار در ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جن کا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا، اور جو اپنے ذاتی فائدہ کے لئے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ ان میں لاکھوں بندگان شکم پیدا ہوئے جن سے ہر دشمن اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی بدتر سے بدتر خدمت لے سکتا تھا۔ ان کے سواد اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔ غیروں کے بخشے ہوئے

خطابات اور مناصب میں اُن کو عزت محسوس ہونے لگی - دین اور ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آئی - اور جب کوئی حامی دین و ملت اقتدار قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے کے لئے اُٹھا، اس کا سر خود اس کی اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کر دیا +

اس طرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا سیاسی اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا، اور سیاسی اقتدار مٹتے ہی یہ قوم افلاس، غلامی، جہالت اور بداخلاقی میں مبتلا ہو گئی +

انگریزی حکومت کے دوران میں مسلمانانِ ہند کی حالت

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ در اصل ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا - جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا وہ سب علیٰ حالہٖ قائم تھیں اور ان پر مزید کمزوریوں کا اضافہ ہو رہا تھا - انکے اندر اسلامی تہذیب کی بنیاد پہلے سے کمزور تھی - اس کمزوری نے جب حکومت کے منصب سے ان کو ہٹا دیا، اور افلاس و غلامی کی دوہری مصیبت میں وہ گرفتار ہوئے تو دوسری اور کمزوریاں رو بکار آگئیں +

دین اور اخلاق اور تہذیب اور تمدن یہ سب چیزیں بلند تر انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کی قدر و عزت وہی لوگ کر سکتے ہیں - جو حیوانیت سے بالاتر ہوں - پیٹ اور روٹی اور کپڑا اور آسائشِ بدن اور لذاتِ نفس وہ چیزیں ہیں جو انسان کی حیوانی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں - اور جب انسان مقامِ حیوانی سے قریب تر ہوتا ہے تو اسکی نگاہ میں یہی چیزیں زیادہ اہم ہوتی ہیں حتیٰ کہ وہ ان کی خاطر بلند تر انسانیت کی ہر متاعِ گراں مایہ کو نہ صرف قربان کر دیتا ہے

بلکہ حیوانی پستی کی آخری حدوں پر پہنچ کر اس میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ میرے لئے کوئی چیز ان چیزوں سے اعلیٰ اور ارفع بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی اقتدار کھو رہا تھا اس زمانہ میں اس کی انسانیت پر حیوانیت غالب آچکی تھی، مگر انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی، اس لئے وہ پیٹ اور بدن پر انسانیت کی گرانقدر متاعوں کو قربان تو کر رہا تھا، مگر اس کو یہ احساس ضرور تھا کہ یہ متاعیں گراں قدر ہیں اور کسی نہ کسی طرح ان کی بھی حفاظت کرنی چاہئے۔ لیکن جب وہ سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا، اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات کو مٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی اور حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گذری ہے اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، بندۂ شکم اور آسائشِ بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لئے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اس وقت تک یہ چیزیں ان کی نگاہ میں کافی اہمیت رکھتی تھیں، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، وہ بنیادی کمزوریاں جنہوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا، ان میں پہلے سے موجود تھیں، اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی و افلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں، ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و عزت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف خود غرضی اور نفسانیت

کے روز افزوں غلبہ نے اُن کو ہر اس شخص کی غلامی پر آمادہ کر دیا جو ان کو کچھ مال اور جاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کر سکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلہ میں وہ انسانیت کے جس گوہر بیش بہا کو چاہے خرید لے۔ تیسری طرف انفرادیت اور خود پرستی جو ڈھائی سو برس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے، انتہائی حد کو پہنچ گئی یہاں تک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی، اور وہ تمام صفات ان سے نکل گئیں جن کی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کے لئے مجتمع ہو سکتے اور مشترک جدوجہد کر سکتے ہیں ۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس دوسرے انقلاب کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاسکے۔ تاہم مختصراً اس کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ ہندوستان میں اسلام کی موجودہ پوزیشن واضح طور پر سامنے آجائے اور یہ اندازہ کیا جاسکے کہ اب جو تیسرا انقلاب سامنے آرہا ہے، وہ ان حالات میں مسلمانوں پر کس طرح اثر انداز ہوگا ۔

انگریزی حکومت کی پالیسی

جس روز سے برٹش امپیریلزم نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، اُسی روز سے اس کی یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے۔ اسی غرض سے اسلامی ریاستوں کو مٹایا گیا اور اس نظام عدل و قانون کو بدلا گیا جو صدیوں سے یہاں قائم تھا۔ اسی غرض کے لئے انتظام مملکت کے قریب قریب ہر شعبے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا مآل یہ تھا کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کر دیا جائے

اور ان پر رزق کے دروازے بند کر دیئے جائیں، چنانچہ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی وہ اب روٹیوں کی محتاج ہو چکی ہے۔ اس کو معیشت کے ذرائع سے یک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے، اور اب اس کی ۹۰ فی صدی آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برٹش امپیریلزم کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام عدالت اس کے لئے وہی خدمت انجام دیتا رہا ہے جو سود خوار پٹھان کے لئے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔

مغربی تعلیم کا اثر

سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لئے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ۔ اپنے دل کو، اپنے دماغ کو، اپنے دین اور اخلاق کو، اپنی تہذیب اور آداب کو، اپنے اصول حیات اور طرز معاشرت کو، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو۔ تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تم کو دیئے جائیں گے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت ہی قیمتی چیز مل رہی ہے۔ بیچو اس پرانے کباڑخانے کو۔ یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب و منصب جیسی بیش بہا چیزوں

کے معاوضے میں مانگی جارہی ہیں، آخر ہیں کس کام کی۔ انہیں تو رہن رکھ کر بیٹے سے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے۔

"مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سمجھ کر گئے۔ زبانوں سے گو ایسا نہیں کہا۔ مگر جذبات اور تخیلات تو ایسے ہی کچھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ۹۰ فی صدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ اسلامی تعلیم میں وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گذرتی۔ وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کس کو کہتے ہیں اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے۔ خواہشات نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور یہ معبود انہیں اس مغربی تہذیب کی طرف لئے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پہ جان نثار کرتے ہیں لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں، میل جول اور بات چیت میں، حتیٰ کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔ انہیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جس کا حکم مذہب نے ان کو دیا ہے، اور ہر اس کام سے رغبت ہے جس کی طرف مغربی تہذیب انہیں بلاتی ہے۔ نماز پڑھنا ان کے ہاں معیوب ہے۔ اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے اسے ان کی سوسائٹی میں بنایا جاتا ہے اور اگر بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تو کم از کم حقارت آمیز حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ آخر یہ کونسی مخلوق ہے جو اب تک خدا کا نام لئے جا رہی ہے۔ بخلاف اس

کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن بلکہ ایک مہذب انسان کے لوازم حیات میں سے ہے اور جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے اس پر حیرت کی جاتی ہے کہ یہ کس قسم کا تاریک خیال مُلّا ہے جو بیسویں صدی کی اس برکت عظمیٰ سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت سے بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا، اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی، مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے جو طبقے ہماری سوسائٹی کے پیش رو اور مقتدا ہیں وہ اپنی عورتوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں۔ ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس کے طور طریقوں اور اس کے تخیلات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ عورت میں انفعال اور تاثر کا مادہ فطری طور پر مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو راستہ مردوں نے ستّر برس میں طے کیا ہے، عورتیں اس کو ان سے بہت جلدی طے کر لیں گی اور ان کی گودوں میں جو نسلیں پرورش پا کر اٹھیں گی ان میں شائد اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔

قومی انتشار

خود غرضی، انفرادیت اور نفس پرستی کے غلبہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے قومیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے۔ اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے پندرہ سال سے ان کے اندر سخت انتشار برپا ہے۔ ان کی کوئی قومی پالیسی نہیں،

کوئی اجتماعی ہیئت نہیں، کوئی ایک شخص نہیں جو ان کا لیڈر ہو، کوئی ایک جماعت نہیں جو ان کی نمائندہ ہو، کسی بڑی سے بڑی قومی مصیبت پر بھی وہ جمع نہیں ہوسکتے ایک بن سدھی فوج ہے جو راس کماری سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ریوڑ ہے جس میں کوئی نظم نہیں۔ ایک بھیڑ ہے جس میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہر فرد آپ ہی اپنا لیڈر اور اپنا پیرو ہے۔ انجمنیں اور جمعیتیں ہزاروں ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ایک ہی انجمن کے ارکان باہم برسرپیکار ہو جاتے ہیں اور علانیہ ایک دوسرے کے مقابلے پر آتے ہیں۔ اول اول ان کو اپنی اُس طاقت کا گھمنڈ تھا جو کبھی ان میں پائی جاتی تھی، مگر ہمسایہ قوموں نے دس سال کے اندر ان کو بتا دیا کہ طاقت کس چیز کا نام ہے۔ یہ آپس میں لڑتے رہے اور وہ منظم ہوگئیں ——— انہوں نے خود اپنے سرداروں میں سے ایک ایک کو کھینچ کر زمین پر گرا دیا، اور انہوں نے ایک سردار کی اطاعت کرکے اسے تمام ملک میں بے تاج ——— کا بادشاہ بنا دیا ——— یہ اپنی قوتوں کو خود اپنی تخریب میں ضائع کرتے رہے اور وہ حکومت سے پیہم مقابلہ کرکے اپنا زور بڑھاتے رہے ——— ——— انہوں نے ملک کے تازہ انتخابات میں شخصی اغراض کو سامنے رکھا اور بیسیوں پارٹیاں بن کر اسمبلیوں میں پہنچے۔ انہوں نے اجتماعی اغراض کو مقدم رکھ کر تمام ملک میں منضبط جدوجہد کی اور ایک مستحکم جمعیت کی شکل میں حکومت کے ایوانوں پر قبضہ کر لیا۔ ان نتائج کو دیکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں پر اب وہی اثر ہو رہا ہے جو ایک باقاعدہ فوج کو دیکھ کر منتشر انبوہ پر ہوا کرتا ہے۔ ایک منظم جماعت کی کامیابیوں سے وہ مرعوب ہوگئے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کا اقتدار اب بہت جلدی انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر اس نئی جماعت کے ہاتھ میں آنے والا

ہے۔ لہٰذا اب وہ سمت قبلہ بدلنے کی تیاریاں کر رہے۔ ان سجدوں کا رخ وائسریگل لاج سے ہٹ کر آنند بھون کی طرف پھرنے لگا ہے اور آج نہیں تو کل پھر کر رہے گا ۔

آنے والے انقلاب کی نوعیت

یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن ۔ اب دیکھئے کہ جو انقلاب آ رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے ۔

اب تک ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں رہی ہے ۔ جو اس ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کے اثرات تو وہ تھے جو اوپر آپ نے دیکھ لئے ۔ اب جو جماعت برسر اقتدار آ رہی ہے وہ ملک کی آبادی کا سواد اعظم ہے ۔ گذشتہ ڈھائی سو برس میں مسلمانوں نے جو زنانہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجئے کہ اس قوم کو جدید ہندی قومیت میں جذب ہوتے کتنی دیر لگے گی ۔

جدید ہندی قومیت کا لیڈر وہ شخص ہے جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے ہر اس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو ، اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا ۔ یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے ۔ اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں ۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں ، بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی حیثیت سے ہندوستانی

وطن پرست، اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور تہذیبی حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے؟

مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کی عمریں عوام کی رہنمائی اور اقوام کی نبض شناسی میں گذری ہیں ان سے یہ راز کب تک چھپا رہ سکتا تھا کہ اس قوم کا شیرازۂ قومیت بڑی حد تک بکھر چکا ہے۔ وہ خصوصیات اس سے فنا ہو رہی ہیں جو کسی جماعت کو ایک قوم بناتی ہیں اور اب اس کے افراد کسی دوسری قومیت میں جذب ہونے کے لئے کافی حد تک مستعد ہو چکے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی بنا پر اب یہ اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرنے کے بجائے ان کے افراد کو خطاب کیا جائے اور ان کو جدا جدا اکائیوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچا جائے۔ یہ کس چیز کی تمہید ہے؟ جس شخص کو اللہ نے تھوڑی سی بصیرت بھی عطا کی ہے وہ اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ مسلمان انگریزی اقتدار کے زمانہ میں جس کیرکٹر کا اظہار کرتے رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ کیا اسمبلیوں کی نشستوں اور آئندہ معاشی اور سیاسی فائدوں کا لالچ ان کے افراد کو فوج در فوج اس طرف کھینچ کر نہ لے جائے گا جس طرف انہیں کھینچا جا رہا ہے؟ اور کیا یہ وہی سب کچھ نہ کریں گے جو انگریزی اقتدار کی غلامی میں کر چکے ہیں؟ مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ آپ نے سنا کہ انہیں کھینچنے کے

لئے جو صدا بلند کی جا رہی ہے وہ کون سی صدا ہے ؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے اُن سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے ؟ اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے اور ڈاڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا ؟ اس میں آخر کون سی اہمیت ہے ؟ اصلی سوال تو پیٹ کا سوال ہے ۔ اسی سوال کو حل کرنے کے لئے ہم اٹھے ہیں ۔ اب اگر وہریت اور کمیونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا ہر نوالے کے ساتھ پیٹ میں اُتر جائے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ۔ جو قوم اس سے پہلے انہی نوالوں کے ساتھ الحاد اور نیچریت کا زہر بھی اتار چکی ہے ۔ اس کے حلق میں ویسی ہی چند اور چٹنیاں کیوں پھنسنے لگیں ۔

جدید انقلابی دَور کی ابتدائی علامتیں

اس نوعیت کا ہے وہ انقلاب جو اب آ رہا ہے ۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں ۔ ان کی صورتیں ، ان کے لباس ، ان کی بات چیت ، ان کی چال ڈھال ، ان کے آداب و اطوار ، ان کے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہوگا ۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ منزل کے بجائے شری ئیت اور رسموں کے بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہونے لگی ہیں ۔ گڈ مارننگ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا جانے لگا ہے ۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ لے رہی ہے اور بعض علمائے دین فتوے دے رہے ہیں کہ یہ تشبّہ کی تعریف سے

خارج ہے۔ غرض دماغ اور دل اور جسم سب اپنا رنگ بدل رہے ہیں اور گویا
فِتْنَۃً لِّلْخَاسِئِیْنَ کی لعنت جو ان پر ستر سال پہلے نازل ہوئی تھی اب ایک
دوسری شکل اختیار کر رہی ہے ۔

انقلاب کی تیز رفتاری

دُنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے اور روز بروز تیز ہوتی چلی جا رہی ہے

پہلے جو تغیرات صدیوں میں ہوتے تھے، اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں۔ پہلے انقلاب بیل گاڑیوں اور ٹٹوؤں پر سفر کیا کرتا تھا، اب ریل اور تار اور اخبار اور ریڈیو پر حرکت کر رہا ہے۔ آج وہ حالت ہے کہ

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اگر ہندوستان کے باہر کوئی اچانک واقعہ نہ بھی پیش آیا تب بھی اس متوقع انقلاب کے رونما ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی۔ اور اگر کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جو قضائے مبرم کی طرح دُنیا کے سر پر لٹک رہی ہے تو غالباً فیصلہ کا وقت اور بھی زیادہ قریب آجائے گا ۔

حالات کا جائزہ اور آئندہ کے امکانات

پچھلے مضمون میں ہم نے محض سرسری طور پر مسلمانوں کو اس انقلاب سے آگاہ کیا تھا جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے۔ اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں ـــــ ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس نئے آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی قومی تہذیب کی حفاظت کے لئے تیار کرنا ہے۔ مگر یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن اور اس جدید انقلاب کی نوعیت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں، اور یہ نہ جان لیں کہ اس پوزیشن میں اس نوعیت کا انقلاب ان کی قومیت اور ان کی قومی تہذیب پر کس طرح اثر انداز ہوگا اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی چار بنیادی کمزوریاں

پچھلی صحبت میں ہم مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن پر ایک سرسری تبصرہ کر چکے ہیں جس سے اجمالاً آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اجتماعی حیثیت سے اس وقت مسلمانوں میں کس قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن آگے جو کچھ ہم کو کہنا ہے اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ واضح طور پر ان چار اہم ترین کمزوریوں سے واقف ہو جائیں جو مسلمانوں کی قومی طاقت کو گھن کی طرح کھا گئی ہیں

اور درحقیقت انہی کی وجہ سے یہ سوال پیدا بھی ہوا ہے کہ آنے والے انقلاب میں کیا مسلمان اپنی اسلامی قومیت اور اپنی اسلامی تہذیب کی حفاظت کر سکیں گے؟ ورنہ اگر یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو کسی مسلمان کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا

پہلی اور اہم ترین کمزوری

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سواد اعظم اپنی قومی تہذیب اور اس کی امتیازی خصوصیات سے ناواقف ہے حتّٰی کہ اس میں اُن حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تربیت اور جماعت کا ڈسپلن تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔ ان کے افراد منتشر طور پر ہر قسم کے بیرونی اثرات قبول کر رہے ہیں اور جماعت اپنی کمزوری کی بنا پر بتدریج ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے ــــــ ان کا قومی کیرکٹر اب مردانہ کیرکٹر نہیں رہا، بلکہ زنانہ کیرکٹر بن گیا ہے جس کی نمایاں خصوصیت تأثر اور انفعال ہے ــــــ ہر طاقتور ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے، ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے، ان کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے، ان کے اصول حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیّر و تبدل کر سکتا ہے۔ اول تو وہ اتنا علم ہی نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو قبول نہیں کر سکتے۔ دوسرے ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آتی اور گرد و پیش میں پھیل

جاتی ہے، تو خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو، یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال ہی دیتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ نظام جماعت حد سے زیادہ مضمحل ہو چکا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدود اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے، یا اپنے دائرے میں غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکے۔ افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے۔ پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، پھر دیکھتے دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

دوسری کمزوری

انفرادیت اور لامرکزیت کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے شیرازۂ قومیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اور اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت اب ان میں نہیں پائی جاتی۔ شخصی اغراض اور ذاتی مفاد کی بنیاد پر جماعتیں بنتی ہیں اور پھر خود غرضی کی چٹان ہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے قومی کارکنوں کو اتحاد عمل اور مخلصانہ و بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد سے مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں، پیہم خطرات ان کے سامنے آئے، مگر کوئی ایک چیز بھی ان کو اشتراک عمل کے لئے جمع نہ کر سکی۔ تازہ ترین واقعہ مسجد شہید گنج کا ہے جس نے اس قوم کی کمزوری کا راز اپنوں سے زیادہ غیروں پر فاش کر دیا۔ ان کے اندر اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی

مصیبت پیش آتی ہے تو تڑپ اُٹھتے ہیں، مگر وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں جنکی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لئے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کر سکیں، ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لئے اپنے ذاتی مفاد اپنی ذاتی رائے اپنی آسائش، اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں ×

تیسری کمزوری

افلاس، جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت اور بندۂ نفس بنا دیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام و نمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتّوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں، اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت، اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی خدمت بجا لانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہاں کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا، آج اتنا سستا ہو گیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے، ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہو سکتا ہے، ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جا سکتا ہے، اک ذرا سی شہرت و ناموری عطا کر کے اور دو چار جئے کے نعرے لگا کر اس کو خرید لیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے

جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لئے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار ان کو مل گئے، جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے، حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود رہے تو جس طرح چھ ہزار میل دور کے رہنے والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ رہنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بُری نہ معلوم ہو تو ہم صاف کہہ دیں کہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پرانی مارکٹ میں جب سے سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے — ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبانوں سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں، متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں اور یہ آوازیں سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر ہی نہیں ہے، تو ہمارا حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ کچھ اسی نوعیت کی آوازیں اس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکار برطانیہ کی غلامی کا زرین پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔

چوتھی کمزوری

ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے اور اس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بکثرت اشخاص، تعلیم یافتہ، صاحب قلم، صاحب زبان، صاحب مال و زر، صاحب اثر اشخاص ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی

تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں، مگر اس سے برأت کا صریح اعلان نہیں کرتے، اس لئے مسلمان ان کے ناموں سے دھوکہ کھا کر انہیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں، اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر اور رہ بس کر زہر پھیلانے کا موقع دے رہے ہیں۔ نفاق کا خطرہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ رہا ہے۔ مگر اس نازک زمانہ میں تو یہ ہمارے لئے پیام موت ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھئے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں، مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان میں بے دینی اور بے حیائی اور قانون اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھیں گے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے کہیں سے نکلی ہو، اس کو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لیتا ہے، اور اسلامی قومیت کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے اس کو اپنا کام کرنے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔

یہ حالت ہے اس وقت ہماری قوم کی، اور اس حالت میں یہ ایک بڑے انقلاب کے سرے پر کھڑی ہے۔ انقلاب کی فطرت، بحرانی اور طوفانی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح آتا ہے۔ اس کے زور کا مقابلہ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو مضبوط

بھی بھری چٹانیں ہی کر سکتی ہیں ـــــ بوسیدہ عمارتیں جو اپنی جڑ چھوڑ کر محض فضا کے سکون و جمود کی بدولت کھڑی ہوں، ان کا کسی انقلابی طوفان میں ٹھیرنا غیر ممکن ہے۔ اب جو کوئی صاحب بصیرت انسان اس وقت مسلمانوں کی حالت پر نگاہ ڈالے گا۔ وہ بیک نظر معلوم کر لے گا کہ ان کمزوریوں کے ساتھ یہ قوم ہرگز کسی انقلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے انقلابی دور میں اپنے قومی تشخص اور اپنی قومی تہذیب کے خصائص کو بچالے جانا اور اپنے حقوق کو پامالی سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے اول تو وہ جہالت کی بنا پر وہ بہت سے اجنبی اثرات کو بے جانے بوجھے قبول کر لے گی۔ پھر زنانہ کیرکٹر اس کو بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر کر دے گا جن کو وہ جانتی ہوگی کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تہذیب کے منافی ہیں۔ اس طرح ایک بڑی حد تک تو بلا مقابلہ ہی شکست واقع ہوگی۔ اس کے بعد جو تھوڑے بہت احساسات باقی رہ جائیں گے وہ اگر کسی شدید حملے پر بیدار بھی ہوئے، اور اس قوم نے اپنے حقوق کی حفاظت کرنی بھی چاہی، تو نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اپنی بدنظمی اور انتشار کی بدولت اس کے لئے کوئی متحدہ جدوجہد کرنا مشکل ہوگا۔ اور اسی کے گروہ سے ہزاروں لاکھوں خائن، غدار اور منافق اس کے قومی حقوق کو پامال کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جدید انقلابی قوتوں پر ایک نظر

مسلمانوں کی حالت کا جائزہ آپ لے چکے۔ اب آئندہ انقلاب کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان قوتوں کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو اس انقلابی تحریک

میں کام کر رہی ہیں ۔

ہندوستان کی جدید وطنی حرکت در اصل نتیجہ ہے اُس تصادم کا جو انگریزی اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں ہے بلکہ فکری اور عمرانی بھی ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ فکری و عمرانی تصادم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ سیاسی تصادم کے نتیجہ سے بالکل برعکس ہے۔ انگریزی سیاست کے جور و استبداد اور معاشی لُوٹ نے تو ہندوستان کے باشندوں کو آزادی کا سبق دیا اور ان میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ بندِ غلامی کو توڑ کر پھینک دیں۔ لیکن انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و تمدن نے ان کو پوری طرح مغرب کا غلام بنا دیا، اور ان کے دماغوں پر اتنا زبردست قابو پا لیا کہ اب وہ زندگی کا کوئی نقشہ اُس نقشہ کے خلاف نہیں سوچ سکتے جو ان کے سامنے اہل مغرب نے پیش کیا ہے۔ وہ جس قسم کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد ہو، اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور اپنے وسائل معیشت کو خود اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے۔ لیکن یہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر کے انتظام اور اپنی زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں ہے وہ از سرتا پا فرنگی ہے۔ ان کے پاس جتنے اجتماعی تصورات ہیں، جس قدر عمرانی اصول ہیں، سب کے سب مغرب سے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر فرنگی نظر ہے، ان کے دماغ فرنگی دماغ ہیں، انکی ذہنیت پوری طرح فرنگیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بلکہ انقلابیت کے بُحران نے ان کو (یا کم از کم ان کے سب سے زیادہ پرجوش طبقوں کو) فرنگیوں میں سے بھی

اُس قوم کا متبع بنا دیا ہے جو انتہا پسندی میں تمام فرنگی اقوام کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ وہ پکے مادہ پرست ہیں۔ ان کی نگاہ میں اخلاق و روحانیت کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کو خدا پرستی سے نفرت ہے۔ مذہب کو وہ شر و فساد کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو وہ پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑ ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ رواداری جو مذہب کے ساتھ برت سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کو اپنی عبادت گاہوں اور اپنے مراسم میں جینے دیں۔ باقی رہی اجتماعی زندگی تو اس میں مذہب اور مذہبیت کے ہر اثر کو مٹانا ان کا نصب العین ہے اور ان کے نزدیک اس اثر کو مٹائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیش نظر ہے۔ اس میں مذہبی جماعتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو، اور وہ طرز اپنے اصول و فروع میں خالص مغربی ہو۔

کمزوریوں کے ساتھ انقلابی تحریک میں شریک ہونیکے نتائج

چونکہ اس جماعت کے مقاصد میں سیاسی آزادی کا مقصد سب سے مقدم ہے، اور وہی اس وقت حالات کے لحاظ سے نمایاں ہو رہا ہے، اس لئے مسلمانوں کے آزادی پسند طبقے اس کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز کی غلامی ہندوستان کے تمام باشندوں کے لئے ایک مشترک مصیبت ہے۔

اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے مشترک جدوجہد کرنا ہر آئینہ معقول ہے۔ اور جو گروہ اس جدوجہد میں سب سے زیادہ سرگرم ہو اس کی طرف دلوں کا مائل ہونا، اور اس کے ساتھ شریک عمل ہو جانا بظاہر ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے علماء اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک بڑی جماعت اور مخلص جماعت کانگریس کی طرف جا رہی ہے اور عامۂ مسلمین کو بھی ترغیب دے رہی ہے کہ اس میں شریک ہو جائیں۔ لیکن عمل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لینا چاہئے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی جو کمزوریاں ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ جب یہ قوم کانگریس میں شریک ہوگی اور اس کے عوام سے کانگریسی کارکنوں کا رابطہ قائم ہوگا تو آزادیٔ وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ اور کس کس قسم کی تحریکیں ان کے درمیان پھیلیں گی۔ کس کس طرح مسلمانوں کے عوام اُن اجتماعی نظریات، اُن ملحدانہ افکار اور ان غیر اسلامی طریقوں سے متاثر ہوں گے جو اس جماعت میں شائع و ذائع ہیں کس طرح اسلامی جماعت کے رگ و ریشہ میں اُس فکری و عمرانی انقلاب کے عناصر پھیلائے جائیں گے جو سیاسی انقلاب کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ کس طرح مسلمانوں کے اندر ایک ایسی رائے عام تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علی رغم الفِ علماء وزعماء جدید ترین مغربی واشتراکی بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کے ہر نقشہ کی تائید کرنے والی ہو۔ کس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے خود مسلمانوں کی جماعت سے وہ لوگ تیار کئے جائیں گے جو اسلامی کلچر کے خلاف ہر قسم کے طریقے رائج کرنے

اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے میں حصہ لیں گے۔ ان حالات میں آپ کے پاس کونسی قوت ہے جس سے آپ اپنی قوم کو قابو میں رکھ سکیں گے؟ آپ نے اپنے عوام کو اسلامی تہذیب کے حدود میں رکھنے کا کیا بندوبست کیا ہے؟ آپ نے ان کو غیر اسلامی اثرات سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ آپ نے اپنے غداروں اور منافقوں کے فتنے کا کیا علاج سوچا ہے؟ آپ کے پاس یہ اطمینان کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ کسی ضرورت کے موقع پر آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو جمع کر سکیں گے اور ان کی متحدہ طاقت آپ کی پشت پر ہو گی؟

باطل کی جگہ باطل قائم کرنا مسلمان کا کام نہیں

انگریز کے اقتدار کا خاتمہ کرنا یقیناً ضروری ہے، بلکہ فرض ہے۔ کوئی سچا مسلمان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہو گا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ چاہے گا کہ ہندوستان انگریز کے پنجۂ استبداد میں رہے۔ لیکن آزادی کے جوش میں یہ نہ بھول جائیے کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت میں مسلمان کا نظریہ ایک وطن پرست کے نظریہ سے بالکل مختلف ہونا چاہیئے۔ اگر آپ کو انگریز سے اس لئے عداوت ہے کہ وہ انگریز ہے، چھ ہزار میل دُور سے آیا ہے، آپ کے وطن کا رہنے والا نہیں ہے، تو یہ اسلامی عداوت نہیں بلکہ جاہلی عداوت ہے۔ اور اگر آپ اُس سے اس لئے عداوت رکھتے ہیں کہ وہ غیر صالح ہے، ناجائز طریقہ سے حکومت کرتا ہے، عدل کے بجائے جور پھیلاتا ہے، اصلاح کے بجائے افساد

کرتا ہے، تو یہ بلاشبہ اسلامی عداوت ہے۔ لیکن اس لحاظ سے آپ کو دوستی اور دشمنی کا معیار اصول کو قرار دینا پڑے گا، نہ کہ وطنیت کو۔ جو کچھ انگریز کرتا ہے اگر وہی کچھ دوسرے کریں تو آپ محض اس بنا پر ان کی حمایت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مسلمان کی نگاہ میں وطنی اور غیر وطنی کوئی چیز نہیں۔ وہ غیر ملک کے صُہیب اور سلمان کو گلے لگا سکتا ہے مگر اپنے وطن کے ابوجہل اور ابولہب سے دوستی نہیں کر سکتا۔ پس اگر مسلمان ہیں تو وطنیت کے ڈھنگ پر نہ سوچیے بلکہ حق پرستی کے ڈھنگ پر سوچیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا ضرور آپ کا فرض ہے، مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار بننا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی بنیاد اُنہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپ کا کام باطل کو مٹا کر حق کو قائم کرنا ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔ آپ انگریزی حکومت کے خلاف ہر اس گروہ سے موالات کیجیے جو اس کو مٹانا چاہتا ہو۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک عادل حکومت قائم کرنے کے لئے آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟ کون سی طاقت آپ نے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت کی تشکیل حق کے اصولوں پر کرا سکیں؟ یہ نہیں تو جانے دیجئے۔ کہ آپ نے خود اپنی قوم کو باطل کے اثرات سے بچانے کا کیا بندوبست فرمایا ہے؟

کیا آئینی ضمانتیں اور تحفظات کافی ہو سکتے ہیں؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لئے آئینی

ضمانتیں لیں گے ۔ ہم دستورِ اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے ہمارے حقوق پر آنچ نہ آنے پائے ۔ بلاشبہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں ۔ مگر شائد آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آئینی ضمانتیں اور دستورِ اساسی کے تحفظات اور دوسرے تمام کاغذی مواثیق صرف اُسی قوم کے لئے مفید ہو سکتے ہیں جس میں ایک طاقتور رائے عام موجود ہو، جو اپنے حقوق کو سمجھتی ہو، اپنی تہذیب کو جانتی ہو، اس کی خصوصیات کو پہچانتی ہو، اس کی حفاظت کا ناقابلِ تسخیر ارادہ رکھتی ہو، اور منفرداً و مجتمعاً اس کی طرف سے مدافعت کے لئے ہر وقت سینہ سپر ہو ۔ یہ صفات اگر آپ کی قوم میں موجود ہیں تو آپ کو کسی آئینی ضمانت اور کسی دستوری تحفظ کی بھی ضرورت نہیں ۔ اور اگر آپ کی قوم ان صفات سے عاری ہے تو یقین رکھئے کہ کوئی ضمانت اور کوئی تحفظ ایسی حالت میں کارآمد نہیں ہو سکتا ۔ آپ دستورِ اساسی کی ضمانتوں کو زیادہ سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں ۔ مگر اندرونی انقلاب کا آپ کے پاس کونسا علاج ہے ؟ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ کل مخلوط تعلیم شروع ہوتی ہے اور آپ کی قوم کے افراد خود اپنی مرضی سے دھڑا دھڑ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو مخلوط مدارس میں بھیجتے ہیں ۔ کونسا دستوری تحفظ اس تحریک کو اور اس کے زہریلے نتائج کو روکنے کے لئے استعمال کیا جائے گا ؟ فرض کیجئے کہ سول میرج کے طریقہ پر مخلوط نکاحوں کا رواج پھیلتا ہے اور آپ کی قوم خود اس تحریک سے متاثر ہو جاتی ہے ۔ کونسی آئینی ضمانت اس کی روک تھام کر سکے گی ؟ فرض کیجئے کہ آپ کی اپنی قوم میں پروپیگنڈا کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو ـــــ آپ کی اپنی

قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصول اسلام کے خلاف ہوں۔ خود آپ ہی کے ووٹوں کی اکثریت سے ایسی تجویزیں پاس ہو جاتی ہیں جو آپ کے تمدن کو اسلامی مناہج سے ہٹا دینے والی ہوں۔ وہ کونسے "بنیادی حقوق" ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ ان چیزوں کو منسوخ کرا سکیں گے؟ فرض کیجئے کہ آپ کی قوم بتدریج ہمسایہ اقوام کے طرز معاشرت، آداب و اطوار، عقائد و افکار کو قبول کرنا شروع کرتی ہے اور اپنے قومی امتیازات کو خود بخود مٹانے لگتی ہے۔ کونسا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کر سکے گا؟ آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تمہارے خیالی مفروضات ہیں۔ اس لئے کہ جو مسلمان اس وقت وطنی تحریک میں شریک ہیں ان کے نمونے آپ کے سامنے موجود ہیں۔ دیکھ لیجیے کہ ان کا طرز عمل انگریزوں کے غلاموں سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ وہی ذہنی غلامی، وہی زنانہ انفعال و تاثیر، وہی انجذابی کیفیت یہاں بھی نمایاں ہے جو آستانہ فرنگ کے طائفین و عاکفین میں نظر آتی ہے۔ پھر جب اپنی قوم کی کمزوری اور اس کی موجودہ مزاجی کیفیت کے یہ کھلے ہوئے علائم و آثار آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو آخر کس بھروسہ پر آپ ساری قوم کو ادھر لے جانا چاہتے ہیں؟ فرمائیے تو سہی کہ آپ نے باطنی انقلاب اور تدریجی انجذاب کو روکنے کے لئے کونسا تحفظ فراہم کر رکھا ہے؟

عوام کا جمود اور سیاسی جماعتوں کی بے راہ رویاں

مسلمانوں میں اس وقت زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ

آزادی وطن کے لئے بے چین ہے اور کانگریس کی طرف کھنچ رہا ہے یا کھنچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لئے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا معاون بن کر آزادی کی تحریک کو روکے۔ تیسرا گروہ عالم حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کے ساتھ واقعات کی رفتار کو دیکھ رہا ہے:

ہمارے نزدیک یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی ہم نے اوپر واضح کر دی۔ دوسرے گروہ کی غلطی بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی غیروں کے سہارے سے ہو جائے گی۔ ایسی ذلیل پالیسی دُنیا میں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ جو قوم خود زندہ رہنے کی طاقت نہ رکھتی ہو، جس میں خود اپنے وجود اور اپنے حقوق کی حفاظت کا بل بوتا نہ ہو، وہ کب تک دوسروں کے سہارے پر جی سکتی ہے؟ کب تک کوئی سہارا اس کے لئے قائم رہ سکتا ہے؟ کب تک زمانے کے انقلابات اس کی خاطر رُکے رہ سکتے ہیں؟ انگریز قیامت تک کے لئے ہندوستان پر حکومت کرنے کا پٹہ لکھوا کر نہیں لایا ہے۔ ہر قوم کے لئے ایک مدت ہوتی ہے۔ انگریز کے لئے بھی بہرحال ایک مدت ہے، اور وہ آج نہیں تو کل پوری ہوگی۔ اس کے بعد وہی قوم برسراقتدار آئے گی جس میں ہمت اور طاقت ہوگی، حاکمانہ اوصاف ہوں گے، عزائم اور حوصلے ہوں گے، صلابت اور عصبیت ہوگی۔ اگر تم میں یہ اوصاف ہوں تو وہ قوم تم ہو سکتے ہو۔ اور اگر تم ان سے عاری ہو تو بہرحال تمہاری قسمت میں محکومی کی ذلت اور ذلت

کی موت ہی ہے۔ جو گھن کھائی ہوئی لاش کسی عصا کے سہارے پر کھڑی ہو وہ ہمیشہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ عصا کبھی نہ کبھی ہٹ کر رہے گا۔ اور لاش کبھی نہ کبھی گر کر رہے گی +

تیسرے گروہ کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دُنیا ایک عرصۂ جنگ ہے جس میں تنازع للبقا کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معرکہ میں اُنکے لئے کوئی کامیابی نہیں جو زندہ رہنے کے لئے مقابلہ اور مزاحمت کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک دور کے خاتمہ اور دوسرے دور کے آغاز کا وقت تو قوموں کی قسمتوں کے فیصلہ کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت پر سکون اور جمود کے معنی ہلاکت اور موت کے ہیں۔ اگر تم خود ہی مرنا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو اور اپنی موت کی آمد کا تماشہ دیکھے جاؤ۔ لیکن اگر زندہ رہنے کی خواہش ہے تو سمجھ لو کہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سستی رفتار کا زمانہ نہیں ہے۔ صدیوں کے تغیرات اب مہینوں اور برسوں میں ہو جاتے ہیں۔ جس انقلاب کے سامان اس وقت ہندوستان اور ساری دُنیا میں ہو رہے ہیں وہ طوفان کی سی تیزی کے ساتھ آرہا ہے۔ اب تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کی مہلت ہے۔ اگر اس مہلت میں تم نے اپنی کمزوریوں کی تلافی نہ کی اور زندگی کی طاقت اپنے اندر پیدا نہ کی تو پھر کوئی دوسری مہلت تمہیں نہ ملے گی۔ اور تم وہی سب کچھ دیکھو گے جو دوسری کمزور قومیں اس سے پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اللہ کا کسی قوم کے ساتھ رشتہ نہیں ہے کہ وہ اُس کی خاطر اپنی سنت کو بدل ڈالے +

جمود بہرحال ٹوٹنا چاہیئے۔ حرکت کی ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں۔ حکمت اور تدبر کے ساتھ حرکت ہونی چاہیئے۔ خصوصاً نازک اوقات میں تو حرکت بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں جا گرنے کے ہیں۔ یہ اندھے جوش اور ابلہانہ شتاب روی کا وقت نہیں۔ قدم اٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر سوچئے کہ قدم کس سمت میں اٹھانا چاہیئے؟ آپ کی منزل مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف جانے کا صحیح راستہ کونسا ہے؟ اس راستہ پر چلنے کے لئے آپ کو کس سامان کی ضرورت ہے؟ کن کن مرحلوں سے آپ کو گذرنا ہوگا؟ اور ہر مرحلے سے بسلامت گذر جانے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی؟

ہمارا سیاسی نصب العین

کسی راستہ پر چلنے سے پہلے منزل مقصود کا تعین ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ حرکت اور سفر کو بذات خود تو مقصود نہیں بنایا جاسکتا۔ کم ازکم ذی عقل و ہوش انسانوں کے لئے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ محض چلنے کی خاطر چلیں اور منتہائے نظر کوئی نہ ہو۔ لہذا مسلمانوں کے تمام سوچنے والے لوگوں کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہئے کہ ان کا منتہائے نظر یا نصب العین کیا ہے۔ اس کے بعد طریق کار اور راہ عمل کا انتخاب زیادہ آسان ہو جائے گا، کیونکہ جب وہ مقام متعین ہو جس تک ہمیں جانا ہے، تو وہ راستہ بڑی آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے جو اس مقام تک پہنچنے کا سب سے زیادہ سیدھا اور سب سے زیادہ اقرب راستہ ہو۔

عام طور پر آزاد خیال مسلمان اپنی "قوم پرستی" کی نمائش کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ ہمارا نصب العین ہندوستان کی کامل آزادی ہے۔ لیکن یہ بات عموماً بغیر سوچے سمجھے کہہ دی جاتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری منزل مقصود محض آزادی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی آزادی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے، بلکہ عزت اور طاقت والا بن جائے۔ آزادی ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اس اصل مقصد کے لئے ایک ضروری اور

ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے۔ ہم صرف اُس آزادی کے لئے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ملک کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مداہنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے، اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام، قطعی حرام ہے۔

یہ ایسی صاف بات ہے جس میں دو رائیں ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ خصوصاً جو شخص قرآن اور سنت پر نظر رکھتا ہے اور منافق نہیں ہے وہ تو اس کے برحق ہونے میں چون وچرا نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں آزادیٔ مسلم کا کم سے کم مرتبہ

منزلِ مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیتہً دارالاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اس کا قصد کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ خیر جانے دیجئے اس کو ——— اس سے فروتر درجے میں جس مقصد کے لئے ہم کو لڑنا چاہئے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو بیرونی کفار کے تسلط میں رہے اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دارالاسلام بن جائے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجئے کہ شبہ دارالاسلام سے

کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں کی نشستیں اور سرکاری عہدے مل جائیں اور ہندوستان کے معاشی ثمرات میں ان کو بھی متناسب حصہ ملے، اور آزاد ہندوستان کی تمام عمرانی ترقیات سے (خواہ وہ ترقیات کسی صورت میں ہوں) انہیں بلا امتیاز مستفید ہونے کا موقع ملے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پہ ہے۔ ہم جس چیز کو شبہ دارالاسلام سمجھتے ہیں، اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "مسلمان" ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں اور ہمارا یہ حصہ اس حد تک طاقت ور ہو کہ:-

(۱) ہم اپنی قوم کی تنظیم اصول اسلامی کے مطابق کر سکیں یعنی ہم کو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کے لئے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں، ان کے اندر غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنے کی ضرورت سمجھیں ان کو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضاء شرعی کا قیام، قوانین معاشرت کی اصلاح وغیرہ +

(۲) ہم اس ملک کے نظم و نسق اور اس کی تمدنی و معاشی تعمیر جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصول تمدن و تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانہ پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی اور معاشی تنظیم اور تدبیر مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کرے گی اس کا اثر دوسرے

قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑے گا۔ اگر یہ تعمیر جدید اُس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول و فروع میں کلیتہً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے ناگزیر ہو جائیگا کہ یا تو ہم تمدن و معیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں، یا پھر ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی و معاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہند جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کے ساتھ ڈال سکیں۔

(۳) ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس ملک کی طاقت کسی حال میں بیرون ہند کی مسلمان قوموں کے خلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

کانگریس کے "بنیادی حقوق" ہمارے منتہائے نظر نہیں ہو سکتے

یہ مقصد جس کی ہم نے توضیح کی ہے وہ کم سے کم چیز ہے جس کے لئے ہم کو لڑنا چاہئے۔ مدافعت کا پہلو صرف کمزور اختیار کرتے ہیں اور ان کا آخری انجام شکست ہے۔ اگر آپ مقصد صرف اُن حقوق کے اصول کو بناتے ہیں جن کا اطمینان کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" والے ریزولیوشن میں دلایا ہے تو آپ دھوکے میں ہیں۔ آپ کی تہذیب، زبان، پرسنل لا، اور مذہبی حقوق کا تحفظ بھی جسے آپ کافی سمجھے بیٹھے ہیں، دراصل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ فارورڈ پالیسی اختیار کر کے حکومت کی تشکیل میں طاقت ور حصہ دار بننے کی کوشش کریں۔ اس میں

اگر آپ نے غفلت کی اور حکومت کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو یقین رکھئے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن آپ کو من حیث المسلم ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ انگریزی حکومت نے بھی آپ کے بہت سے حقوق تسلیم کر رکھے ہیں، مگر غور کیجئے، وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو خود اپنے حقوق سے دست بردار کرا دیا؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اپنی زبان میں لکھنا، پڑھنا، بولنا سب چھوڑ دو اور میری زبان اختیار کر لو؟ پھر کیا چیز ہے جس نے آپ کی قوم کے ہزاروں لاکھوں افراد کو اپنی زبان سے بیگانہ بنا دیا اور انگریزی کا اتنا غلام بنایا کہ وہ اپنے گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں تک سے انگریزی بولنے لگے؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نماز روزہ چھوڑ دو، زکوٰۃ نہ دو، شراب پیو، اور اپنے مذہب کے سارے احکام کو نہ صرف بالائے طاق رکھ دو بلکہ ان کا مذاق تک اڑاؤ۔ پھر کس چیز نے آپ کی قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ایک صدی کے اندر اپنے دین و ایمان سے عملاً منحرف کر ڈالا؟ انگریز نے آپ سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اپنی معاشرت بدل دو، اپنا لباس بدل دو، اپنے مکانوں کے نقشے بدل دو، اپنے آداب و اخلاق بدل دو، اپنی صورتیں بگاڑ دو، اپنے بچوں کو انگریز بناؤ، اپنی عورتوں کو میم صاحب بناؤ، اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے سارے اصول چھوڑ کر پوری زندگی ہمارے نقشے پر ڈھال لو۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے آپ سے سب کچھ کرا ڈالا؟ ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچئے۔ کیا اس کا سبب غیر مسلم اقتدار کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ڈھائی تین لاکھ انگریز چھ ہزار میل دور سے آتے ہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ قصداً آپ کے

اندرونی معاملات اور آپ کے تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے اقتدار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیرونی جبر سے نہیں بلکہ اندرونی انقلاب سے آپ کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور آپ خود بخود اپنے اُن بنیادی اور فطری حقوق تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں جن کو کوئی حکومت اپنی رعایا سے نہیں چھینتی اور نہیں چھین سکتی۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر آزاد ہندوستان کی حکومت غیر اسلامی نقشہ پر بن گئی اور اس کا اقتدار ان ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں، تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہ انگریزوں کی طرح قلیل التعداد بھی نہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہنے والے بھی نہیں۔ اور پھر غیر ملکی بھی نہیں ہیں کہ سیاسی پالیسی ان کو تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے روکے۔ ان کے اقتدار میں آپ کے اندرونی تحول و انقلاب کا کیا حال ہوگا اور کانسٹی ٹیوشن کی کون کون سی دفعات آپ کو اپنے حقوق کی پامالی سے روکیں گی؟

مسلمانوں کیلئے صرف ایک راستہ

پس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے لئے ایسی آزادیٔ وطن کے لئے لڑنا تو قطعی حرام ہے جس کا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندوستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدار حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لئے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں۔ اور ان کے لئے یہ بھی حرام ہے کہ اس انتقال کو روکنے کے لئے انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار

قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہم کو ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لئے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادی ہند کی تحریک کا رخ حکومتِ کفر کی طرف سے حکومتِ حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں اور اس غرض کے لئے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمربستہ ہو جائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

ہم آزادی ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے خواہشمند ہیں اور اس کے لئے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو۔ اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ "مسلم" کی نجات بھی ہو۔

راہ عمل

اب ہم کو اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قومیت کا وہ نصب العین، جس کو ہم نے اشاعت گذشتہ میں بیان کیا تھا، کس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ اس نصب العین سے کسی "مسلم" فرد یا گروہ کو اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے اس امر میں ہے کہ ہمارے لئے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اب ہمیں ان مختلف راستوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیئے جو ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے بعد راہ راست خود واضح ہو جائے گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دو حیثیتیں

ہندوستان میں ہماری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ہمارے ہندوستانی ہونے کی ہے، اور دوسری حیثیت "مسلمان" ہونے کی۔

پہلی حیثیت میں ہم اس ملک کی تمام دوسری قوموں کے شریک حال ہیں۔ ملک افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہوگا تو ہم بھی مفلس اور فاقہ کش ہوں گے۔ ملک کو لوٹا جائے گا تو ہم بھی سب کے ساتھ لوٹے جائیں گے۔ ملک میں جور وظلم کی حکومت ہوگی تو ہم بھی اسی طرح پامال ہوں گے جس طرح ہمارے اہل وطن ہوں گے۔ ملک پر غلامی کی وجہ سے بحیثیت مجموعی جتنی مصیبتیں نازل

ہوں گی، جتنی لعنتیں برسیں گی، ان سب میں ہم کو برابر کا حصہ ملے گا۔ اس لحاظ سے ملک کے جتنے سیاسی اور معاشی مسائل ہیں وہ سب کے سب ہمارے اور دوسری اقوامِ ہند کے درمیان مشترک ہیں۔ جس طرح اُن کی فلاح و بہبود ہندوستان کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح ہماری بھی ہے۔ سب کے ساتھ ہماری بہتری بھی اس پر منحصر ہے کہ یہ ملک ظالموں کے تسلط سے آزاد ہو، اس کے وسائل ثروت اسی کے باشندوں کی بہتری اور ترقی پر صرف ہوں، اس کے بسنے والوں کو اپنے افلاس اپنی جہالت، اپنی اخلاقی پستی، اور اپنی تمدنی پسماندگی کا علاج کرنے میں اپنی قوتوں سے کام لینے کے پورے مواقع حاصل ہوں، اور کوئی جابر قوم ان کو اپنی ناجائز اغراض کے لئے آلۂ کار بنانے پر قادر نہ رہے۔

دوسری حیثیت میں ہمارے مسائل کچھ اور ہیں جن کا تعلق صرف ہم ہی سے ہے۔ کوئی دوسری قوم ان میں ہماری شریک نہیں ہے۔ اجنبی استیلا نے ہمارے قومی اخلاق کو، ہماری قومی تہذیب کو، ہمارے اصولِ حیات کو، ہمارے نظامِ جماعت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر غلامی اُن تمام بنیادوں کو گھن کی طرح کھا گئی ہے جن پر ہماری قومیت قائم ہے۔ تجربے نے ہم کو بتا دیا ہے اور روزِ روشن کی طرح اب ہم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال زیادہ مدت تک جاری رہی تو ہندوستان کی اسلامی قومیت رفتہ رفتہ گھل گھل کر طبعی موت مر جائے گی، اور یہ برائے نام ڈھانچہ جو باقی رہ گیا ہے یہ بھی باقی نہ رہے گا۔ اس حکومت کے اثرات ہم کو اندر ہی اندر غیر مسلم بنائے جا رہے ہیں، ہمارے دل و دماغ کی تہوں میں وہ جڑیں سوکھتی

چلی جا رہی ہیں جن سے اسلامیت کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو وہ حشیش پلایا جا رہا ہے جو ہماری ماہیت کو بدل کر خود ہمارے ہی ہاتھوں سے ہماری مسجد کو منہدم کرا دے۔ جس رفتار کے ساتھ ہم میں یہ تغیرات ہو رہے ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے ایک مبصر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس عمل کی تکمیل اب بہت قریب آلگی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے ہمارا سوادِ اعظم خود بخود غیر مسلم بن جائے گا، اور شاذ گنتی کے چند نفوس اس عظیم الشان قوم کے مقبرے پر آنسو بہانے کے لئے باقی رہ جائیں گے۔ پس ہماری قومیت کا بقاء و تحفظ اس پر منحصر ہے کہ ہم اس حکومت کے تسلط سے آزاد ہوں، اور اُس نظامِ اجتماعی کو از سرِ نو قائم کریں جس کے مٹ جانے ہی کی بدولت ہم پر یہ مصائب نازل ہوئے ہیں ؀

آزادیٔ وطن کے دو راستے

ہماری یہ دونوں حیثیتیں باہم متلازم ہیں۔ ان کو نہ عقلاً منفک کیا جا سکتا ہے، نہ عملاً۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ آزادی ان دونوں حیثیتوں سے ہماری مقصود ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے جتنے مسائل ہمارے اور تمام دوسرے باشندگانِ ہند کے درمیان مشترک ہیں اُن کو حل کرنے کے لئے مشترک طور پر ہی جد و جہد کرنی چاہئے، اور یہ بھی سراسر درست ہے کہ مسلم ہونے کی حیثیت سے جو آزادی ہم چاہتے ہیں، وہ بھی بہرطور ہمیں اُسی

وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ ہمیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ تماثل اور توافق جو بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے، اس میں ایک بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے، اور درحقیقت اسی مقام پہ بہت سوں نے دھوکا کھایا ہے۔

غائر نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی سیدھی سڑک نہیں ہے جس پہ آپ آنکھیں بند کر کے بے تکان چلے جائیں۔ ٹھیک اسی مقام پہ جہاں آپ آکر ٹھیرے ہیں ایک دوراہہ موجود ہے۔ دو سڑکیں بالکل مختلف سمت پہ جا رہی ہیں اور آپ کو قدم اٹھانے سے پہلے عقل و تمیز سے کام لے کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جانا کدھر چاہیے۔

وطن پرستی کا راستہ ہم اختیار نہیں کر سکتے

آزادیِ وطن کا ایک راستہ وہ ہے جس کو ہم صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس راہ کے بنانے والے اور اس پہ ہندوستان کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر "وطنی قومیت" کا مغربی تصور ہے، اور اس تصور کی تہ میں انسانیت کا ہندو تصور گہرا جما ہوا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف قومی امتیازات جو مذہب اور تہذیب کی تفریق پہ قائم ہیں مٹ جائیں اور سارا ملک ایک قوم بن جائے۔ پھر اس "قوم" کی زندگی کا جو نقشہ ان کے سامنے ہے وہ اشتراکیت اور ہندویت سے مرکب ہے، اور اس میں مسلمانوں کے اصول حیات کی رعایت تو درکنار

اس کے لئے کوئی ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جس کی گنجائش وہ اس "ہندی قومیت" میں نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق انسان اور خدا کے مابین ہے ان میں ہر گروہ کو اعتقاد اور عمل کی آزادی حاصل رہے۔ مگر جو معاملات انسان اور انسان کے درمیان ہیں ان کو وہ خالص وطنیت کی بنیاد پر دیکھنا چاہتے ہیں منظم مذہب (ORGANISED RELIGION) یعنی ایسا مذہب ان کے نزدیک اصولاً قابلِ اعتراض ہے جو اپنے متبعین کو ایک مستقل قوم بناتا ہو اور اس کو تعلیم، معیشت، معاشرت، تمدن، اخلاق اور تہذیب میں دوسرے مذاہب کے متبعین سے الگ ایک ڈھنگ اختیار کرنے اور ایک ضابطہ کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ وہ ہندوستان کے موجودہ حالات کی رعایت ملحوظ رکھ کر کچھ مدت تک اس قسم کے "منظم مذہب" کو ایک محدود اور دھندلی سی شکل میں باقی رکھنا گوارا کریں گے، چنانچہ اسی گوارا کر لینے کے انداز میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو انکی زبان اور "پرسنل لا" کے تحفظ کا یقین دلایا ہے، مگر وہ کسی ایسے نظام کو برداشت نہیں کر سکتے جو اس "منظم مذہب" کو مزید طاقت اور مستقل زندگی عطا کرنے والا ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوستانِ جدید کی تعمیر اس طرز پر کرنا چاہتے ہیں جس میں یہ "منظم مذہب" رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر طبعی موت مر جائے اور ہندوستان کی ساری آبادی ایک ایسی قوم بن جائے جس میں سیاسی پارٹیوں، اور معاشی گروہوں کی تفریق تو چاہے کتنی ہی ہو، مگر تعلیم و تہذیب، تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور تمام دوسری حیثیات سے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، اور وہ رنگ فطرۃً وہی ہونا چاہئے

جواس تحریک کے محرکوں کا رنگ ہے۔

یہ راستہ جس کی خصوصیات کو آج ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، ہم صرف اُسی وقت اختیار کر سکتے ہیں جب کہ ہم اپنی دوسری حیثیت کو قربان کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اس راستہ پر چل کر ہم کو وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جو ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے درکار ہے، بلکہ اس راستہ میں سرے سے ہماری یہ حیثیت ہی گم ہو جاتی ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا ہے وہ ہندوستانی حکومت کے ماتحت اور زیادہ شدت و سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچے اور اس کی تکمیل میں ہم خود مددگار بنیں اور وہ اتنا مکمل انقلاب ہو کہ پھر اس کے ردّعمل کا کوئی امکان نہ رہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے مغربی تہذیب میں خواہ ہم کتنے ہی جذب ہو جائیں، بہرحال انگریزی قومیت میں جذب نہیں ہو سکتے۔ بہرحال ہمارا ایک الگ اجتماعی وجود باقی رہتا ہے جس کا پھر اپنی سابقہ صورت پر واپس ہونا ممکن ہے۔ لیکن یہاں تو صورت حال ہی دوسری ہے۔ ایک طرف ہمارے ہر امتیازی نشان، حتیٰ کہ ہمارے احساس قومیت تک کو فرقہ پرستی (COMMUNALISM) قرار دے کر اس کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈا کیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مستقل جماعت (COMMUNITY) کی حیثیت سے ہمارا وجود ناقابل برداشت ہے۔ دوسری طرف ہماری قوم کے ان لوگوں کو قوم پرست (NATIONALISTS) کہا جاتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں، "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے ہیں، مندروں میں پہنچ کر عبادت تک میں حصہ

لے گذرتے ہیں، اپنی صورتوں اور لباسوں میں پورا ہندویت کا رنگ اختیار کرتے ہیں، اور مسلمان قوم کے مفاد کا نام تک لیتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے کہ مبادا ان پر فرقہ پرستی (COMMUNALISM) کا الزام نہ آجائے جو ان کے نزدیک کفر کے الزام سے زیادہ بدتر ہے۔ تیسری طرف ہم سے صاف کہا جاتا ہے کہ ایک جماعت بن کر نہ آؤ بلکہ افراد بن کر آؤ اور سیاسی پارٹیوں میں، مزدور اور سرمایہ دار کی تفریق میں، زمیندار اور کسان کی تقسیم میں، زر والے اور بے زر کے تنازع میں منقسم ہو جاؤ۔ بالفاظ دیگر اس رشتے کو خود ہی کاٹ دو جو مسلم اور مسلم میں ہوتا ہے، اور اس رشتہ میں بندھ جاؤ جو ایک پارٹی کے مسلم و غیر مسلم ممبروں میں ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہے اسے سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ عقل و فکر کی ضرورت نہیں۔ اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ تحریک آزادی وطن کے دوران ہی میں ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہو جائے، اور ہم جدا جدا قطروں کی شکل اختیار کر کے جدید نیشنلزم کی خاک میں جذب بھی ہو جائیں۔ پھر بحیثیت مسلمان قوم کے ہم اپنی نشأۃ ثانیہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

جو لوگ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی چاہتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں اس آزادی کے منافع اس قدر قیمتی ہیں کہ اپنی اسلامی حیثیت کو وہ بخوشی ان پر قربان کر سکتے ہیں، وہ اس راستہ پر ضرور جائیں۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ کوئی سچا مسلمان ایسی تحریک آزادی وطن میں جان بوجھ کر حصہ لینا گوارا کرے گا۔

ہم کیسی آزادی چاہتے ہیں۔ آزادی وطن کے لئے دوسرا راستہ صرف

وہی ہو سکتا ہے جس میں کسی باشندہ ہند کے ہندوستانی ہونے کی حیثیت اور اس کے مسلم یا ہندو یا عیسائی یا سکھ ہونے کی حیثیت میں کوئی تناقض نہ ہو جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو جس کی نوعیت یہ ہو کہ مشترک وطنی مسائل کی حد تک تو امتیاز مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کر سکے اور ہر قوم کو آزاد ہندوستان کی حکومت میں اتنی طاقت حاصل ہو کہ وہ اپنے ان مسائل کو خود حل کرنے کے قابل ہو۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ کرنا تو ہمارے لئے قطعاً ناگزیر ہے لیکن ہم جس قسم کی آزادی کے لئے لڑ سکتے ہیں اور لڑنا فرض جانتے ہیں وہ یہی ہے۔ رہی وہ آزادی جو وطن پرستوں کے پیش نظر ہے تو اس کی حمایت میں لڑنا کیا معنی، ہم تو اسے انگریزوں کی غلامی سے بھی زیادہ مبغوض سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے علم بردار مسلمانوں کے لئے وہی کچھ ہیں جو کلائیو اور ولزلی تھے، اور ان کے پیرو مسلمان کسی حیثیت سے بھی میر جعفر اور میر صادق سے مختلف نہیں ہیں۔ گو صورتیں اور حالات مختلف ہیں مگر دشمنی اور غداری کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں[1]۔

---

[1] بعض حضرات نے اس فقرے کی سختی کی شکایت کی ہے۔ ان کے اطمینان قلب کے لئے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس فقرے میں میرا روئے سخن ان لوگوں کی جانب نہیں ہے جو سچے مسلمان ہیں اور محض اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں دو قسم کے لوگوں کو میر جعفر و میر صادق سے تشبیہ دے رہا ہوں ایک وہ جن کے دلوں سے درحقیقت اسلام نکل چکا ہے مگر وہ مسلمانوں کے بھیس میں رہ کر امت مسلمہ کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اپنی اغراض کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور جو ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سجدہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

کانگریس کی طرف بُلانے والوں کی غلطی

اب سوال یہ ہے کہ یہ آزادی جس کو ہم اپنا مقصود بتا رہے ہیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں میں آج کل دو گروہ نمایاں ہیں جو دو مختلف تجویزیں پیش کر رہے ہیں ٭

ایک گروہ کہتا ہے کہ آزادی وطن کے لئے جو جماعت جدوجہد کر رہی ہے اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرو اور جب وہ انہیں منظور کر لے تو اس کے ساتھ شریک ہو جاؤ ٭

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلا کسی شرط کے اس آزادی کی تحریک میں حصہ لو ٭

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ بالفرض اگر اس نے مطالبہ کیا اور انہوں نے مان بھی لیا تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ جس قوم میں خود زندہ رہنے اور اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں اس کو دوسرے کب تک زندہ رکھ سکیں گے؟ رہا دوسرا گروہ تو وہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی اُن بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے جنہیں گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اگر ثابت کر دیا جائے کہ وہ کمزوریاں واقعی نہیں ہیں، اور مسلمان درحقیقت اس قدر طاقتور ہیں کہ جدید نیشنلزم سے ان کی قومیت اور قومی تہذیب کو کسی قسم کا خطرہ نہیں، تو ہم اپنی رائے واپس لینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر صاف سُن لیجئے کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا

دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے محض جذبات سے اپیل کرکے آپ حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ جس مریض کی آدھی جان نکل چکی ہے اس کے سامنے سپہ سالار بن کر آنے سے پہلے آپ کو حکیم بن کر آنا چاہئے۔ پہلے اس کی نبض دیکھیے اور اس کے مرض کا علاج کیجئے۔ پھر اس کی کمر سے تلوار بھی باندھ دیجئے گا۔ یہ کہاں کی ہوشمندی ہے کہ مریض تو بستر پہ پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور آپ اس کے سرہانے کھڑے خطبہ دے رہے ہیں کہ اٹھ بہادر، اپنی طاقت کے بل پہ کھڑا ہو، باندھ کمر سے تلوار اور چل میدان کارزار میں!

یہ دونوں راستے جن لوگوں نے اختیار کئے ہیں ان میں متعدد حضرات ایسے ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں غایت درجہ کا احترام موجود ہے۔ ان کے خلوص ایمان میں ہم کو ذرہ برابر شک نہیں۔ مگر ان کی جلالت شان کا پورا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں، اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور و خوض نہیں کیا ہے۔

چند غور طلب حقائق

ہمارے رہنماؤں کو قدم اٹھانے سے پہلے حسب ذیل حقائق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے:

(۱) مسلمانوں کی حیات قومی کو برقرار رکھنے کے لئے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں "سلطنت کے اندر ایک سلطنت" (IMPERIUM-IN-IMPERIO) کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوت ضابطہ اور ہیئت حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی

طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظام حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں ۔

(۲) اٹھارویں صدی کے سیاسی انقلاب نے ہم کو اس چیز سے محروم کر دیا۔ اور اس کی بدولت جو اضمحلال ہماری سوسائٹی میں رونما ہوا اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔ ڈیڑھ سو برس تک مسلسل اور پیہم انحطاط کی طرف لے جانے کے بعد یہ انقلاب ہم کو ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہا ہے جہاں ہماری جمعیت پراگندہ، ہمارے اخلاق تباہ، ہماری سوشل لائف ہر قسم کی بیماریوں سے زار و نزار، اور ہمارے دین و اعتقاد تک کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور ہم موت کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہیں ۔

(۳) اب ایک دوسرے انقلاب کی ابتدا ہو رہی ہے جس میں دو قسم کے امکانات ہیں۔ اگر ہم نے اسی غفلت سے کام لیا جس سے گذشتہ انقلاب کے موقع پر کام لیا تھا، تو یہ دوسرا انقلاب بھی اسی سمت میں جائے گا جس میں پہلا انقلاب گیا تھا، اور یہ اس نتیجہ کی تکمیل کر دے گا جس کی طرف ہمیں اس کا پیشرو لے جا رہا تھا۔ اور اگر ہم غیر مسلم نظام حکومت کے اندر ایک مسلم نظام حکومت (خواہ وہ محدود پیمانہ ہی پر ہو) قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انقلاب اپنا رخ بدل دے گا۔ اور ہمیں اپنے نظم اجتماعی کو پھر سے مضبوط کر لینے کا ایک موقع ہاتھ آ جائے گا ۔

(۴) سلطنت کے اندر ایک سلطنت قائم کرنا کسی سمجھوتے اور کسی میثاق

کے ذریعہ سے ممکن نہیں۔ کوئی غیر مسلم سیاسی جماعت، خواہ وہ کتنی ہی فیاض اور وسیع المشرب ہو، اس کے لئے بخوشی آمادہ نہیں ہو سکتی، نہ اس کو بحث مباحثہ کی طاقت سے کسی دستوری قانون میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔ اور بالفرض اگر یہ ہو بھی جائے تو ایسی ایک غیر معمولی چیز جس کی پشت پر کوئی طاقت ور رائے عام اور منظم قوت موجود نہ ہو، عملی سیاست میں نقش بر آب سے زیادہ پائدار نہیں ہوتی درحقیقت یہ چیز اگر کسی ذریعہ سے پائدار بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے نظام کی قوت اور اپنے ناقابل تسخیر متحدہ ارادہ سے اس کو بالفعل قائم کر دیں اور یہ ایک ایسا حاصل شدہ واقعہ (ACCOMPLISHED FACT) بن کر ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کا جزء بن جائے جس کو کوئی طاقت واقعہ سے غیر واقعہ نہ بنا سکے۔

(۵) یہ کام اس طرح انجام نہیں پا سکتا کہ ہم سر دست انقلاب کو اسی رفتار پر جانے دیں اور اس کی تکمیل ہونے کے بعد جب ہندوستان میں مکمل طور پر ایک غیر مسلم نظام حکومت قائم ہو جائے اس وقت سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ اس چیز کو صرف وہی شخص قابل عمل خیال کر سکتا ہے جس کو عملی سیاست کی ہوا تک چھو کر نہ گذری ہو۔ ایک ہوش مند آدمی تو ادنیٰ تامل یہ سمجھ لے گا کہ انقلاب کا رخ صرف دوران انقلاب ہی میں بدلا جا سکتا ہے اور سلطنت کے اندر سلطنت صرف اسی صورت میں بن سکتی ہے جبکہ سلطنت کی تعمیر کے دوران میں اس کی بنا ڈال دی جائے۔

(۶) جس قسم کی تنظیم اس مقصد کے لئے درکار ہے وہ کانگریس کے نظم میں

داخل ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ کانگریس ایک منظم جماعت ہے، اور ہر منظم جماعت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنے دائرہ میں لے کر اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نفسیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر مضبوط اسلامی کیرکٹر اور طاقتور اجتماعی نظم موجود ہو تو البتہ وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر اس کے نفسیات اور اصول و مقاصد میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ جن کمزوریوں میں مبتلا ہیں (جن کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے)، ان کو لئے ہوئے منتشر افراد کی صورت میں ان کا اُدھر جانا تو صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے جمہور پر کانگریسی نفسیات کا غلبہ ہو جائے، وہ اکابر کانگریس کی رہنمائی تسلیم کر کے ان کے اشاروں پہ چلنے لگیں، اور اسلامی مقاصد کے لئے مسلمانوں میں ایک رائے عام تیار کرنے کے جو امکانات ابھی باقی ہیں وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ ہر شخص جس کو خدا نے دیدۂ بینا عطا کیا ہے، اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ "نیشنلسٹ" قسم کے مسلمان اگر کانگریس کے اندر کوئی بڑی قوت پیدا کر لیں اور حکومت کے اقتدار میں انہیں کوئی بڑا حصہ مل جائے تب بھی وہ مسلمانوں کے لئے کچھ مفید نہ ہوں گے، بلکہ غیر مسلموں سے کچھ زیادہ ہی نقصان رساں ثابت ہوں گے، اس لئے کہ وہ ہر معاملہ میں پالیسی اور طریق کار تو وہی اختیار کریں گے جو ایک غیر مسلم کرے گا، مگر ایسا کرنے کے لئے ان کو اُس سے زیادہ آزادی اور جرأت حاصل ہو گی جو ایک غیر مسلم کو حاصل ہو سکتی ہے، اس لئے کہ بدقسمتی سے ان کے نام مسلمانوں کے سے ہوں گے۔

اسلامی جماعت کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری تدابیر مذکورۂ بالا

حقائق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے لئے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں، اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان کی آزادی کا حصول بھی ممکن ہو ـــــــ اس غرض کے لئے ہم کو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنی چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصول اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے۔ اور ان کے اندر کم از کم اتنی واقفیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اسلام کے حدود کو پہچان لیں اور یہ سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کن خیالات اور کن عملی طریقوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کن کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نشر و تبلیغ صرف شہروں ہی میں نہیں ہونی چاہیئے بلکہ دیہات کے مسلمانوں کو شہری مسلمانوں سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکام اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کی جائے، اور خصوصیت کے ساتھ اُن ارکان کو پھر سے استوار کیا جائے جن پر ہمارے نظام جماعت کی بنیاد قائم ہے۔

(۳) مسلمانوں کی رائے عام کو اس طرح تربیت کیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر مستعد ہو جائیں، اور ان کا اجتماعی ضمیر (SOCIAL CONSCIENCE) احکام اسلامی کے خلاف افراد کی بغاوت کو برداشت کرنا چھوڑ دے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز کے استیصال پر

توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ تشبہ بالاجانب ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ہم کو غیروں میں جذب ہونے کے لئے تیار کرتی ہے۔

(۴) ہمیں اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہئے کہ ہم اپنی جماعت کے اُن غداروں اور منافقوں کا استیصال کر سکیں جو اپنے دل کے چھپے ہوئے کفر و نفاق کی وجہ سے یا ذاتی اغراض کی خاطر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۵) ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہئے کہ جمہور مسلمین کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے، نہ ہندو کے غلاموں کو، بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آجائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لئے دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر کھلے دل سے آمادہ ہو، مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

(۶) مسلمانوں میں اس قدر اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ تن واحد کی طرح ہو جائیں۔ اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے شائد بعض لوگ یہ خیال کریں گے۔ کہ ایسا ہونا محال ہے۔ خود میرے متعدد دوستوں نے کہا کہ تم خیالی پلاؤ پکار ہے ہو۔ یہ قوم اس قدر گر چکی ہے کہ اب کوئی اعجازی قوت ہی اس کو سنبھالے تو سنبھالے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا ایک موقع، آخری موقع باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں، مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اور وہی ہمارے لئے آخری شعاع امید ہے۔ قبل اس کے کہ وہ بجھے، ہم اس سے بہت

کچھ کام لے سکتے ہیں، بشرطیکہ چند مرد مومن ایسے اُٹھ کھڑے ہوں جو خلوص نیت کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگریس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگریس کا ہے۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد کے لئے ہم کو بالآخر کانگریس ہی کے ساتھ تعاون کرنا ہے لیکن سردست ہم اس سے صرف اس لئے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لئے ہم کو جس اخلاقی قوت اور اجتماعی نظم کی ضرورت ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ ہم سب سے پہلے اپنی ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس غرض کے لئے ہم کو ایسی فضا درکار ہے جو مزاحمت اور تصادم سے پاک ہو۔ پس اگر کانگریس ہم سے تعرض کئے بغیر اپنا کام جاری رکھے تو ہمیں اس سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے برعکس ہماری ہمدردیاں، مشترک ہندوستانی مقاصد کی حد تک، اس کے ساتھ رہیں گی۔ البتہ اگر وہ ہماری غیر منظم جماعت کو اپنے نظم میں جذب کرنے کی کوشش کرے گی، اور براہ راست ہمارے عوام میں "وطن پرستی" اور "اشتراکیت" کی تبلیغ شروع کر دے گی اور اس غرض کے لئے ہماری قوم کے اُن منافقوں سے کام لے گی جن کی حیثیت ہماری نگاہ میں دوسری قسم کے منافقوں (یعنی انگریزی اقتدار کے ایجنٹوں) سے کچھ بھی مختلف نہیں، تو اس صورت میں ہم کو مجبوراً اس سے لڑنا پڑے گا، اور اس لڑائی کا تمام تر

الزام خود انہی پر عائد ہوگا +

پنڈت جواہر لال نہرو، اپنی موجودہ پالیسی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا اور مخالف خیالات رکھنے والوں کو تبدیل خیال (CONVERSION) پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا ہر جماعت کا حق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ کو یہ حق حاصل ہے تو ہم کو بھی جوابی تبلیغ کا حق پہنچتا ہے۔ وطن پرستی اور اشتراکیت کی تبلیغ ہماری نگاہ میں شدھی کی تبلیغ سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔ اور دونوں کی مزاحمت ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ اگر آپ اس تصادم کے لئے تیار ہیں، اور اس کو ہندوستان کے مستقبل کے لئے مفید سمجھتے ہیں۔ تو یہ آپ کی سخت نادانی ہے +

مسائل حاضرہ میں قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی رہنمائی

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔ (الاعراف - ۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف خدا کے پاس سے نازل کی گئی ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے لگو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۔ (آل عمران - ۴)

اے نبی کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو دوست بنالے گا اور تمہیں بخش دے گا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۔ (الاحزاب - ۳)

تمہارے لئے یقیناً اللہ کے رسول میں عمل کا اچھا نمونہ موجود ہے جو کوئی اللہ کی رحمت کا امیدوار ہو اور روز آخرت کے آنے کی توقع رکھتا ہو۔ اس کے لئے تو پیروی کا صحیح نمونہ وہی ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، یا جنہوں نے کبھی قرآن پڑھا ہے۔ ان کی نظر سے اس کتاب پاک میں یہ آیات ضرور گذری ہوں گی۔ بہت سوں کو ان کے معانی سے بھی واقفیت ہوگی۔ خصوصاً آخری آیت سے تو کوئی وعظ اور کوئی اصلاحی

خطبہ خالی نہیں ہوتا۔ مگر آج ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک بار پھر یہ آیات نظروں کے سامنے لائی جائیں، کیونکہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ساری مسلمان قوم ان آیات کو بھول گئی ہے۔

مجملاً ہر مسلمان اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو قرآن اور اسوۂ رسولؐ ہی کا اتباع کرنا چاہئے۔ اور ہمارے لئے ہدایت انہی دو چیزوں میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہدایت جس کے اتباع کا حکم اس قطعیت کے ساتھ تم کو دیا گیا ہے، آیا اس کا دائرہ صرف طہارت اور استنجاء اور عبادات اور (باصطلاح زمانۂ حال) "مذہبی" معاملات ہی تک محدود ہے یا تمہاری زندگی کے چھوٹے اور بڑے، دینی اور دنیوی، قومی اور ملکی تمام معاملات پر حاوی ہے؟ نیز یہ ہدایت صرف اس زمانہ اور اس ملک کے لئے تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، یا درحقیقت یہ زمانی و مکانی قیود سے مبرا ہے اور اس میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لئے ویسی ہی سچی اور صحیح رہنمائی موجود ہے جیسی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے عربوں کے لئے تھی؟ اگر پہلی بات ہے تب تو نعوذ باللہ قرآن کا یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ سب رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور تمام دنیا کے طریقوں کو ترک کر کے صرف اس ایک شخص کے اسوہ کا اتباع کیا جائے جو ہمارے پاس قرآن لایا تھا۔ اس صورت میں تو اتباع کرنے کے بجائے تم کو اپنے ایمان ہی پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر بات دوسری ہے، تو یہ کیا ماجرا ہے کہ تم وضو اور غسل کے مسائل میں، نکاح اور طلاق کے معاملات میں، ترکے اور وراثت کے مقدمات میں تو اس سرچشمۂ ہدایت

کی طرف رجوع کرتے ہو، مگر جن مسائل کے حل پر تمہاری قوم کی زندگی و موت کا مدار ہے، ان میں نہیں دیکھتے کہ قرآن تمہیں کونسا راستہ دکھاتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس طرف تمہاری رہنمائی کرتی ہے۔

انتشار خیال و تشتت عمل ہندوستان میں ہر طرف ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ مستقبل کا سوال ایک درشنی ہنڈی کی طرح مسلمان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کرو یا دیوالہ نکالو۔ لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جس کا جدھر منہ اٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے اور جس کے ذہن میں جو بات آرہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی مارکس اور لینن کے اسوے کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے، کوئی ہٹلر اور مسولینی کی سنت پر عمل کر رہا ہے، کوئی گاندھی اور جواہر لال کے پیچھے چلا جا رہا ہے، کوئی فرائض کی پرانی فہرست میں ایک نئے فرض کا اضافہ کر رہا ہے، کسی پر شستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے، کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے اور ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اگر پشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاؤ، اس لئے کہ منزل مقصود کوئی نہیں، حرکت ہی فی نفسہٖ مقصود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و بصیرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور اس پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے، اور

ہم سے کبھی یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملے میں تمہارے لیے ایک عملی نمونہ موجود ہے۔

ہدایت صرف کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں ہے

مسلمانوں کو مختلف راستوں کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ ہر راستہ کی طرف بلانے والوں میں بڑے بڑے مقدس علماء ہیں۔ بڑے بڑے نامور لیڈر ہیں۔ بڑے بڑے زبان آور خطیب اور ماہر فن انشا پرداز ہیں۔ ہر وادی کے سرے پر ایسے لوگ کھڑے ہیں جن کی آزمودہ کاری مسلّم، قومی خدمات ناقابل انکار، اور سیاسی مہارت و بصیرت معروف و مشہور ہے۔ ہر رہنما بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے اپنے راستے کے نشیب و فراز دکھا رہا ہے اور دوسرے راستوں کے خدشات بیان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بہت قابل قدر ہے۔ مگر مسلمان کی فطرت کہتی ہے کہ اِیْتُوْنِیْ شَیْئًا مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ حَتّٰی اَقُوْلَ ۔ میرے سامنے شخصیتوں کو نہ لاؤ۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، عالم و فاضل ہو، مفسر قرآن ہو، معلّم حدیث ہو، ماہر سیاست ہو، عمل اور قربانی کا نمونہ ہو، اس کی حرمت میرے سر اور آنکھوں پر، مگر جو ہدایت وہ دے رہا ہے، اگر وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے تو میرے لیے لائق اتباع نہیں ہاں اگر وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں سے کوئی دلیل اپنے پاس رکھتا ہے تو شخصی عظمت کی آمیزش سے الگ کر کے اس کو اور صرف اس کو سامنے لاؤ۔ اس لیے کہ وہی لائق اتباع ہے، اسی میں سچی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی میں صلاح و نجات ہے۔ اس کے بتائے ہوئے راستے میں خواہ کتنے ہی خدشات ہوں، کتنی ہی دشواریاں

اور کتنے ہی نقصانات ہیں۔ آخری اور دیرپا اور یقینی کامیابی اسی کے ذریعے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آیئے آج اسی نقطۂ نظر سے قرآن اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کریں کہ ہمارے اس وقت کے قومی مسائل میں اس کے اندر کیا ہدایت ہے۔ کچھ پروا نہیں اگر کوئی اس بات کو دقیانوسیت اور رجعت پسندی کہہ کر ناک بھوں چڑھائے۔ حالات جدید سہی، جغرافی ماحول مختلف سہی۔ مگر جس ہدایت کی طرف ہم رجوع کر رہے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر زمانے میں جدید ہے، ہر دور میں وقتی ہے، اور ہر جغرافی ماحول میں مقامی ہے۔

بعثت محمدیؐ کے وقت عرب کی حالت اور حضورؐ کا طرز عمل

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپؐ کے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی اور اس حالت میں آپؐ نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت عرب ہر طرف امپیریلسٹ طاقتوں سے گھرا ہوا تھا اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا امپیریلزم نفوذ کر چکا تھا۔ آپ کی پیدائش سے چند ہی روز پہلے حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئیں خاص اس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ، یمن، پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیر اثر تھے۔ عراق عرب کا علاقہ نجد کے حدود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عقبہ و معان تک بلکہ تبوک تک سلطنت روم

کے اثرات پہنچے ہوئے تھے۔ دونوں ہمسایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض کے لئے ایک دوسرے سے لڑاتی تھیں اور اندرون عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں۔ متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا، مگر قوم بنجر نہ تھی۔ جہانگیری کے لئے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے کیا کیا؟ اگرچہ آپ کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے فطری محبت تھی، اور آپ سے بڑھ کر حریت پسند کوئی نہ تھا۔ مگر آپ نے ایک قوم پرست (NATIONALIST) یا وطن پرست (PATRIOT) کی حیثیت اختیار نہ کی بلکہ ایک حق پرست اور خدا پرست کی حیثیت اختیار کی۔ آپ کی نگاہ میں مقدم کام یہ نہ تھا کہ اپنے اہل وطن کی قوت کو مجتمع کر کے اجنبی استیلاء کی جڑیں خاک وطن سے اکھاڑ پھینکیں بلکہ ہر دوسرے کام سے مقدم یہ تھا کہ حق پرستوں کا ایک جتھا بنائیں اور اس کے اندر ایسی طاقت پیدا کر دیں کہ وہ صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ خود روم و ایران میں بھی ظلم و عدوان کے استیلاء کا خاتمہ کر دے۔ آنحضرتؐ کے اہل وطن آپ کے بہترین اوصاف سے واقف تھے انہوں نے عرب کی بادشاہی کا تاج آپ کے سامنے پیش کیا تھا اس شرط پر کہ آپ اپنے اس جتھے کی توسیع و تنظیم سے باز آ جائیں۔ اگر آپ وطن پرست ہوتے تو خدمتِ وطن کا اس سے بہتر موقع اور کونسا ہو سکتا تھا۔ مگر آپ نے اس تاج کو ٹھکرا دیا، اور اسی کام میں لگے رہے جس کے بارآور ہونے کی کم از کم اس وقت کوئی شخص امید نہ

کر سکتا تھا۔ اس وقت آپؐ کی جمعیت دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ تمام ملک میں کوئی قبیلہ اور کوئی گروہ آپؐ کا ساتھی نہ تھا بلکہ سب مخالف اور سخت مخالف تھے۔ ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسکیم کب کامیاب ہو گی جس کو آپؐ لے کر اُٹھے تھے۔ اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ واقعۂ فیل کی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ پھر پیش آجائے اور حجاز بھی یمن اور ارمنستان کی طرح اجنبی حکومت کا غلام بن جائے۔ مگر آپؐ نے ہر حال میں یہی ضروری سمجھا کہ پہلے حق پرستوں کی جمعیت کو بڑھائیں اور مضبوط کر لیں، پھر جیسی صورت حال ہو اس کے مطابق ملکیوں اور غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی معاملہ کریں۔

اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپؐ "کمیونلسٹ" تھے؟ کیا آپؐ نعوذ باللہ اپنے وطن کے غدار تھے؟ کیا خاکم بدہن آپؐ غیر ملکی امپیریلزم کے ایجنٹ تھے؟ ہرگز نہیں تاریخ کے ناقابل انکار حقائق گواہ ہیں کہ کسی فرزند وطن نے اپنے وطن کو اتنی سربلندی عطا نہیں کی جتنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت عرب کو نصیب ہوئی۔ اور تاریخ ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ کسی داعی دین نے غیر مذہب والوں کے ساتھ اتنے تحمل، اتنی فیاضی، اتنی رواداری اور اتنی فراخ حوصلگی کا برتاؤ نہیں کیا۔ پھر یہ بھی دنیا کو معلوم ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے کبھی روٹیوں کی تقسیم اور منافع کے بٹوارے کا سوال ہی نہیں اٹھایا۔ آپؐ نے نہ کبھی مکی زندگی میں اس بنیاد پر مصالحت کی کہ ریاست قریش کے دار الندوہ اور جنگی و سیاسی عہدوں میں مسلمانوں کی اتنی نمائندگی ہو، اور نہ مدنی زندگی میں اس مسئلہ کو مدار صلح قرار دیا کہ یہود کے معاشی وسائل میں مسلمانوں کا اتنا حصّہ ہو۔

اب غور کیجئے کہ جب وہاں نہ کیمونزم تھا نہ وطن دشمنی تھی نہ اعدائے وطن سے ساز باز تھا، تو پھر کون سی چیز تھی جس کی بنا پر آپ نے عرب کی سیاسی نجات اور تمدنی و معاشی ترقی پر اپنی بہترین قوتوں اور قابلیتوں کو صرف کرنے سے انکار کیا اور ہر کام سے پہلے خدا کا نام لینے والوں کی ایک طاقتور جمعیت بنانا اور زمین میں اس کا دبدبہ قائم کرنا ضروری سمجھا؟ اس کا جواب ایک اور ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین وطن پرست کے نصب العین سے بالکل مختلف تھا۔ اس نصب العین کی راہ میں باہر کے قیصر و کسریٰ اور گھر کے ابوجہل و ابولہب دونوں یکساں سد راہ تھے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ناگزیر یہ تھا کہ واقعات کی رفتار اور ملک کے مستقبل اور آئندہ کے امکانی خدشات، سب کی طرف سے بے پروا ہو کر ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جائے جو باطل کے غلبہ کو کسی صورت میں قائم نہ رہنے دے۔ اور اپنی طاقت سے زمین میں ایسی حالت قائم کر دے جس میں خدا پرستانہ تہذیب امن کے ساتھ پھل پھول سکے حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

وہی نصب العین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان قوم کو دے گئے۔ مسلمان قوم ایک قوم ہی اسی بنیاد پر بنی ہے کہ یہ نصب العین اس کے تمام افراد کا مشترک اور واحد نصب العین ہے۔ اس نصب العین کو سلب کر لیجئے پھر مسلمان قوم کسی قوم کا نام نہیں ہے۔ یہاں عرب اور عجم کی کوئی خصوصیت نہیں زمان و مکان کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر حال میں یہی اس کا نصب العین ہے۔ ؂

مسلمانوں کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے؟

اب ایک دوسری نظر اسی کتاب ہدایت اور اسی سیرت پاک پر ڈالیے:۔

یہ جتھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا، اس کی بنیاد کسی مادر وطن کی فرزندی، کسی نسل انسانی کے انتساب، کسی سیاسی و معاشی مفاد کے اشتراک پر نہ تھی، بلکہ ایک مخصوص عقیدے اور ایک مخصوص طرز عمل پر تھی۔ اس کو جوڑنے والی طاقت خدا کی محبت اور بندگی تھی نہ کہ اغراض کی محبت اور مادی مقاصد کی بندگی۔ اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا نعرہ، اذان کا نعرہ تھا نہ کہ وطنیت کا نعرہ۔ اس کے اجزاء کو سمیٹ کر ایک بنیان مرصوص بنانے والی چیز ایک آن دیکھے خدا کی عبادت تھی نہ کہ کوئی محسوس مرئی علامت۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ کہ منافع مادی کی طلب: اس میں عمل کی گرمی پھونکنے والی قوت اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش تھی نہ کہ نسل و وطن کو سربلند کرنے کی تمنا۔

اس قوم کے نفسیات دنیا سے نرالے ہیں۔ جو چیزیں دوسروں کو جمع کرنے والی ہیں وہ اس قوم کو منتشر کر دینے والی ہیں۔ جو صدائیں اپنے اندر دوسروں کے لئے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں وہ اس قوم کے دل میں الٹی نفرت پیدا کر دیتی ہیں ——— جن مرئی علامتوں پر دوسرے گرویدہ ہوتے ہیں یہ ان کے لئے کوئی جذبۂ عقیدت اپنے اندر نہیں پاتے ——— جن چیزوں میں دوسروں کو گرما دینے کی طاقت ہے وہ ان کے دلوں میں الٹی سردی پیدا کر دینے کا اثر رکھتی ہیں ——— جو چیزیں دوسروں کو عمل پر ابھارنے والی ہیں وہی ان کو میدان عمل سے دور

بھگانے والی ہیں۔ سارے قرآن کو اٹھا کر دیکھ جاؤ۔ پوری سیرت نبویؐ پہ نظر ڈال لو۔ خلافت راشدہ کے دور سے اس زمانہ تک کی اسلامی تاریخ پڑھ لو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی فطرت کیا ہے اور مسلمان قوم کا مزاج کس قسم کا ہے ؏

جو قوم اس سوال پہ صدیوں سے جھگڑ رہی ہے کہ نبیؐ پہ سلام بھیجتے وقت بھی کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں، کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ "بندے ماترم" کا گیت سننے کے لیے تعظیماً کھڑی ہو گی؟ جس قوم کے دل میں مرئیات سے عقیدت کے بجائے سخت نفرت بٹھائی گئی ہے کیا تمہیں امید ہے کہ وہ کسی جھنڈے کو سر جھکا کر سلامی دے گی؟ جو قوم تیرہ سو برس تک خدا کے نام پہ بلائی جاتی رہی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ اب وہ بھارت ماتا کے نام پہ پروانہ وار دوڑتی چلی آئے گی؟ جس قوم کے دل میں عمل کی گرمی پیدا کرنے والا داعیہ اب تک محض اعلائے کلمۃ اللہ کا داعیہ رہا ہے، کیا تمہارا گمان ہے کہ اب معدے اور بدن کے مطالبات اس میں حرارت پھونکیں گے، یا کونسلوں کی نشستوں اور ملازمتوں کے تناسب کا سوال اس کے قلب و روح کو گرما دے گا؟ جس قوم کو عقیدے اور عمل کی وحدت پہ جمع کیا گیا تھا، کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کوئی طاقت ور عملی قوم بن جائے گی؟ تخیل کی بنیادوں پہ نظریات کی عمارتیں اٹھانے والے جو چاہیں کہیں۔ مگر جس کسی نے قرآن اور سنت سے اسلام کے مزاج کو سمجھا ہے وہ بادنیٰ تامل یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت جب تک بالکل مسخ نہ ہو جائے، وہ نہ تو ان محرکات سے حرکت میں آسکتی ہے اور نہ ان جامعات کے ذریعہ سے جمع ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم بلاشبہ ان ذرائع سے جمع ہو جائیں گے اور

ان میں حرکت بھی ان محرکات سے پیدا ہو جائے گی کیونکہ ان کو جمع کرنے اور حرکت میں لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ان کا مذہب ان کو منتشر کرتا ہے اور صرف وطن کی خاک ہی ان کو جمع کرتی ہے۔ ان کے معتقدات ان کے دلوں کو سرد کرنے والے ہیں۔ ان میں حرارت صرف معدے ہی کی گرمی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر مسلمان جس کو خدا کے نام پر جمع کیا گیا تھا اور جس میں ایمان کی گرمی پھونکی گئی تھی، آج تم اس کو ذلیل مادی چیزوں کے نام پر جمع نہیں کر سکتے، اور نہ ادنے درجہ کی خواہشات سے اس میں حرارت پیدا کر سکتے ہو۔ اس طریقہ میں اگر تم کو کامیابی نصیب بھی ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جبکہ تم مسلمان کو فطرت اسلام سے ہٹا دو اور اسے بلندیوں سے گرا کر پستیوں میں لے آؤ۔

اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ مسلمان وطن کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کی اصلاح و ترقی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ خلفائے راشدین نے وطن اور ابنائے وطن کی کیا کچھ کم خدمت کی؟ بعد کے مسلمان جس جس ملک میں گئے کیا انہوں نے اس کو جنت بنا کر نہیں چھوڑا؟ غیر مسلم قوموں کے ساتھ فیاضانہ معاملہ کرنے میں کیا کبھی کوئی کوتاہی کی گئی؟ پس اوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ملک یا اپنی قوم کے معاشی اور تمدنی مسائل سے بالکل بے پروا ہے۔ بلکہ ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی اصلی قوتِ محرکہ یہ چیزیں نہیں ہیں، اس کی جمعیت ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی ہے۔ اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والی چیز یہ نہیں ہے۔ وہ طاقتور اور منظم ہونے کے بعد ان سب مسائل کو حل کرنے میں حصہ لے سکتا ہے اور دوسروں سے بڑھ کر حصہ

لے سکتا ہے، مگر اس کو طاقتور اور منظم بنانے کے ذرائع یہ نہیں ہیں، بلکہ کچھ اور ہیں۔

مسلم قوم کس طرح بنائی گئی تھی؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ یہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نئی قوم کن طریقوں سے بنائی تھی اور اس میں کن ذرائع سے وحدت اور قوتِ عمل پیدا کی تھی۔

جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت لے کر اُٹھے تھے تو ساری دُنیا میں تنہا آپ ہی ایک مسلم تھے۔ کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا۔ دنیوی طاقتوں میں سے کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی۔ گردوپیش جو لوگ تھے ان میں خودسری اور انفرادیت انتہا درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی کسی کی بات سُننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نسل اور قبیلہ کی عصبیت کے سوا کسی اور عصبیت کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے ذہن ان خیالات اور مقاصد سے کوئی دور کا لگاؤ بھی نہ رکھتے تھے جن کی تبلیغ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تھے۔ اس ماحول اور ان حالات میں کون سی طاقت تھی جس سے ایک تنہا انسان، بے یار و مددگار اور بے وسیلہ انسان نے ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا؟ کیا آنحضرتؐ نے عربوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ میں تم کو زمین کی حکومت دلواؤں گا؟ رزق کے خزانے دلواؤں گا؟ دشمنوں پر فتح اور غلبہ بخشوں گا؟ بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا اور عرب کو ایک طاقتور سلطنت بنا دوں گا؟ تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دوں گا، تمہارے وسائل معیشت بڑھاؤں گا اور تمہیں ایک ترقی یافتہ اور غالب قوم بنا کر چھوڑ دوں گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لالچ

آپ نے نہیں دلایا تھا۔ پھر کیا آپ نے امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مقابلہ میں مزدوروں اور کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا؟ سیرت نبوی گواہ ہے کہ یہ چیز بھی نہ تھی۔ پھر کیا آپ نے کوئی سیاسی یا تعلیمی یا تمدنی یا معاشی یا قومی تحریک اٹھائی تھی اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچنے کے لئے نفسیاتی حربوں سے کام لیا تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں سے بھی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر غور کیجئے کہ آخر وہ کس چیز کی کشش تھی جس نے عربی اور عجمی، امیر اور غریب، آقا اور غلام سب کو آپ کی طرف کھینچا؟ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف دو چیزیں تھیں۔ ایک قرآن کی تعلیم۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا گیا تھا کہ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ان کو اس بات پر جمع کیا گیا تھا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ۔ ان کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ ان کے سامنے یہ نصب العین رکھا گیا تھا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ پھر جس شخص نے ان کو یہ دعوت دی تھی اس کا حال یہ تھا کہ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ۔ وہ جو کچھ کہتا تھا سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا۔ وہ فضیلت اخلاق اور اور عمل صالح کا مجسمہ تھا، اور اس کی زندگی میں راست بازی اور راست روی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہی دو چیزیں تھیں جنہوں نے ہر طرف سے لوگوں کو کھینچا اور وہ قوم بنا دی جس کا نام مسلمان ہے۔ نوع انسانی کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سے جن جن لوگوں کے لئے ان دو چیزوں میں کوئی کشش تھی، وہ اس مرکز کی طرف کھنچتے چلے گئے اور انہی سے مسلمان قوم وجود میں آئی۔ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھئے کہ اسلامی جمعیت نام ہی اس جمعیت کا ہے جو قرآن اور سیرت محمدی کی کشش سے وجود میں آئی ہے۔ جہاں زندگی کے وہ اصول اور مقاصد ہونگے جو قرآن نے پیش کئے ہیں، اور جہاں طرز عمل وہ ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہاں "مسلمان" جمع ہو جائیں گے۔ اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں گی وہاں ان لوگوں کے لئے قطعاً کوئی کشش نہ ہوگی جو "مسلمان" ہیں۔

مسلمانوں کی قومی تحریکات کے ناکام ہونے کی وجہ

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری قومی تحریکات میں بنیادی نقص کون سا ہے جس کی وجہ سے مسلمان کسی تحریک کی طرف بھی فوج در فوج نہیں کھنچتے اور ہر داعی کی آواز بہرے کانوں سے سنتے ہیں۔ ان کی فطرت وہ آواز سننا چاہتی ہے اور وہ طرز عمل دیکھنا چاہتی ہے جس کی کشش نے ان کو ساری دنیا سے الگ ایک قوم بنایا تھا۔ مگر افسوس کہ نہ وہ آواز کسی طرف سے آتی ہے اور نہ وہ طرز عمل کہیں نظر آتا ہے۔ بلانے والے ان کو ایسے مقاصد کی طرف بلاتے ہیں جو ان کی زندگی کے اصلی مقاصد نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ علو اور تمکن فی الارض کی طرف آؤ۔ حالانکہ یہ مسلمان کا نصب العین نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین

(اعلائے کلمۃ اللہ) کے لئے اس کی بے غرضانہ جدوجہد کا طبعی نتیجہ ہے۔ کوئی ان کو وطن پرستی کی طرف بلاتا ہے، حالانکہ اسی چیز کو چھوڑ کر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوئے تھے۔ کوئی ان کو نہایت ادنیٰ درجہ کے مادّی فوائد کی طرف بلاتا ہے، حالانکہ مسلمان کی نگاہ میں ان کی حیثیت متاعِ غرور سے زیادہ نہیں۔ پھر جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے اُٹھتے ہیں ان کی زندگی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے۔ کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں، غداریاں اور اغراض نفسانی کی بندگیاں۔ جمہور مسلمین بڑی بڑی امیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

خیر یہ ایک دوسری داستان ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے طریقِ تنظیم پر غور کیجئے کہ مسلمان قوم کی تنظیم اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔

اسلامی تنظیم کے اصول

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جمعیت اس ڈھنگ پر بنائی تھی کہ پہلے تو آپ نے انسانی گروہ میں سے صرف ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کی فطرت میں ایک خالص صداقت، اور ایک پاک زندگی کی طرف کھنچنے کی صلاحیت تھی۔ پھر تعلیم و تربیت کے بہترین ذرائع سے کام لے کر ان میں سے ایک ایک فرد کی اصلاح فرمائی، اس کے دل میں زندگی کا ایک بلند مقصد بٹھا

دیا۔ اور اس کے کیرکٹر میں اتنی مضبوطی پیدا کی کہ وہ اُس مقصد کے لئے جم کر جدوجہد کرے اور کسی فائدہ کا لالچ یا کسی نقصان کا خوف اُسے اُس مقصد کی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ اس کے بعد ان افراد کو ملا کر ایک جماعت بنا دیا تاکہ افراد میں جو کچھ کمزوریاں باقی رہ جائیں، جماعت کی طاقت ان کو دور کرے، اجتماعی ماحول ایسا بن جائے جس میں نیکیاں پرورش پائیں اور بُرائیاں اُبھر نہ سکیں۔ افراد اپنے مقصد حیات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے مددگار ہوں، اور اجتماعی طاقت سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ماہر فن انجنیر اینٹوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر بہترین اینٹیں لے، پھر ان کو اس طرح پکائے کہ ایک ایک اینٹ بجائے خود پختہ ہو جائے۔ پھر ان سب کو نہایت عمدہ سیمنٹ سے جوڑ کر ایک مستحکم عمارت بنا دے۔

اس تنظیم کے بڑے بڑے اصول یہ تھے:۔

اجماعت کے تمام افراد کم از کم دین کے جوہر سے واقف ہوں تاکہ وہ کفر و اسلام میں تمیز کر کے اسلام کے طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکیں۔

۲۔ اجتماعی عبادات کے ذریعہ سے افراد میں اخوت، مساوات اور تعاون کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔

۳۔ جماعت کے تمدّن و معاشرت میں ایسے امتیازی خصائص اور حدود مقرر کئے جائیں جن سے وہ دوسری قوموں میں خلط ملط نہ ہو سکیں اور باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے ایک الگ قوم بنے رہیں۔ اسی لئے تشبّہ بالاجانب کی سختی کے

ساتھ ممانعت کی گئی ۔

۴۔ تمام اجتماعی ماحول پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھایا رہے تاکہ جماعت کے دائرہ میں کوئی انحراف اور کوئی بغاوت راہ نہ پاسکے۔ سرکشی کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی اس کا استیصال کر دیا جائے، اور منافقین کے ساتھ غلظت اور شدت کا ایسا برتاؤ ہو کہ یا تو وہ جماعت سے نکل جائیں یا اگر رہیں تو کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں ۔

۵۔ پوری مسلمان قوم ایک انجمن ہو، اور ہر مسلمان مرد اور عورت کو مجرد اسلامی حق کی بنا پر اس کی رکنیت کا مساویانہ مرتبہ حاصل ہو ــــــ ایسے تمام انتسابات اور امتیازات کو مٹا دیا جائے جو مسلم اور مسلم میں تفریق کرتے ہوں۔ ہر فرد مسلم کو قومی معاملات میں حصہ لینے اور رائے دینے کا پورا حق حاصل ہو، حتیٰ کہ اگر ایک غلام بھی کسی کو امان دیدے تو وہ پوری قوم کی طرف سے امان ہو ۔

۶۔ جماعت کے تمام افراد ایک نصب العین پر متحد ہوں اور اس کے لئے جد وجہد اور قربانی کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہو ــــــ ایک گروہ صرف اسی نصب العین کی خدمت کے لئے وقف رہے اور بقیہ افراد جماعت اپنی معاش کے لئے جد وجہد کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے گروہ کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتے رہیں اور مجموعی طور پر پوری جماعت اور اس کے ہر ہر فرد کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہو کہ اس کی زندگی کا اصل مقصد روزی کمانا نہیں بلکہ اسی ایک نصب العین کی خدمت کرنا ہے۔

تنظیم کے یہی اصول تھے جن سے وہ زبردست جماعت پیدا ہوئی جو دیکھتے دیکھتے آدھی دنیا پر چھا گئی ــــــ اس طریق تنظیم کی رفتار ابتدا میں بہت سست تھی، حتیٰ کہ پندرہ برس تک وہ چند سینکڑوں سے زیادہ افراد کو اپنے دائرہ میں نہ لاسکی۔ مگر اس میں

یہ قاعدہ مدنظر رکھا گیا تھا کہ توسیع (EXPANSION) کے ساتھ ساتھ استحکام (CONSOLIDATION) بھی ہوتا رہے اس لئے یہ نظام جماعت جتنا پھیلتا گیا اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا گیا، یہانتک کہ جب ایک معتدبہ جماعت اس طریق پر منظم ہوگئی تو وہ اتنی طاقت کے ساتھ اٹھی کہ دنیا کی کوئی چیز اس کے سیل رواں کو نہ روک سکی ـــــ قرآن مجید میں اس کی چھوٹی سی ابتدا پھر تدریجی ترقی، پھر غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ اس کے ظہور کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ

مسلمان قوم کے مزاج کے ساتھ بھی طریق تنظیم مناسبت رکھتا ہے۔ یہ قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے ـــــ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی، یا کسی ظاہری علامت، یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرکے انکے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے، بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے ـــــ لوگوں نے آنکھیں بند کرکے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لے لئے ہیں، مگر انکو معلوم نہیں ہے کہ جو چیزیں دوسری قوموں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آسکتی ہے تو وہ ایک ایسی جمہوری تحریک ہے جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کی جائے اور جس میں توسیع و استحکام کے اُسی تناسب کو ملحوظ رکھا جائے جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملحوظ رکھا تھا۔ آپ اگر کچھ اور کوڑ مسالے کو لیکر ریت کی سطح پر ایک بڑی عمارت کھڑی کر دینگے اور اس سے قلعے کا کام لینا چاہینگے تو لامحالہ وہ سیل حوادث کی ایک ٹکر بھی نہ جھیل سکے گی ۔

اسلام ایک جامع تہذیب کی حیثیت سے

دین و دُنیا کی علیحدگی کا جاہلی تصور اور اسکے اثرات ہماری قومی سیاست میں

مذہب کا جاہلی تصور

مُحمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دُنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لئے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اس کا تعلق کلیۃً صرف اُس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لئے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ محض نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اُن پر نظرِ عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے، اس کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دُنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود

کو بھی خوش کیا جاتا ہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دُنیا سے، ایک الگ چیز ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں۔ اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو، اس پر پوری زندگی کی عمارت، ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادّی علائق سے نفرت، لذات دنیوی سے کراہت، عالم اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیئے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لئے ایک سنگ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد سراسر مادّیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا، اس کو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں، اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی سے گندی اور بدتر سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدس کا جامہ

پہنا دیا جائے، تا کہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوئی ہے۔

سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دُنیا سے الگ رہے، اور دُنیا کے معاملات کو دُنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر ——— جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانۂ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے ——— جس طرح چاہا چلایا، اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لئے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ ان کے لئے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا، اس لئے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں، اور ہر قسم کی تمدنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا، جہانسوزی اور غارت گری کا بھی، سود خواری اور قارونیت کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

مذہب کا اسلامی تصور

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لئے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی

تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فطری تصور پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو۔ صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہ راست اور راہ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہ کج سے بچائے، راہ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں، جو دُنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گذار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے تحت ایک ضمیمہ زندگی قرار دیا جائے۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے۔ اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا،

جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں، دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں۔ اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لئے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے، اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

اسلام ایک خاص طریق فکر (ATTITUDE OF MIND) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (OUT-LOOK ON LIFE) ہے ——— پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جس کا راستہ اسی طریق فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریق فکر اور طرز عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے، وہی تہذیب اسلامی ہے، اور وہی تمدن اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریق فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے: انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، قوم و ملت کے، ملک و وطن کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوع انسانی کے، حتّٰی کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل

قائم کرتا ہے، اور ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا، بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔

پھر یہی طریقِ فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے نظر متعین کرتا ہے، اور زندگی کی تمام سعی وجہد کو خواہ وہ کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اس کے لحاظ سے ہر شئے کی قدر (VALUE) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شئے کو پرکھا جاتا ہے۔ جو شئے مقصد کے حصول میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے، اور جو شئے سدِ راہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، طہارت میں، صنفی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہئے تاکہ وہ مرکزِ مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے، اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کئے جائیں جن سے معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزلِ مقصود کی طرف جانے والے ہوں، اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس

کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لئے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں، اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراک اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروان اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کارزار تک، طریق عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثار فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی رابطہ ہے، اور ان سب کو ایک مشین

کے پرندوں کی طرح اس لئے جوڑا گیا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔ مذہب کی دُنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا، اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دُنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے، مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے اَن پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے "تاریک" حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دینداری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال"۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے اور تعزیے اور گلائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقام حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگان نورِ علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم اپنے قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

ہماری سیاست میں جاہلی تصور کے اثرات

فہم و ادراک کے اس قصور کی وجہ سے مسلمانوں کے

تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے، بلکہ دُنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے، اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں +

یہ مذہب کا پُرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے +

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر مسلمان۔ اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام، اور پھر پنجابی، بنگالی، دکنی اور مدراسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے، زندگی کا ایک جداگانہ نقطۂ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے، ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کئے ہیں، اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے، اس لئے کہ اسلام ایک "مذہبی" ضمیمہ ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے +

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دُنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہئے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں۔ یعنی اعتقادات اور عبادات۔ ان کی حد تک مسلمان اپنی الگ راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے۔

رہے دنیوی معاملات، تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں جس طرح دُنیا کے دوسرے لوگ ان کو انجام دیتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہئے ؛

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی تمدنی اور لسانی حقوق کے لئے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک مشترک نظام کی ضرورت کی ہے، مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے معاشی اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہئے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں ؛

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لئے اٹھے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبعی کی دریافت، اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں، اس لئے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں وہی ان کے نزدیک اصلی اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عقل کی تہ میں کام کرتا ہے، اور جو اپنے طریق فکر و زاویۂ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راستہ، اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے، سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا ——— وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمنی، یا اطالوی،

یا فاروقی دعا لدی، ان کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی ذہن" ہیں، کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور تمکن فی الارض۔ ان کی نگاہ میں جس کو "زمین کی وراثت" حاصل ہے وہی "صالح" ہے اگرچہ وہ ابراہیمؑ کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ مسیحؑ کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک بڑا گروہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کے لئے اُٹھا ہے اس کے نزدیک اسلام اور اس کی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ ان کے مذہب اور "پرسنل لا" کی حفاظت کا اطمینان دلا دیا جائے، ان کی زبان کو اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے، اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو صرف انہی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ ہوگا جب تک خود مسلمان نمائندوں کی غالب اکثریت اس کو قبول نہ کرے تو ان کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا۔

دیکھا آپ نے! شکلیں کس قدر مختلف ہیں، مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں اسی جاہلی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے، تو ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمۂ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو۔ لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے، ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرار اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ تمہارا طریق فکر وہی ہو جو قرآن کا ہے ـــــ زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو جو قرآن کی نظر ہے ـــــ تم اشیاء کی قدریں (VALUES) اسی معیار کے مطابق معین کرو جو قرآن نے اختیار کیا ہے ـــــ تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو جو قرآن نے پیش کیا ہے ـــــ تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی بنا پر انتخاب کرو جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔

اگر تمہارے ذہن کو یہ چیز اپیل نہیں کرتی، اور تمہارے نفسیات، قرآنی نفسیات کے سانچے میں ڈھلنا قبول نہیں کرتے، تو کوئی تم کو دائرۂ اسلام میں آنے یا رہنے پر مجبور نہیں کرتا۔ عقل اور راست بازی کا اقتضاء یہ ہے کہ تم کو اس دائرے کے باہر اپنے لئے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہئے۔ لیکن اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول

کرتا ہے، اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد کر لیتے ہو، تو پھر زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اس راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا جسے قرآن سبیل المؤمنین کہتا ہے۔

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن ـــــ کہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں ـــــ جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے، چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعائر" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے، ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہننے کے سامان میں، رہن سہن کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں، مادّی وسائل اور قوانین طبیعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں، بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے، طریق فکر ایک ہے، نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے، اس لئے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصولوں کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے۔ جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے، اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی۔

آپ خواہ ہندوستانی ہوں یا ترکی یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی اور ہر اس اسکیم کو رد کر دینا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔

یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے اور دوسرا مرحلہ نتائج کا ــــ آپ زندگی کے پہلے مرحلہ میں دنیا کو جس طرح برتیں گے، دوسرے مرحلہ میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے ــــ اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرتا ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقہ سے برتیں جس سے دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں۔ پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے، اور اس میں اعتقادات و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ اسکیم کے بجائے کسی اور اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں تو یہ جزوی ارتداد ہے جو آخر کار کلی ارتداد پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں۔ آپ معتقدات دین اور عبادات دینی کو قبول کرتے ہیں، مگر اس نظام زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جس کی عمارت انہی معتقدات اور انہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجزیہ ہی اسلام کی رو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام پر ایمان رکھتا ہو اس کا ارادہ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا

مصداق ہے۔ پھر اگر آپ نے یہ تجویز کرکے دائرہ اسلام میں رہنے کا عزم کیا بھی تو آپ اس دائرے میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکیں گے۔ کیونکہ نظام زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد معتقدات دین اور عبادات دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اور غیر اسلامی اصولِ حیات پر ایمان لانے کے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا جو قدم قدم پر ان اصول حیات کی تکذیب کرتا ہے۔

بخلاف اس کے اگر آپ اس اسکیم کے مطابق اپنی سیاسی اور معاشی زندگی کے معاملات کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ پارٹیوں میں منقسم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہی پارٹی —— حزب اللہ —— ان سب کاموں کے لئے کافی ہے، کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراک عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں۔ کیوں نہ آپ ان اصولوں کے مطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں، وہ اگر مجبوراً تنازعِ طبقات (CLASS WAR) کی آگ میں کودتے ہیں تو آپ کیوں ان کے پیچھے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں، علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے، اور ایک وہ تھا جو صحابہ کرام اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں، اور دونوں تسخیرِ عناصر، استعمالِ اسباب اور

قوانینِ طبیعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں، مگر زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں، مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بُعد — بُعد المشرقین — ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دُنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن، اُس تسخیرِ عناصر اور استعمال اسباب کا نتیجہ ہے جس کی تہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے وہ بھی اگرچہ تسخیرِ عناصر اور استعمال اسباب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، مگر اس کی تہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیئے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو، اور جب تک کہ زندگی کی ساری جد وجہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے — وہی "ارکان اسلام" جن کو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی حقوق کو سمجھنے اور ان کے تحفظ کے صحیح طریقے معلوم کرنے میں جو غلطی کی جا رہی ہے اس کی تہ میں بھی وہی جہل کار فرما ہے جس کے مظاہر آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی پوری اسکیم اگر غیر اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے تو جس چیز کو آپ "مذہب" کہتے ہیں اور جسے "پرسنل لا" قرار دیتے ہیں اس کا اپنی اصل پر باقی رہ جانا، اور آپ کی زبان کا اپنے رسم الخط کے ساتھ محفوظ رہنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا، اس لئے کہ اس غیر اسلامی مجموعہ میں یہ بے جوڑ اسلامی اجزا کسی طرح کھپ نہ سکیں گے اور رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑتے چلے جائیں گے۔ پھر ان اجزاء کی حفاظت جن نمائندوں کے ہاتھ میں

آپ دینا چاہتے ہیں وہ اگر محض اصطلاحی و قانونی مسلمان ہوں تو وہ ان کی حفاظت بس اتنی ہی کر سکیں گے جتنی کہ غیر مسلم کر سکتے ہیں۔ ایسے مسلمان اگر اسلامی اصولوں کے خلاف تم نہیں پاپ کی اکثریت سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ اسلامی جماعت کے لئے اتنا ہی نقصان رہ ہو گا جتنا غیر مسلموں کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت کانگریس نے اپنا "بنیادی حقوق" FUNDA- MENTAL RIGHTS) والا ریزولیوشن مرتب کیا ہے، اور اسی تصور جاہلیت کے تحت اپنی بجنور والی تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے کہ "کانگریس کسی کے مذہبی عقیدے اور مذہبی روایات میں قطعاً دخل نہیں دے سکتی..... کانگریس کو مذہب میں مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ وہ ایسا کرے گی۔ کانگریس ہندوستان کے مذاہب کی آزادی، مذہبی لوگوں کی تہذیب کی آزادی، تمدن کی آزادی اور زبان کی آزادی کی حامی ہے[1]"۔ پھر جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت مسلمانوں کا ایک گروہ اس قسم کے اعلانات کو کافی سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ایسے اعلانات پر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ کانگریسی رہنما تو خیر غیر مسلم ہیں اور وہ مذہب کے صرف اسی تصور سے واقف ہیں جو انہیں وراثت میں ملا ہے، مگر مسلمانوں کے سیاسی رہنما (جن کے ساتھ بدقسمتی سے مذہبی رہنما بھی شریک ہوتے جاتے ہیں) اس سلسلہ میں جس ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ یہ حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر "مذہب" یعنی معتقدات ذہن اور مذہبی اعمال میں مداخلت نہ ہو، اگر مسلمانوں کے "پرسنل لا" یعنی

[1] جمیعت علمائے ہند کے واحد ترجمان "الجمعیۃ" مورخہ ۲۲ر شعبان ۱۳۵۵ھ میں یہ تقریر "صدر کانگریس کا اعلان حق" کے زیر عنوان شائع ہوئی ہے۔

قوانین نکاح وطلاق و وراثت کو جیسے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہیں، بدستور محفوظ رکھ دیا جائے، اگر مسلمانوں کی قدیم رسوم وعادات کو جیسی کہ وہ اس وقت پائی جاتی ہیں، ایک اجل مسمّٰی تک پرانے تبرکات (RELICS) کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جائے تو بس مسلمانوں کا قومی مسئلہ حل ہوگیا اور ان کے بعد مسلمانوں کو اپنے قومی مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اگرچہ آزادی اور تحفظ کے یہ اعلانات بھی سراسر منافقانہ ہیں جیسا کہ میں اپنے ایک دوسرے سلسلۂ مضامین میں خود صدر کانگریس کی تحریروں سے اور کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے شائع کردہ مضامین سے ثابت کر دوں گا، تاہم اگر ان کو خلوص و نیک نیتی پر بھی محمول کیا جائے تب بھی یہ سمجھنا انتہا درجہ کی کم فہمی پر دلالت کرتا ہے کہ ان اعلانات سے ہمارا قومی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ایسی چیزوں پر اطمینان قلب ظاہر کر کے ہمارے سیاسی و مذہبی رہنماؤں نے یہ راز فاش کیا ہے کہ وہ ابھی یہ سمجھے ہی نہیں کہ مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ ہے کیا؟

مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ

اگرچہ میں اپنے پچھلے مضامین میں اس مسئلہ کی کافی تشریح کر چکا ہوں لیکن یہاں ایک مرتبہ پھر کوشش کروں گا کہ اس کو نہایت واضح صورت میں پیش کروں تاکہ یہ زمانہ کا جادو، جو جہلاء اور علماء سب کے دماغوں پر مسلط ہوتا جارہا ہے، کسی طرح اترے اور مسلمانوں کے ارباب حل وعقد اپنی توجہات کو اس مسئلہ کے حل کی طرف منعطف کریں۔

اوپر میں بتا چکا ہوں کہ اسلام اس قسم کا کوئی مذہب نہیں ہے جو دنیا کی زندگی سے الگ چند معتقدات اور چند مذہبی مراسم انسان کو دیتا ہو تاکہ وہ آخرت کی زندگی میں نجات کے لئے سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئیں۔ بلکہ وہ درحقیقت ایک جامع تہذیب و تمدن ہے

جو دُنیا کو مزرعۃ الآخرۃ (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر، اور انسان کو زمین میں خلیفۃ الٰہی قرار دے کر، زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے، تاکہ انسان اس دُنیا میں صحیح برتاؤ کرے، اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو۔ اس غرض کے لئے اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطہ زندگی دیا ہے جو دوسرے ضوابط زندگی، مثلاً کمیونزم، فاشزم، کیپٹلزم، اور میٹیریلزم وغیرہ سے بالکل مختلف صورت پر ان کے نظام اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے، اور ان کو علوم و آداب میں، اخلاق و معاملات میں، عادات و اطوار میں، تمدن و معاشرت میں، معیشت و سیاست میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں بعض طریقوں کو ترک اور بعض کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس ضابطہ کی اساس ایک خاص طریق فکر اور ایک خاص مقصد حیات پر رکھی گئی ہے، جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے طریق فکر و مقصد حیات سے بالکل مختلف ہے، جس کی رو سے اشیا کی قدریں (VALUES) دوسروں کی پسند کی ہوئی قدروں سے بالکل مختلف طور پر متعین ہوتی ہیں، اور جس کے لحاظ سے زندگی میں مسلمان اپنا راستہ دوسروں کے انتخاب کئے ہوئے راستوں سے الگ انتخاب کرتا ہے۔

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کے بقا اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے:۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم ایسا ہو جو ان کے دل و دماغ میں اسلام کے طریق فکر و مقصد حیات کو صحیح طور پر پیوست کر دے، اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں، مسلمان کی حیثیت سے سوچیں، اور اسلام کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق زندگی کے ہر دوراہے پر ایک راستے کا انتخاب کریں۔

دوسرے یہ کہ یہ نظام تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو، اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں، اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی

اصولوں پر زندگی بسر کریں، اگرچہ ان کے بعض افراد کو علمی حیثیت سے ان اصولوں کا پورا شعور نہ ہو۔ اس غرض کے لئے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کرسکتی۔

انگریزی اقتدار کی غلامی میں ہم کو اصلی نقصان جو پہنچا ہے وہ یہی ہے کہ اپنی تہذیب کو ایک زندہ تہذیب کی حیثیت سے باقی رکھنے کے یہ دونوں ذرائع ہم سے چھن گئے۔ ایک طرف ہماری قوم پر ایک ایسا نظام تعلیم مسلط کر دیا گیا ہے جو وسیع پیمانہ پر ہمارے افراد کے طریق فکر کو بدل رہا ہے، نظریۂ زندگی اور مقصد حیات کو بدل رہا ہے، اور اس معیار کو بدل رہا ہے جس سے وہ اشیاء کی قدریں متعین کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایک غیر قوم کی سیاسی طاقت نے ہم پر ایک ایسا ماحول مسلط کر دیا ہے جو ہمارے عوام اور خواص کی زندگی کو روز بروز اسلامی مناہج سے ہٹاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے ہمارے قوانین حیات کو بڑی حد تک معطل کر دیا ہے، اور ہم اس کی بدولت اس طاقت سے محروم ہوگئے ہیں جس سے ہم اپنی سوسائٹی کو اس مخصوص اسلامی ہیئت میں برقرار رکھ سکیں۔

پس ہمارا اصل قومی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اب جو انقلاب درپیش ہے اس میں ہم اس نقصان کی تلافی کرسکیں جو انگریزی اقتدار سے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو پہنچا ہے، ہمیں اتنی طاقت حاصل ہو کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو خود اپنی ضروریات کے مطابق بنا سکیں، اور ہمیں حکومت میں اتنا اقتدار حاصل ہو کہ ہم اپنے تمدنی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو خود اپنے اصولوں کے مطابق حل کرسکیں اور اپنے اجتماعی نظام کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر مرتب کرلیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی تشریح میں نے اپنے "نصب العین" والے مضمون میں کی ہے۔ ہم کسی ایسی آزادی وطن کو صحیح معنوں

ہیں پورے وطن کی آزادی نہیں کہہ سکتے جس میں وطن کی ۱/۴ مسلمان آبادی کو یہ آزادی حاصل نہ ہو۔ نہ ہم کسی ایسی حکومت کو وطنی حکومت سمجھ سکتے ہیں جس میں وطن کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو۔ اور نہ ہمیں کسی ایسی جنگ آزادی سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے مشترک وطنی نصب العین (یعنی حریت و استقلالِ وطن) کے ساتھ ساتھ اپنے اِس قومی نصب العین کو حاصل نہ کر سکتے ہوں۔

یہ "قوم پرستی" کی تحریک جس کے تحت اس وقت آزادی وطن کے نام پر جنگ کی جا رہی ہے درحقیقت ہم کو اپنے اس قومی مقصد کی تحصیل میں مدد نہیں دیتی، بلکہ اس کے برعکس اُن نقصانات کو حدِ کمال پر پہنچانا چاہتی ہے جو ہم کو انگریزی اقتدار سے پہنچے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک ایک غیر قوم کی غلامی میں رہنے کی وجہ سے ہماری قوم میں جہالت، افلاس، اخلاقی انحطاط، اجتماعی بدنظمی، تمدنی بے راہ روی، اور تہذیب اسلامی سے انحراف کی جتنی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں انہیں دور کرنے میں ہماری مدد کرنا تو درکنار، وہ تو ان سے الٹا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے، اور ہماری ان اندرونی خرابیوں ہی کو اپنے لئے کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ ایک طرف اس تحریک کے علمبردار اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جمہور مسلمین کے دلوں سے اسلامی قومیت کا تخیل ہی مٹ جائے اور وہ اپنی قومیت کے رشتہ سے کٹ کر معاشی طبقوں میں منقسم ہو جائیں اور آپس میں روٹیوں پر لڑنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کے پاس تہذیب و تمدن اور تنظیم حیات کے خود اپنے نظریات ہیں جو اسلام کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں، اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی مزاحمت سے بے خوف ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو انہی نظریات کے تحت مرتب کریں

جس کی لپیٹ میں مسلمان بھی آ جائیں۔ اس طرح یہ تحریک ہمارے قومی مقاصد کے بالکل خلاف واقع ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ شریک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو نیست و نابود کرنے میں خود حصہ لیں۔ وہ اپنے پروپگنڈا کی طاقت سے یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ جو لوگ ان کی اس تحریک سے اختلاف کرتے ہیں وہ انگریزی اقتدار کے حامی ہیں، ٹوڈی اور سامراج پرست ہیں۔ لیکن یہ ایک زبردست جعل و فریب ہے جس کو دن کی روشنی میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ دراصل سب سے بڑا ٹوڈی اور سامراج پرست تو وہ ہے جو نجات وطن کے لئے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے وطن کی ۷/۱ آبادی کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتی۔ اپنی اس حماقت سے وہ خود انگریزی اقتدار کے قیام و بقاء میں مدد دیتا ہے، اور پھر اس حماقت کا الزام ان لوگوں پر رکھتا ہے جو نجات وطن کے لئے سرفروشی کرنے پر تیار ہیں، مگر اپنی قومیت اور اپنی قومی تہذیب کو فنا کرنے پر فطرۃً تیار نہیں ہو سکتے"۔

میں ایک مستقل سلسلۂ مضامین اس موضوع پر لکھ رہا ہوں کہ یہ تحریک وطن پرستی کن طریقوں پر چلائی جا رہی ہے اور مسلمانوں کے لئے مسلمان رہتے ہوئے اس کے ساتھ اشتراک عمل کرنا کس درجہ مہلک ہے۔ جو حضرات "ترجمان القرآن" کے خریدار نہیں ہیں، انہیں یہ سلسلہ عنقریب کتابی شکل میں مل جائے گا۔

شبہات اور جوابات

میں نے اپنے گذشتہ مضامین میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن باوجود اس کے ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے متعدد شبہات کا اظہار کیا ہے جن سے مجھے اندازہ ہؤا کہ ابھی توضیح مقاصد میں بہت کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ذیل میں چند اہم شبہات کو خود معترضین کے اپنے الفاظ میں نقل کر کے رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ امید ہے کہ میرے جوابات سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

اعتراض:۔ آپ نے سیاسی کام کرنے کے اکثر اُن طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لئے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آج کل عمل پیرا ہیں لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد اپنے مضمون "راہِ عمل" میں خود جو طریق کار مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے وہ بالکل ہی ناقابلِ عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے۔ بجائے خود مقاصد بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے، لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اندازاً کتنی مدت درکار ہوگی۔ اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حاصل کرنے میں صدیاں لگ جائیں گی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک مسلمان اُن مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو جائیں؟

جواب:- فاضل معترض ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لئے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں، وہ بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے"۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسلّمہ کو محض اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ تدابیر بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں" اور "ان کے حصول میں صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ قوتِ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو روبکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ یہی بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صرف معترض صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوتِ فکر صرف کریں ؎

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجئے اور ایک ایک جز کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجئے کہ آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں:-

۱۔ میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار

رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کردیں ـــــ یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلہ پر دو بالکل مختلف و متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے ـ جو شخص یعنی مذکورالصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے ـ میں اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں، اس لئے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے ـ اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا ـ میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں ـ (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی) ـ

۲ـ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو ـ اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقاء کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ـــــ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا ـ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے ـ

۳ـ مذکورہ بالا پالیسی کو مؤثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے ـ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں، اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں، تب بھی وہ اس توازن اور توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے ـ اس لئے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے؟ اصول اسلام

کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟
پس ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور موثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ـــــ کیا آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں! اگر تسلیم ہے تو یہ فرمائیے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب، اور نہ حاصل ہو تو کچھ پروا نہیں، اس کے بغیر ہی آگے بڑھتے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو موثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیئے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لئے یکساں مہلک ہیں ـــــ آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بد پیدا نہیں ہو سکتے جن کا خطرہ میں نے ظاہر کیا۔ یا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حُبِ وطن یا حُبِ نفس

کی خاطر ان خطرات کو گوارا کرنا چاہیئے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵۔ وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک ان تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے ـــــ اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان کا جائزہ لیجئے اور غور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کونسی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کرکے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لئے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "مسلمانوں کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے"، بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہرحال انہیں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل معترض نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظام اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے، اسی بنا پر انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے، لہٰذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست

نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لئے صدر اول کے مسلمانوں کی سی انتہائی دین داری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کے لئے اجتماعی جدوجہد کر سکتی ہو، جس میں اتنا شعور رہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کر دے، اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرہ میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے۔ نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبہ کے ساتھ اس کام کے لئے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے، تو ایک قلیل مدت ہی میں ایسی ایک رائے عام تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے کہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں۔ صحیح طریق کار کی دشواریوں کو دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کئے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم کبھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہو گئی ہے اور ہم اس درجۂ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لئے کوئی اجتماعی جدوجہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔

اعتراض :- آزادی کی جنگ کا شروع کرنا یا نہ کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو اور جب تک ہم نہ چاہیں وہ رکی رہے۔ سیاسی جنگ یا آزادی کی جنگ تو عرصہ ہوا کہ شروع ہو چکی اور برادران وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے اور نئے معرکے سر کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں ایسی حالت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ "بھائیو ذرا ٹھیر جاؤ، ہمیں بھی تیار ہو لینے دو، پھر جنگ شروع کرنا" ہماری ایسی آواز کو کون سن سکتا ہے اور اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی کان دھر سکتا ہے ؟

جواب :- یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اُس وقت تک کے لئے ملتوی ہو جائے گی، یا ہو جانی چاہیے، جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو لیں پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریک جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیئے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کر لیں جو شریک جنگ ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انہیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیئے ؟

ہر شخص جسے خدا نے تھوڑی سی عقل بھی دی ہے خود سمجھ سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف

اکثریت ہو اور متحد و منظم ہو، اور دوسری طرف اقلیت ہو اور متفرق و پراگندہ ہو، تو ان دونوں کے مقابلہ کا کیا انجام ہوگا؟ ہمارا حال اس وقت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے اور دوسرے گروہ کا کچھ اور ——— ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق ہی نہیں، اور تیسرا گروہ "قومی مفاد" کا نام ہی سن کر "فرقہ پرستی"، "ٹوڈیت" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کسنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک جماعت کسی مسئلے پر اسلامی حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور دوسری جماعت غیر مسلموں کی فوج میں شامل ہو کر سب سے اگلی صفوں میں اس کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کیلئے اٹھتی ہے اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں سے تقرب حاصل کرنے کے لئے علانیہ نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچانے والی، ہماری ہوا اکھاڑ دینے والی، اور ہندوستان کی سیاسی میزان میں ہم کو سبک کر دینے والی ہو سکتی ہے؟ اس بیماری کو ساتھ لئے ہوئے آپ جدھر بھی جائیں گے آپ کا کوئی وزن نہ ہوگا، اور آپ کسی ایسی چیز کی حفاظت نہ کر سکیں گے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو عزیز ہو۔

مگر اس کا یہ مفہوم لینا درست نہیں کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ درحقیقت معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ

ھتیاروں پہ صیقل بھی ہوگا۔ اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی، ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کر لئے ہیں، اور فلاں گروہ اتنا طاقتور ہو چکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ ان کی شکست خوردگی کا ثبوت ہوگا۔

اعتراض:۔ آپ نے اپنے مضمون "آنے والا انقلاب اور مسلمان" میں جدید تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونے والے مسلمانوں پر بہت سخت تنقید کی ہے اور غالباً آپ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے سیاسی جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیم یافتہ لوگ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہہ کر خارج کر دیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو، اور نہ اس کا موقع ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ پرانے تعلیم یافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یکدل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصہ لیں اور کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ کا مصداق بن کر دنیا پر ثابت کر دیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، اور دنیا کی کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی تدبیر اس نورِ الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جس کے مسلمان حامل ہیں۔

جواب:۔ یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک بنیانِ مرصوص بننے

کی ضرورت ہے۔ لیکن معترض کو میرے کن الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک مخصوص جماعت صرف اسی طرح بنایا جاسکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور جسم واحد بن کر اس کے لئے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لئے ہم کو نصب العین اور طریق کار دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملالیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لئے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خود سری یا منافقت کی بنا پر اپنی قوم کا ساتھ دینے سے انکار کریں، عام اس سے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے تعلیم یافتہ ——— یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص نہیں بنایا جاسکتا۔

اعتراض:۔ آپ نے بلاضرورت جو ضمنی بحثیں چھیڑی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک گذشتہ ستر سال میں مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہنچا ہے اور مختصر یہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ہم میں کچھ نہ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبوں تر ہے، اور ہماری اخلاقی خرابیاں اور کمزوریاں پہلے سے زیادہ ہوگئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو

مستلزم ہے تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں رہتے ہوئے ایک ہزار برس ہو گئے، مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی موجودہ اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ ہزار برس پہلے کے بہت بہتر ہے۔

جواب:۔ مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدتِ ملی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع، ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جا رہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیرِ حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہو گیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے ان کے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندوئیت" کی اساس کسی عقیدہ اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظامِ تہذیب پر قائم نہیں ہے، بلکہ نسل اور رسم و رسوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لئے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرزِ معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے ان کی "ہندوئیت" بہرحال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہٰذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات ان کے لئے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں کیونکہ یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشوونما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی، اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا، جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حرارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی نے دوسروں کو پستی سے اُٹھانے کی موجب ہوئی، مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا، اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑتا چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سمجھے بوجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغربی استیلاء سے مسلمانوں پر جو اثرات مترتب ہوئے وہ ان اثرات کے بالکل برعکس ہیں جو ہندوؤں پر مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا۔ اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن، اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ ان چند فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسباب زوال کے . ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے ۔

اعتراض :۔ نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی بحث دراصل دور از کار ہے ۔ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے ، وہ سب مل کر مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں ۔ ہمارے سیاسی مستقبل کا دار و مدار زیادہ تر کاشتکاروں اور مزدوروں کے اُس بے زبان طبقے پر ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی ۔ یہ لوگ مسلمانوں کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں ۔ اس لئے ہم سب کا خواہ پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نئے ، یہ فرض ہے کہ اس طبقہ کی اصلاح کریں ، اس میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادّہ پیدا کریں ، اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے استعمال کر سکیں ۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے سیاسی جنگ جیت لی ۔

جواب :۔ درحقیقت یہی کام تو ہمارے پیش نظر ہے ۔ ہم کو سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہمارے یہ عوام جن کو اسلام کی تعلیمات سے کسی قسم کی واقفیت نہیں ہے ، جو افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں ، جن کو اسلامی تہذیب و تمدن کی گرفت میں رکھنے کے لئے کوئی نظام موجود نہیں ہے ، جن میں جاہلیت کی رسوم پھیلی ہوئی ہیں ، اور جو اسلامی تعلیم و تمدن کے اثر سے دور رہنے کی بدولت ہندوستان کی آبادی کے سوادِ اعظم میں ہم رنگ ہو گئے ہیں ، کہیں یہ اشتراکیت اور نزاعِ طبقات کی اُس تبلیغ کا شکار نہ ہو جائیں جو اس وقت "قوم پرست"

جماعت کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے ان پست طبقات کو یہ تحریک اسلام کا علم اور شعور رکھنے والے طبقات سے جدا کر دے گی، معاشی کشمکش برپا کر کے ان کے درمیان عداوت ڈال دے گی، اور جب یہ طبقے اپنی قوم کے اہل دماغ کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے تو ان کی جہالت اور ان کے افلاس سے فائدہ اٹھا کر انہیں اقتصادی مساوات کا سبز باغ دکھایا جائے گا، اور اس بہانے سے ان کو غیر مسلم عوام میں جذب کر لیا جائے گا۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب تک "قوم پرست" تحریک کے مبلغین اور مسلم عوام کے درمیان جو دیوار حائل تھی، جس کی وجہ سے مسلم عوام ان کی تبلیغ کو سننے تک کے روادار نہ تھے، اسے ہمارے علمائے کرام اپنی ناعاقبت اندیشی سے منہدم کر رہے ہیں۔ ان کے اس فعل کا نتیجہ یہ ہوتا نظر آتا ہے کہ مسلم عوام آہستہ آہستہ ان لوگوں کی باتیں کان دھر کر سننے لگیں گے، اور چونکہ یہ لوگ علانیہ تبدیل مذہب کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ ان اشتراکی خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں جو مفلس طبقوں کے دل و دماغ پر بڑی آسانی کے ساتھ چھا جاتے ہیں، اس لئے ہمارے عوام رفتہ رفتہ ان کے جال میں پھنستے چلے جائیں گے اور آخر کار یہ چیز امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دینے، اور جمہور مسلمین کو غیر مسلم سواد اعظم میں مدغم کر دینے کی موجب ہو گی۔ علمائے کرام آج جس چیز کو سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ رہے ہیں، کل وہ چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آئے گی اور ایسی حالت میں آئے گی کہ اس کا علاج ان کی قدرت سے باہر ہو گا۔ اس وقت ان حضرات کی آنکھیں کھلیں گی اور انہیں معلوم ہو گا کہ جو تیر انہوں نے اندھیرے میں چلایا تھا وہ انگریزی سامراج کے بجائے محمد رسول اللہ کی امت کے سینے میں پیوست ہوا ہے۔

ان خطرات کا سد باب اگر کسی صورت میں ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں

میں ایک فعّال جماعت ایسی اٹھ کھڑی ہو جو اپنے جمہور میں جا کر ایک طرف قرآن کے اندر اسلام کی جوہری تعلیم پھیلائے، رسوم جاہلیت کو مٹائے، ان کو اسلامی تہذیب و تمدن کے اصولوں سے باخبر کرے، اور دوسری طرف ان کی روٹی کے مسئلے کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اشتراکی تحریک کی جو مخالفت کرتے ہیں اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ظالمانہ سرمایہ داری اور ناجائز انتفاع رکھنے والے طبقوں کے حامی ہیں۔ بلکہ دراصل اسلام کے متبع ہونے کی حیثیت سے ظالمانہ سرمایہ داری کو مٹانے اور مفلس طبقوں کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لیے ہم خود اپنے اصول رکھتے ہیں اور وہ اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم اپنی قوم کے معاشی مسائل کو خود اپنے ہی اصولوں کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت کے علمبردار ہمارے جمہور پر قابض ہو کر اپنے طریقوں سے امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے، اس لیے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ ہمارے لئے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابل اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہئے۔ خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کئے گئے تھے، وہ صرف اسی زمانہ کے لئے نہ تھے بلکہ تمام ازمنہ اور امکنہ کے لئے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں، اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے، آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لئے صدیاں درکار ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے اور دیکھتے

دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے۔ البتہ اس کے لئے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی خلاقی طاقت حرکت میں لاسکتی ہے جو سیرت محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفانوں میں بھی راہ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لئے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور چند ایسے کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور اہواء نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک، ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

اعتراض:۔ آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لئے آئینی ضمانتوں کو بے فائدہ قرار دیتے ہیں اس بنا پر کہ جب تک ان ضمانتوں کی پشت پر کوئی (SANCTION) نہ ہو اکثریت ان کی پابندی کے لئے مجبور نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلہ میں آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں مگر بعینہٖ وہی اعتراض آپ کی اس تجویز پر بھی تو ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس وہ کونسی طاقت ہوگی جو اس "سلطنت در سلطنت" کے احکام کو اکثریت کی مرضی کے خلاف

نافذ کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ اکثریت یہ قانون نافذ کرتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی یک قلم موقوف ہو جائے۔ مسلمانوں کی یہ "سلطنت در سلطنت" اس کو کیسے روک سکے گی؟ فرض کیجیے کہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے۔ آپ اس کو رجم کی سزا کیسے دے سکیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ حدِ زنا جاری کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ آپ مرتکبین زنا کے ساتھ غیر مسلم زانیوں یا زانیات پر بھی حد جاری کر سکیں؟

جواب:۔ "سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدود اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اُس نظام کی مضبوطی اور اُس کے حامیوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گنی زیادہ اکثریت پر حکمران ہیں۔ ایک جمہوری نظام حکومت میں بھی "اقتدارِ اکثریت" (MAJORITY RULE) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر یا کم اثر بنا سکتی ہے۔ پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو میں تجویز کر رہا ہوں کن حدود تک وسیع ہو گی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیے پھر ہم جتنی طاقت فراہم کریں گے اسی کی نسبت سے "سلطنت در سلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہوں گے۔

اعتراض:۔ آپ کہتے ہیں کہ اگر ہم دارالاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دارالاسلام ہی قائم کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جو نظام حکومت اس وقت قائم ہے، یا جو آئندہ آئینی ضمانتوں کے تحت قائم ہوگا وہ بھی تو شبہ دارالاسلام ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام حکومت دارالاسلام نہیں ہے اور دارالحرب بھی نہیں ہے، لہٰذا ان دونوں کے بین بین جو صورت بھی ہو اس پر شبہ دارالاسلام ہی کا اطلاق ہونا چاہیئے۔

جواب:۔ "شبہ دارالاسلام" سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص "دارالکفر" کی بہ نسبت خالص "دارالاسلام" سے زیادہ قریب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے، جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں اور جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے۔ اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں۔ اُن کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس محدود آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بالواسطہ اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ انھوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ اُن مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے جنکی بجاآوری

میں ہم آزاد چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اُس کی گرفت میں ہم اس قدر بے لبس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لئے اسلامی اصول معیشت کی پابندی قریب قریب محال ہو گئی ہے اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو ان اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدل و قانون اور اُن کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلا واسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدارِ مطلق فی نفسہ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔ جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلّت بخشنے کی مختار نظر آتی ہے محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دارالکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لئے اسے شبہ دارالکفر کہنا چاہیئے نہ کہ شبہ دارالاسلام۔

مَیں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رکھنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیئے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اس وقت ہم نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل متعین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کر سکتے ہیں جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائے گی اور پوری طرح مستحکم ہو جائے گی اس

وقت ہمارے لئے اپنا اختیار استعمال کرنے کا شائبہ کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دارالکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اس کی گرفت میں جکڑے گئے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لئے اس کی بندشوں میں سے چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہئے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر جانے دیا، اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کر سکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دارالکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دارالکفر لے لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لئے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں۔ محض عقل عام (COMMON SENSE) رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لئے بھی دلائل کی ضرورت پیش آ رہی ہے، اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اس لئے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ ان کا ضمیر تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دارالکفر ہو یا خالص دارالکفر نہیں صرف آزاد ہندوستان چاہئے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ لیکن جو لوگ پہلے

مسلمان اور یہ سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں ◆

اعتراض:۔ آئینی ضمانتوں پر تو بہرحال برطانوی حکومت اور ہندوستان کی اکثریت کو راضی کیا جا سکتا ہے، اور یہ ایک قابل عمل چیز نظر آتی ہے لیکن "سلطنت در سلطنت" کا تو تخیل ہی ایسا ہے جس پر نہ برطانوی حکومت راضی ہو سکتی ہے اور نہ ہندوستان کی اکثریت۔ یہ نام درمیان میں آجانے کے بعد تو مصالحت کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے ◆

جواب:۔ اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ معترض صاحب اپنی اس رائے پر خود نظر ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں، اور ان پر اکثریت کی رضامندی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو، تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہرحال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے، اور اس کے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں ◆

اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا مدار ہو وہ اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے، خواہ کوئی

اس پر راضی ہو یا نہ ہو ٭

اعتراض :۔ یہ سلطنت در سلطنت کا تخیل ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لئے بھی تو مفید نہیں ہے۔ اگر اسی طرح ہندوستان کی ہر قوم سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہو تو فی الواقع ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کی جگہ فرقہ وارانہ انارکی لے لے گی ٭

جواب :۔ میں اپنے نصب العین والے مضمون میں اُن کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کرچکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ "سلطنت در سلطنت" سے میری مراد مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جو انہی حقوق اور اختیارات کو استعمال کرے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ اگر کوئی ان حقوق اور اختیارات میں کمی کرنا چاہے بھی تو نہ کرسکے۔ آپ اس مضمون کو غور سے دیکھئے۔ اس میں جن حقوق اور اختیارات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کونسی چیز ایسی ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لئے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے روکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشوو ارتقاء میں مانع ہو؟ اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لئے اس قسم کی خود اختیاری (AUTONOMY) حاصل کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور ان سب کو ایسی خود اختیاری حاصل ہونے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظام حکومت بخوبی چل سکتا ہے ٭

حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے صرف نظری سیاسیات THEORITICAL POLITICS

کا مطالعہ کیا ہے وہ "سلطنت در سلطنت" کا نام سُن کر کان کھڑے کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ناقابل عمل چیز ہے۔ لیکن عملی سیاسیات میں وسیع یا محدود پیمانے پر سلطنت در سلطنت کا وجود قریب قریب ہر ترقی یافتہ ملک میں پایا جاتا ہے، اور سیاسی انصاف کیلئے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ جہاں سلطنت کا غلبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملک کے تمام دوسرے طبقے سلطنت در سلطنت سے محروم ہوگئے ہیں وہاں ظلم اور بے انصافی کا دور دورہ ہے۔ علاوہ بریں واقعات اس کا ثبوت دیتے ہیں کہ سلطنت در سلطنت ناقابل عمل چیز نہیں ہے۔ ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کو ترقی میں یہ اگر حارج ہوسکتی ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ اس ملک کی مختلف قوموں کے اندرونی نظامات ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ طرز عمل اختیار کریں، اور اپنی مرضی کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں۔ لیکن ہمیں اس نوعیت کی سلطنت در سلطنت مطلوب نہیں ہے جو انارکی اور خانہ جنگی برپا کرنے والی ہو۔ خالص دارالاسلام سے کم جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اولاً ہمیں خود اپنے اصولوں کے مطابق اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کرنے کا اختیار و اقتدار حاصل ہو، ثانیاً ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ہم کو اتنا اثر حاصل ہو کہ اس ملک کا سیاسی و تمدنی ارتقاء ہمارے اصول تہذیب اور مصالح قومی کے خلاف راستہ اختیار نہ کرنے پائے، اور ثالثاً اگر یہ ارتقاء ایسا کوئی راستہ اختیار کر رہا ہو تو ہم اتنے بے بس نہ ہوں کہ اپنی اجتماعی طاقت سے اس کو روک نہ سکیں ——— یہی تین عناصر مل کر اس مفہوم کی تکمیل کرتے ہیں جسے میں "سلطنت در سلطنت" سے تعبیر کر رہا ہوں، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی یہ حاصل ہو تو اس سے کوئی

بدنظمی واقع نہیں ہو سکتی ۔ اسلامی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ محض عقل کی رو سے انصاف کا تقاضا معلوم کرنا چاہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ جب ہندوستان تمام قوموں کا مشترک وطن ہے ، اور اس کی خوش حالی و ترقی سب کے عمل اور سب کی محنتوں اور قابلیتوں کا نتیجہ ہے تو یہاں کسی قوم کو بھی اتنا با اقتدار نہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کر دے ، اور نہ کسی قوم کو اتنا بے بس ہونا چاہئے کہ وہ اپنی اُن چیزوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے جنہیں وہ جان و مال سے زیادہ عزیز رکھتی ہو +

اعتراض :۔ آپ کے انداز تحریر سے خوف و ہراس کی بُو آتی ہے ۔ آپ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کھا جائیں گے ۔ کیا یہ خوف محض اس وجہ سے ہے کہ وہ کثیر التعداد ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ میں قلیل التعداد ہیں ؟ کیا قرآن آپ کو یہی سکھاتا ہے کہ قوت اور غلبہ کا مدار کثرت اور قلت پر ہے ؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی بزدلی ہو سکتی ہے کہ مسلمان اُن مشرکین سے ڈر جائیں جو ۳۳ کروڑ خداؤں کو پوجتے ہیں ؟ مسلمان ایک موحد قوم ہے ۔ اس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہے ۔ اس کے اندر ایمان کی حرارت ہے ۔ کیونکر ممکن ہے کہ کفار و مشرکین اس پر غالب ہو جائیں ؟ مسلمانوں کو اپنی طاقت پر اعتماد ہونا چاہئے ، اور اسی اعتماد پر آزادی کی جنگ میں شریک ہونا چاہئے ۔ اگر ان میں عزم اور ہمت ہو تو کسی قوت سے بھی انہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ ان پر دوسروں کا رنگ کیا چڑھے گا ۔ ان کے پاس تو صبغۃ اللہ

ہے جو تمام رنگوں پر غالب آنے والا ہے +

جواب :- یہ اعتراض چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے، اور زیادہ تر اُن لوگوں کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جنہیں سوچنے سے پہلے بول دینے کی عادت ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیں خوف ہندوؤں کی طاقت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوریوں، اور ان کمزوریوں سے ہے جنہیں قرآن نے قوموں کے اسباب زوال و فنا میں شمار کیا ہے۔ قرآن کسی جگہ بھی یہ نہیں کہتا کہ مسلمان صرف اس بنا پر دنیا میں غالب ہوں گے کہ ان کے نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، اور کفار صرف اس بنا پر ان سے مغلوب ہو جائیں گے کہ وہ شیام سندر یا رابرٹسن جیسے ناموں سے موسوم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن اس تیرہ سو برس کی تاریخ میں نعوذ باللہ ہزاروں مرتبہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہوتا اگر ایسا ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ گذشتہ دو سو برس کی تاریخ کا ایک ایک لمحہ اس کے جھوٹ کا زندہ ثبوت ہوتا (معاذ اللہ) یہ قرآن رکھنے والے موحّد مسلمان جن کا آپ ذکر فرما رہے ہیں چین سے لے کر مراکش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ مگر کیا یہ چین کے بُت پرستوں سے، روس کے ملحدوں سے، انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور اٹلی کے تثلیث پرستوں سے مغلوب نہیں ہیں؟ یہی قرآن رکھنے والے موحّد مسلمان صقلیہ اور اندلس میں بھی تھے۔ مگر کیا یہ وہاں سے حرف غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے گئے؟ یہی قرآن رکھنے والے موحّد فتنۂ تاتار کے زمانے میں بھی تھے۔ مگر کس چیز نے ان کی تہذیب اور ان کی عظیم الشان سیاسی طاقت کو مشرکین تاتار کے

ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا؛ یہ دُنیا حقائق کی دُنیا ہے۔ خوابوں کی دُنیا نہیں ہے۔ آپ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی منتر آپ کو سکھا دیا گیا ہے جسے پڑھتے ہی طلسم کے پُتلے غیب سے پیدا ہوں گے اور کفار کو تہ تیغ کر دیں گے۔ آپ قرآن اپنے گھر میں رکھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی تعویذ آپ کے پاس آیا ہوا ہے جس کا بس گھر میں موجود رہنا ہی اُسے تمام آفات ارضی و سماوی سے محفوظ کر دے گا اور قانونِ فطرت کو آپ کے لئے بدل ڈالے گا۔ وہ تمام اخلاقی عیوب اور وہ تمام قومی امراض اپنے اندر پالتے رہیئے جو کفار و مشرکین اور منافقین کے خصائص میں سے ہیں، اور پھر یہ پندار بھی اپنے دماغ میں رکھئے کہ ہم وہی مومن ہیں جن سے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا وعدہ کیا گیا تھا، اور جب کوئی یاد دلائے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ آپ کسی انقلاب کے طوفان میں زندہ نہیں رہ سکتے، تو اُس کو بُزدلی کا طعنہ دیجئے۔ یہ اگر بہادری اور عقل مندی ہے، تو ایسی بہادری اور عقل مندی آپ ہی کو مبارک رہے۔ مَیں تو اسے خام خیالی اور طفل تسلی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ زندگی کے نہیں تباہی کے لچھن ہیں۔ مَیں اُس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں جو اپنی فوج کے کمزور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جوشیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے، اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔

بے شک کثرت و قلّت پر غلبہ و قوت کا مدار نہیں ہے۔ یقیناً کم

مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً ایک حقیقت ہے ۔ مگر کبھی سوچا بھی ہے کہ وہ کون سی اقلیت ہے جو اکثریت پر غالب آتی ہے؟ وہ اقلیت جس میں نظم ہو، جس میں اطاعتِ امر ہو، جس میں وحدت ہو، جس میں ایک نصب العین پر کامل اتفاق ہو، جس میں اپنے نصب العین کی خاطر اجتماعی جدوجہد کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کا جذبہ ہو، جس کے افراد میں سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی ہو، جس کے افراد اپنی تہذیب کے اصولوں پر سختی کے ساتھ عامل ہوں، اور جس میں منافقین کا وجود عنقا ہو۔ ایسی اقلیت اگر آپ ہیں تو ۲۲ کروڑ ہندو کیا چیز ہیں، تمام دُنیا کے کفار مل کر بھی آپ کو مٹا نہیں سکتے ۔ لیکن فی الواقع کیا آپ ایسی ہی اقلیت ہیں؟ اگر ایسی اقلیت آپ تھے تو یہ تین لاکھ انگریز ۶ ہزار میل کے فاصلے سے آکر آپ کے آٹھ کروڑ افراد کو غلام بنانے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟ بچوں کی طرح خواب نہ دیکھیے۔ ہوش میں آکر اُس دماغ سے بھی کچھ کام لیجئے جو خدا نے آپ کو سوچنے اور سمجھنے ہی کے لئے دیا ہے ۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ کر آپ نے خدا پر کوئی احسان کیا ہے جس کے معاوضہ میں وہ آپ کے لئے تمام قوانین طبیعی کو الٹ دے گا؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثریت متحد ہو رہی ہے، اس میں نظم پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک مرکز کی اطاعت پر مجتمع ہو رہی ہے، وہ ایک نصب العین کی خدمت کے لئے قربانیوں پر آمادہ ہے، اس نے اپنے منافقین کا بڑی حد تک استیصال کر دیا ہے،

اور وہ اپنے افراد میں سیرت کی مضبوطی پیدا کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں آپ خود اپنا حال بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ میں کوئی نظم نہیں، کوئی مرکزیت نہیں، کوئی متفق علیہ نصب العین نہیں، کوئی صاحب امر شخص یا جماعت نہیں جس کی آپ اطاعت کریں۔ آپ کی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو رہی ہیں۔ کبھی جھانسی میں اور کبھی بجنور میں اور کبھی مراد آباد میں خانہ جنگی کے لئے آپ کے اکھاڑے برپا ہوتے ہیں۔ خم ٹھونک ٹھونک کر بھائی کو بھائی چیلنج دیتا ہے اور جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو مار لیتا ہے تو اغیار کے سامنے اپنی برادر کشی پر سینہ تان تان کر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ آپ کے افراد، اور نامور افراد کیرکٹر کی ایسی کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں جو ساری قوم کی ہوا اکھاڑ دیتی ہے۔ آج اس گروہ میں ہیں تو کل دوسرے گروہ میں۔ آج یہ طاقت غالب ہے تو اس کے ساتھ ہیں، کل دوسری طاقت ابھرتی نظر آئی تو دفعۃً انہوں نے بھی اپنی وفاداریوں کا رُخ بدل دیا۔ افراد تو درکنار آپ کی جمعیتوں تک کا یہ حال ہے کہ ان میں کسی قسم کی استقامت رائے نہیں پائی جاتی۔ غیر مسلم خواہ کوئی طرزِ عمل اختیار کریں، دو چار اسلامی جمعیتیں ان کی مخالف ہوں گی تو دو چار ان کا ساتھ دینے کے لئے بھی کھڑی ہو جائیں گی، اور یہ حقیقت دُنیا پر آشکارا کر دیں گی کہ مسلمانوں میں بہت آسانی سے تفرقہ ڈالا جا سکتا ہے۔ کیا یہی وہ قومی سیرت ہے جس کو لے کر آپ توقع رکھتے ہیں کہ آپ کے لئے کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً کا معجزہ صادر ہوگا؟

قرآن اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ خدا کے قانون میں جانبداری کہیں نہیں ہے۔ جو اس قانون کے خلاف چلے گا، خواہ وہ مومن ہی کیوں نہ ہو، پیس ڈالا جائے گا، اور جو اس کی شرائط پوری کرے گا، خواہ وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہو، غالب اور فتح یاب ہوگا۔ صحابۂ کرام کی جماعت سے بڑھ کر ایمان کی حرارت اور سیرتِ اسلامی کا استحکام رکھنے والی جماعت تو کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسی کامل الایمان جماعت بھی مشرکین سے متعدد مرتبہ شکست کھا گئی، اور وہ بھی کس حالت میں؟ جب کہ خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے اور بنفس نفیس ان کی قیادت فرما رہے تھے۔ جنگ اُحد میں صرف اتنا ہی قصور تو ہوا تھا کہ مومنین کے دلوں میں مال کی محبت آگئی اور انہوں نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ پتھر کو پوجنے والے خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں پر چیرہ دست ہو گئے اور خود رسولِ خدا ان کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ...... اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ (آل عمران: رکوع ۱۶) جنگ حنین میں صرف اتنی ہی کوتاہی تو ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ قانونِ فطرت نے اس کی سزا یہ دی کہ مشرکین کے مقابلے میں ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ

اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ

(التوبہ: رکوع ۴) جو خدا ایسے بے لاگ قانون کے ساتھ اس کائنات پہ حکومت کر رہا ہے، اگر اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اہل ایمان کی صفات سے عاری ہونے کے بعد بھی وہ آپ کی حمایت کرے گا، اور ان مشرکین کے مقابلے میں آپ کو ثابت قدمی بخشے گا جو اس کے قانونِ طبیعی کی شرائط آپ سے زیادہ بہتر طریقہ پر پوری کر رہے ہیں، تو میں آپ کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ آپ عقلِ سلیم اور علمِ قرآن دونوں سے محروم ہیں ۔

(کتبہ: محمد رمضان خوش نویس بتھیک خوش نویساں اندرون لوہاری دروازہ لاہور)

"دارالاسلام"

کیا چیز ہے؟

اگر آپ "دارالاسلام" کے محل وقوع، مقصد، ضرورت، طریق کار، مختصر اسکیم اور مفصل حالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔ تو "دارالاسلام کا پراسپکٹس" ذیل کے پتہ سے مفت طلب فرمائیے۔ اس پراسپکٹس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دارالاسلام کی تعمیر میں کون سا جذبہ کام کر رہا ہے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کو من حیث القوم کیا کرنا چاہئے۔ اور جو کچھ کرنا ہے کس طرح کرنا چاہئے،

پتہ:۔ مہتمم دارالاسلام نزد پٹھانکوٹ (پنجاب)

بچوں کیلئے مفید کتابیں

سراپائے رسول اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک اور آپؐ کے عادات وخصائل لباس معاشرت اخلاق آداب واطوار اور عام طرز زندگی کے متعلق تمام معلومات جمع کی گئی ہیں، اور ان کو بہت سہل زبان اور دلکش انداز بیان میں لکھا گیا ہے بیبی تقطیع پر بہت خوبصورت طبع ہوئی ہے۔ قیمت ۱۲ر

ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ اس کتاب میں صحابہ کرامؓ کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دلنشین انداز بیان کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق، دینداری حسن معاشرت اور نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت قسم اول ۸ر قسم دوم ۶ر علاوہ محصول ڈاک

مسلمان بیبیاں یہ کتاب ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ کی طرح صحابیاتؓ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ان پاک ہستیوں کی زندگی کو مسلمان لڑکیوں کے لئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان اس قدر سادہ ہے کہ کم سن بچیاں بآسانی اس کو سمجھ سکتی ہیں قیمت ۸ر علاوہ محصول ڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے

(۱) اسلامی جہاد کی حقیقت۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کیا ہے [illegible]

نظام تمدن میں جہاد کا کیا درجہ ہے۔

(۲) اغراض جنگ۔ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے جنگ کا حکم دیا ہے۔

(۳) مصالح جنگ۔ اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی [illegible] اور ان اعتراضات کا

مدلل جواب جو اس طرح کی جنگ پر کئے جاتے ہیں۔

(۴) اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اسلامی تعلیم [illegible]

اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

(۵) قوانین جنگ۔ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ [illegible]

(۶) جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، [illegible]

اور مسیحیت کی تعلیمات اور ان پر تبصرہ۔

(۷) جنگ تہذیب جدید میں۔ بین الاقوامی قوانین جنگ سے اسلامی قوانین جنگ کا [illegible]

قیمت غیر مجلد [illegible] - مجلد [illegible]

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

جلد ۱۱ - عدد [illegible] ذی الحجہ سنہ [illegible]

۴۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ (عہ؍) قیمت فی پرچہ ۸ ؍

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین جو
موصوف نے رسالہ ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے تھے
ایک جگہ جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ، موجودہ حالات
اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ و مفکرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ
میں انکے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اسکے مطالعہ سے محروم
نہ رہنا چاہیے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ
اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپیہ میں	پانچ نسخے	علاوہ محصولڈاک
نو روپیہ میں	۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپیہ میں	۱۰۰ نسخے	″

نوٹ:۔ محصولڈاک فی نسخہ ۱/ ہے۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۵۰ نسخے
منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

فہرست مضامین

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ - جلد ۱۱ - عدد ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

شوال کی اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ وسط ذی القعدہ ۵۶ھ سے دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد سے "دارالاسلام" منتقل ہو جائیگا۔ لیکن اُس وقت اُن مشکلات کا اندازہ نہ تھا جو بعد میں پیش آنے والی تھیں۔ اگرچہ اعلان کے مطابق ذی القعدہ ہی میں دفتر منتقل کر دیا گیا، اور ذی القعدہ کا پرچہ بھی دارالاسلام سے شائع ہوا، مگر مصائب نے دفتر کو حیدرآباد کی سرزمین پکڑ کر بیٹھ گئی اور ماہ محرم تک اس کو نہ چھوڑا۔ جن لوگوں کو ترکِ وطن کی مصیبت سے کبھی سابقہ ہوا ہے وہ خود ہی اُن مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو مجھے پیش آئی ہونگی۔ دس سال تک جو شخص ایک جگہ رہا ہو، اور من کل الوجوہ اس کو وطن بنا چکا ہو اس کے لیے یکایک اپنا گھر بار اٹھا کر ڈیڑھ ہزار میل دور لے جانا بہرحال کچھ نہ کچھ پریشانیوں کا موجب تو ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ پریشانیاں پیش آئیں اور انہی کی وجہ سے ذی الحجہ اور محرم کے پرچے شائع نہ ہو سکے۔

رسالہ کے ناظرین کو پہلے ہی سے پرچہ کے بروقت شائع نہ ہونے کی شکایت تھی اب اتنے طویل التوا نے ان کو بالکل بے صبر کر دیا اور دفتر میں شکایات کے انبار لگ گئے۔ میں درحقیقت اس بات پر بہت شرمندہ ہوں کہ خریداروں کو بار بار شکایت کا موقع ملتا ہے لیکن اگر اس رسالہ کے ناظرین میں یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ وہ محض رسالہ کے خریدار نہیں ہیں بلکہ میرے رفیقِ کار ہیں تو انکا رفیق ان سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اسکی مشکلات میں شکایت سے زیادہ ہمدردی کا ثبوت دینگے۔

اگر کوئی غیر متوقع صورت نہ پیش آئی تو انشاء اللہ ذی الحجہ، محرم، اور صفر کے پرچے پے در پے

شائع کرکے، ربیع الاول سے رسالہ کی اشاعت ٹھیک وقت پر ہونے لگے گی، وما توفیقی الا باللہ

ماہ فروری کے معارف میں جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے ترجمان القرآن اور اس کے ایڈیٹر، و دارالاسلام کی تجویز کا جس ہمدردانہ اور پُر خلوص انداز کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، اسکے لیے میں ان کا تہ دل سے شکرگذار ہوں - اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو جاننے کے باوجود میں نے اب جن ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کی ہمت کی ہے، ان کو سنبھالنے کے لیے اور ان سے سبکدوش ہونے کے سبب میں ہندوستان کے معدودے چند بزرگوں کی اخلاقی اعانت پر اعتماد رکھتا ہوں اور ان میں سے ایک مولانا بھی ہیں - اپنی قدیم نیاز مندی کی بنا پر میں انکی عنایات و توجہات کا صرف متوقع ہی نہیں ہوں، بلکہ شائد حقدار بھی ہوں -

---

اسی سلسلہ میں مولانا نے دو چیزوں کی شکایت بھی فرمائی ہے -

پہلی شکایت کی بنا یہ ہے کہ گذشتہ ماہ شعبان کے اشارات میں مولانا کی اُس تقریر سے ایک اقتباس لے کر درج کیا گیا تھا جو انہوں نے مدراس میں ارشاد فرمائی تھی اور انصاری، الجمعیت، مدینہ اور بعض دوسرے اخبارات میں شائع ہوئی تھی - میرے نزدیک وہ تقریر مفادِ اسلامی کے خلاف تھی اسلیے میں نے اپنا فرض ادا کرنے کی خاطر اس پر تنقید کی - مولانا کو اس پر یہ شبہ ہوا کہ شائد میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہوں جن کیلیے "پروپیگنڈا ایک فن (؟ فن ہی نہیں پیشہ) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے"، اور یہ کہ میں نے قصداً اُنکی ذاتِ گرامی پر حرف لانے کے لیے ان کے ارشادات کی "تردید میں ان موشگافیوں اور نازک استنباطوں سے کام لیا ہے جو کہنے والے (یعنی خود مولانا) کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں"۔

اگر اسکے ساتھ ہی مولانا تھوڑی سی مزید تکلیف گوارا فرما کر یہ بھی لکھ دیتے تو بہتر ہوتا کہ جو فقرے میں نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں، آیا وہ انہی کے ہیں یا غلط طور پر انکی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اور اگر وہ

انہی کے ہیں تو ان کا صحیح مطلب کیا ہے۔ اس صورت میں مجھے اپنی غلطی معلوم ہو جاتی، اور میں کھلے دل کے ساتھ ان کی جناب میں معافی کی درخواست پیش کرتا۔ لیکن بحالتِ موجودہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مولانا نے اپنی مدراس کی تقریر میں (جسکی شائع شدہ رپورٹ کے صحیح ہونے سے اب بھی انہوں نے انکار نہیں فرمایا ہے) جو کچھ فرمایا تھا وہ نامناسب تھا، اور امتِ مسلمہ کے ایک ذمہ دار فرد ہونے کی حیثیت سے جو فرائض مولانا پر عائد ہوتے ہیں انکے لحاظ سے وہ اور بھی زیادہ قابلِ اعتراض تھا۔

میں یہ سمجھنے سے بالکل معذور ہوں کہ اس نازک دور میں ہمارے ذمہ دار رہنماؤں، اور خصوصاً کانگریس کی طرف میلان رکھنے والے بزرگوں نے مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے تحریر کے بجائے تقریروں اور پرائیویٹ صحبتوں کو کیوں پسند فرمایا ہے۔ اگر وہ واضح طور پر اپنے خیالات تحریر فرمائیں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ انکے پاس کیا دلائل ہیں۔ اس صورت میں ایک مستند بیان کی بنیاد پر اچھی طرح بحث کی جا سکتی ہے، اور صحیح کو غیر صحیح سے منقح کر کے عام مسلمانوں کے سامنے ایک شاہراہِ مستقیم پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ تحریروں میں تو اپنے خیالات پیش نہیں کرتے اور منتشر طور پر جلسوں میں تقریریں کر دیتے ہیں پہلے تو خود سامعین کے خیالات میں ان تقریروں سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ پھر انکی غیر مستند رپورٹیں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں اور ان سے مزید انتشار رونما ہوتا ہے۔ جو لوگ ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ انہیں مسلمانوں میں لیے پھرتے ہیں کہ دیکھو فلاں عالمِ دین اور فلاں بزرگ قوم بھی وہی کہتے ہیں جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جو لوگ ان سے اختلاف رکھتے ہیں وہ محض اس خیال سے تنقید کی جرأت نہیں کر سکتے کہ کہیں رپورٹ غلط نہ ہو اور بعد میں تردید نہ ہو جائے۔ اس طرح یہ ناقابلِ اعتبار تقریریں ملک میں پھیلتی رہتی ہیں اور فاضل خطیب خاموشی کے ساتھ ان کو دیکھتے رہتے ہیں۔ تردید اور توجیہ کی فرصت ان کو صرف اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس قسم کی "ایک آدھ" ناتمام تقریر کے برے اثرات

کو دیکھ کر کوئی شخص مجبوراً اس پر تنقید کرتا ہے۔ یہ طریق کار جن بزرگوں نے اپنے لیے پسند کیا ہے میرے نزدیک تو وہ غالباً اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے غافل ہیں۔ انہوں نے شاید ابھی تک یہ محسوس ہی نہیں کیا ہے کہ مسلمان اس وقت کیسی خطرناک پراگندہ خیالی میں مبتلا ہیں، اور اس حال میں ان کو واضح رہنمائی کی کس قدر سخت ضرورت ہے۔

کاش میری ہی تنقید کا یہ اثر ہوتا کہ مولانا اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ بیان فرمادیتے۔ لیکن انہوں نے بس اتنا لکھ کر بحث ختم کردی کہ "مجھے ان کے (یعنی ایڈیٹر ترجمان القرآن کے) مقدمات اور اصل مقصد سے پورا اتفاق ہے، اختلاف ہے تو ان کی تحریر کے نتائج اور طریق کار سے"۔ میں نے اس فقرے سے روشنی حاصل کرنے کی بہت کوشش کی، مگر مجھے کچھ نہ معلوم ہوسکا کہ میری تحریر کے کن نتائج سے کیا اور کیوں اختلاف ہے اور میرا طریق کار اگر پسند نہیں، تو اس سے بہتر کیا طریق کار مولانا کے پیش نظر ہے، اور اس کو بیان کرنے کے لیے اور کس وقت کا انتظار ہے۔

مجھے یہ اعتراض صرف مولانا سید سلیمان ندوی ہی پر نہیں ہے، بلکہ صفِ اول کے ان تمام علماء پر ہے جو اپنی عملی جدوجہد یا زبانی ہمارد دی سے مسلمانوں کو ہندوستانی قومیت اور ڈیماکریسی کے خطرناک جال کی طرف ہانکے لیے جا رہے ہیں، یا اس جال میں ان کو پھنستے ہوئے خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ نے بھی آج تک مسلمانوں کو یہ نہ بتایا کہ جس راستہ کی طرف وہ انہیں دعوت دے رہے ہیں، یا جس راستہ پر انکے جانے کو گوارا کر رہے ہیں، اسکے صراطِ مستقیم ہونے پر کیا دلائل انکے پاس ہیں۔ مولانا ابوالکلام جنکی سابقہ خدمات کے اعتماد پر بہت سے مسلمان آج آنکھیں بند کر کے انکے پیچھے چلے جا رہے ہیں، انکی ایک آدھ تحریر اور ایک آدھ ناتمام تقریر کے سوا آج تک کوئی چیز سامنے نہیں آئی، اور لطف یہ ہے کہ جو چیز سامنے آئی ہے اس میں بھی بجز خطابت اور سفسطہ کے کسی معقول استدلال کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ مولانا حسین احمد صاحب جنکے علم و فضل، تقویٰ و طہارت

ایثار و فدویت، اور مرکزی شخصیت کے اعتماد پر علماء کا ایک بڑا گروہ راہِ راست سے ہٹ گیا ہے، معتقدین اور مقلدین کے سامنے توبہت کچھ فرماتے ہیں، مگر ناقدین کے سامنے کوئی مستند اور مفصل بیان پیش کرنے کی آجتک انہوں نے تکلیف نہ فرمائی۔ انکے بعض مکتوبات کبھی کبھی اخبارات میں شائع ہو جاتے ہیں، مگر ان کو پڑھ کر یہ شبہہ اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے کہ مولانا حالاتِ حاضرہ سے قطعاً بے خبر ہیں اور انہوں نے ابتک یہ سمجھا ہی نہیں کہ واقعات کی رفتار ہندوستان کو کدھر لیے جا رہی ہے، اور مسلمانانِ ہند کے قومی مسائل نے اب کیا نوعیت اختیار کر لی ہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب جنکی ذمہ داری بحیثیت صدر جمعیت علمائے ہند سب سے بڑھ کر ہے، بالکل خاموش ہیں، اور جمعیت العلماء کے ارکان اپنے اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر جدھر منہ اٹھ رہا ہے چلے جا رہے ہیں، گویا کہ جمعیت واقع میں ختم ہو چکی ہے، مگر اس کا نام باقی ہے اور اس نام سے ہر شخص کو حسبِ منشاء فائدہ اٹھانے اور مسلمانوں کی رائے پر اثر ڈالنے کا اختیار حاصل ہے۔ جمعیت العلماء نے آجتک کانگریس کی غیر مشروط شرکت اور مسلم ماس کانٹیکٹ کی حمایت کا فیصلہ نہیں کیا۔ مگر جمعیت کا اخبار اور جمعیت کے ممتاز ارکان اور اس کے ذمہ دار کارکن مسلمانوں کو اس مہلک راستے کی طرف کھینچے لیے جا رہے ہیں اور مسلمان سمجھ رہے ہیں کہ یہ جمعیت کی پالیسی ہے۔ یہ آخر کیا صورتِ حال ہے اور کب تک جاری رہیگی؟ ان بزرگوں کے مراتب عالیہ کا احترام مانع نہ ہوتا تو میں انکو چیلنج دیتا کہ اگر آپ کے پاس کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ یا بدرجۂ آخر عقل ہی سے اس طرزِ عمل کیلیے کوئی دلیل ہے تو اسے سامنے کیوں نہیں لاتے تاکہ ہم بھی اسے دیکھیں اور حق ہو تو اسکا اتباع کریں۔ اور اگر آپ کے پاس کوئی دلیل نہیں، اور محض اپنے نفس کے رجحانات ہیں تو آپ کو

---

[1] مولانا کی اس بے خبری کو دور کرنے کے لیے متعدد چیزیں انکی خدمت میں پیش کی گئیں تاکہ وہ ان کو پڑھ کر رائے قائم فرمائیں۔ مگر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ مولانا کو ان کے پڑھنے کی فرصت نہیں ملی۔ سوال یہ ہے کہ جب مولانا کو مطالعہ کیلیے فرصت نہیں ملتی تو قوم کی رہبری کے لیے کیوں فرصت مل جاتی ہے؟ حالات زمانہ اور مسائل وقت سے بے خبر رہ کر قوم کی رہبری کرنا ایک امر عجیب ہے!

کیا حق ہے کہ اس قوم کو اپنے رجحاناتِ نفس کے اتباع کی دعوت دیں جو آپ پر عالم دین ہونے کی حیثیت سے بھروسہ کرتی ہے، نہ کہ عمرو زید ہونے کی حیثیت سے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے پروپیگنڈا، اور شخصی نزاعات اور سب وشتم کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ بزرگان قوم کی پگڑیاں اچھالنے والوں، اور سیاسی اختلافات کو ذاتی عداوت میں تبدیل کرنے والوں کی روش سے میں ہمیشہ بیزار رہا اور آج بھی بیزار ہوں۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہو سکتی کہ اپنی قوم کے جن اکابر کا انتہائی احترام میرے دل میں ہے، ان کے خلاف زبان کھولوں۔ اکابر قوم تو درکنار ایک عامی مسلمان کی عزت بھی میرے لیے نہایت بیش قیمت ہے۔ لیکن صرف دو چیزیں ہیں جو مجھکو اس وقت زبان کھولنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ ایک یہ کہ میرے نزدیک خدا کا دین اور اسکی امت مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور ہر تعلق سے زیادہ قیمتی ہے، اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اسکو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اسکی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز ہو، دوست ہو، استاد ہو یا میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملہ میں کسی تعلق یا کسی نیازمندی کی پرواہ کرنے سے میں بالکل معذور ہوں۔ جب کسی کو میرے اس طرز عمل سے تکلیف ہو وہ، اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دیگا تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کرونگا، بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہونگا خواہ وہ دنیوی لحاظ سے حقیر ترین آدمی ہو۔ اور اگر وہ مجرد شکایت کریگا تو میں صاف عرض کرونگا کہ حق کے معاملہ میں بڑے اور چھوٹے، اپنے اور پرائے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس شخص کو میں کسی دینی یا قومی معاملہ میں غلطی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، خود اسکی عاقبت کا خیال مجھے مجبور کرتا ہے کہ دنیا ہی میں اس کو اصلاح کی طرف لانے کی کوشش کروں

میرے نزدیک ہر مسلمان کا اور خصوصاً مسلمانوں کے علماء اور اکابر کا میرے اوپر یہ حق ہے کہ ان کو ایسی غلطیوں سے بچانے کی کوشش کروں جنکے متعلق میں اپنی تحقیق کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں وہ ان پر ماخوذ ہونگے، اور یہی حق میرا بھی دوسروں پر ہے، اگر وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔ لوگوں کو میری نیت پر شبہ کرنے کا اختیار ہے، مگر میرا ضمیر اپنی جگہ مطمئن ہے کہ میں جس سے اختلاف کرتا ہوں اسکی بھی خیر خواہی میرے دل میں ہوتی ہے، نہ کہ بدخواہی۔

اس وقت میں علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھ رہا ہوں کہ جو لوگ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو انکی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں اُس راستہ کی طرف لے جارہے ہیں جس میں انکے جان و مال کا نہیں بلکہ ایمان اور اخلاق کا زیاں ہے، وہ اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ شاید قیامت کے روز خدا کی میزان میں وہ اپنی عمر بھر کی عبادتوں اور اپنی تمام دینی خدمات کو اس ایک گناہ کی بدولت ضائع ہوتے دیکھ کر عک دک رہ جائینگے۔ اسلیے سراسر انکی خیر خواہی کا جذبہ مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ حق اور باطل کے فیصلہ کو اُس روز کے لیے نہ چھوڑو جب تلافی کا وقت باقی نہ رہیگا۔ خدا کی کتاب، اسکے رسول کی سنت، اور اسکی دی ہوئی عقل، تینوں چیزیں احقاق حق و ابطال باطل کیلیے یہیں موجود ہیں۔ آؤ! ان کے ذریعہ تحقیق کریں کہ حق کیا ہے۔ اُس شخص کی طرح نہ بنو جسکے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (جب اسے کہا جائے کہ خدا سے ڈر تو جھوٹی عزت کا خیال اس کو پکڑے اور وہ گناہ پر جما رہے)۔ خطابت، سخن پروری، سفسطہ، منطقی اینچ پینچ، سب اس دنیا ہی میں چل سکتے ہیں۔ آخرت میں نہیں چل سکتے۔ بندوں کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ خدا کا منہ بند نہیں کر سکتے۔ ہم تم سے وہ جواب نہیں چاہتے جو دنیا والوں کو دے کر چپ کیا جاتا ہے۔ ہم وہ جواب چاہتے ہیں جو تم نے خدا کی عدالت میں پیش کرنے کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ شاید کہ یہیں اس کی

غلطی واضح کی جاسکے، اور تم خدا کی پکڑ سے بچ جاؤ۔

علماء کا مرتبہ یقیناً بڑا ہے، اور ان کا احترام ہر مسلمان پر واجب ہے، مگر ان کا مرتبہ جتنا بڑا ہے اتنی ہی بڑی انکی ذمہ داری بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو انبیائے بنی اسرائیل سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح بنی اسرائیل کے انبیاء اپنی قوم کی ہدایت کے ذمہ دار اور اس کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ تھے، اسی طرح خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علمائے اسلام مسلمانوں کی ہدایت کے ذمہ دار ہیں، اور اگر انکی غفلت یا غلط رہنمائی سے مسلمانوں میں کوئی گمراہی پھیلے تو وہ خدا کے سامنے اسکے جوابدہ ہونگے۔ اسی بنا پر حضور نے اپنی امت کیلیے جن تین چیزوں کو سب سے زیادہ خطرناک بتایا ہے ان میں اولین چیز زَلَّۃُ العالم (عالم کی لغزش) ہے، کیونکہ عالم کی لغزش ایک پوری قوم کیلیے موجب ضلالت بن سکتی ہے۔ اسی بنا پر بزرگوں نے عالم کی لغزش کو کسر سفینہ سے تشبیہ دی ہے، کہ جس طرح کشتی کے ٹوٹنے سے اسکے تمام مسافر ڈوب جاتے ہیں، اسی طرح عالم کی غلط روی سے لاکھوں کروڑوں بندگانِ خدا قعرِ ضلالت میں جا گرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے علماء کی خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان میں خوفِ خدا ہونا چاہیے (اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ) کیونکہ خدا کا خوف اور یوم الحساب کی بازپرس کا خطرہ ہی انسان کو ضالّ و مضل بننے سے بچا سکتا ہے۔

پس ہندوستان کے جو علماء کرام خدا اور رسول کے ارشادات کو سند میں لاکر دعوے کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی رہنمائی کا اصلی حق انہی کو پہنچتا ہے اور وہی اس قوم کے فطری لیڈر ہیں، انہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حق نرا حق ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ساتھ ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ بھی لاتا ہے۔ امتِ محمدیہ کے آٹھ کروڑ افراد کی رہنمائی کوئی کھیل نہیں ہے کہ اس کو انجام دینے میں وہ

سہل انگاری برتی جائے جو برتی جارہی ہے۔ یہ ایسا نازک کام ہے کہ اس میں ذراسی لغزش ایک پوری قوم اور اس کی آئندہ نسلوں کیلئے تباہی اور گمراہی کا راستہ کھول سکتی ہے، اور اپنے مرتکبین کو خدا کے سامنے اس حال میں لیجا کر کھڑا کر سکتی ہے کہ ان کے سر پر صرف اپنے ہی گناہوں کا بوجھ نہ ہو، بلکہ موجودہ اور آئندہ دور میں جو جو مسلمان انکے کھولے ہوئے راستہ پر چل کر گمراہ ہوا س کے ہر ہر گناہ کا ایک حصہ انکے حساب میں بھی لکھ دیا گیا ہو، اور کروڑوں بندگانِ خدا انکے مقابلہ میں استغاثہ کر رہے ہوں کہ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا۔ ایسے نازک کام کی ذمہ داریوں کا صحیح احساس جن رہنماؤں کے دل میں ہو، ان کے لیے تو راتوں کی نیند حرام ہو جانی چاہیے، ان کو تو ہر وقت تلاش حق میں بے چین رہنا چاہیے، ان کو تو اس خوف سے ہر وقت کانپتے رہنا چاہیے کہ نادانستگی میں وہ امت کو کسی غلط راستے پر نہ چلا لے جائیں، ان کو تو مشکوک راستوں سے بھی بچنا چاہیے، کجا کہ کسی راستہ کی غلطیاں، کسی راستے کے نقصانات، کسی راستے کے خوفناک امکانات ان کے سامنے کھول کھول کر پیش کیے جائیں، ان کو بار بار متنبہ کیا جائے، انہیں سمجھنے یا سمجھا دینے کی پیہم دعوت دی جائے، اور پھر بھی وہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہیں، اور اپنی کرنی سے باز نہ آئیں۔ جب علماء کی یہ روش ہو تو پھر انہیں بھی شکایت نہ کرنی چاہیے اگر قوم کی دوسری روش ہو۔

کلام کی رو میں بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ مجھے ابھی مولانا کی ایک اور بزرگانہ شکایت کا جواب دینا ہے۔

ماہ شوال (جنوری ۳۸ء) میں "متاع کارواں" کے عنوان سے "ساربان" کا جو مضمون

شائع ہوا ہے اسکے صفحہ ۴۷-۴۸ پر سندر لال جی الٰہ آبادی کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے ستمبر ۳۵ء میں مہاتما گاندھی کے نام لکھا تھا۔ یہ خط اکتوبر ۳۵ء کے "جامعہ" میں شائع ہوا اور اسکے بعد اردو کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے متعدد اخبارات و رسائل میں گشت کرتا رہا۔ اس میں من جملہ اور باتوں کے ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "مولانا سید سلیمان ندوی جیسے ودوان جنہوں نے اپنی یوم النبی کی چھپی ہوئی تقریر میں بجائے حضرت محمدؐ کے سوامی محمدؐ لکھا ہے" مولانا کا ارشاد ہے کہ یہ محض بہتان ہے۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں لکھا۔

میں اس پر نادم ہوں کہ میں نے تحقیق کیے بغیر اسکی اشاعت کو جائز رکھا۔ یہ فروگذاشت صرف اس وجہ سے ہوئی کہ مولانا نے اسوقت تک اس الزام کی تردید نہیں فرمائی تھی، اور ادھر یہ خیال تھا کہ سندر لال صاحب کا یہ خط سال ڈیڑھ سال کی طویل مدت میں اس کثرت سے شائع ہو چکا تھا کہ مولانا اور دار المصنفین کے تمام ارکان کا اس سے بے خبر رہنا متصور نہ تھا۔ تاہم عذر گناہ کا میں قائل نہیں، اپنی غلطی تسلیم کر کے مولانا سے معذرت خواہ ہوں۔

دار الاسلام پہنچنے کے بعد پہلا کام جو کیا گیا وہ یہ تھا کہ یہاں کی مسجد کو اس علاقہ کیلئے مسجد جامع قرار دیکر پانچ پانچ میل تک کے دیہات میں اعلان کرا دیا گیا کہ آئندہ سے وہ جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے یہاں آیا کریں۔ خطیب کے فرائض میں نے خود اپنے ذمہ لیے، اور نہایت سہل زبان میں، جس کو ایک ان پڑھ دیہاتی بھی سمجھ سکے، خطبات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ الحمد للہ کہ اس کا اثر خاطر خواہ رونما ہوا۔ پہلے جمعہ میں قریب قریب ۵۰ آدمی تھے۔ دوسرے میں ۶۰ آئے، اور تیسرے میں ۱۵۳ تک تعداد پہنچ گئی۔ اردو کے خطبہ سے لوگوں میں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے کہ ۵ میل کی حد سے باہر کے لوگ بھی خطبہ سننے کیلئے آجاتے ہیں۔ اس سے زیادہ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دیہات

کے لوگ خطبات کو کافی دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، اور نماز سے واپس جا کر ان کا مفہوم دوسرے لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔

یہ مسلمانوں کی تنظیم کا پہلا قدم ہے۔ لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تنظیم کی صورت کیا ہے؟ اس کا پروگرام کیا ہے؟ یہ کروڑوں کا انبوہ جو لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلا ہوا ہے اسکو آخر کس طرح منظم کیا جائے؟ ان تمام سوالات کی بنا اپنے دین اور اسکے اصول سے ناواقفیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کیلیے تو حقیقت میں تنظیم کا پروگرام بنا بنایا پہلے سے موجود ہے ہر مسلمان کے اندر منظم ہونے کی فطری استعداد ہر وقت قوت سے فعل میں آنیکے لیے تیار رہتی ہے۔ وہ خدا اور رسول پر ایمان لانیکے ساتھ ہی ایک انجمن کا ممبر بن چکا ہے۔ اب اس کے سوا کسی چیز کی حاجت نہیں کہ اسکی ممبرشپ کو تازہ کر دیجیے، اسے یاد دلا دیجیے کہ یہی وہ انجمن ہے جس کا تو ممبر ہے اور خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہر ہفتہ اس کو اپنے مرکز کی طرف سمٹتے رہنے کی عادت ڈال دیجیے۔ جمعہ کی طاقت وہ زبردست طاقت ہے جو آٹھ کروڑ مسلمانوں کو دیکھتے دیکھتے ایک کانگریس بنا سکتی ہے۔ یہ ایسا ماس کانٹیکٹ (ربط عوام) ہے جسکا تصور بھی کسی جواہر لال اور کسی گاندھی کے دماغ میں نہیں آسکتا۔ اسی کے ذریعہ سے آپ جمہور مسلمین کی تمدنی اصلاح، معاشی فلاح، تعلیم عمومی، اور سیاسی تنظیم کے سارے پروگرام بتدریج عمل میں لا سکتے ہیں، بشرطیکہ جمعہ کی طاقت کو سمجھنے والے اور اس سے حکمت کے ساتھ کام لینے والے پیدا ہو جائیں، اور ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان اور پرانے گروہ کے علماء، جو خیالاتِ خام کے پیچھے دوڑتے پھر رہے ہیں، ایک ضابطہ کے ساتھ ان تھک کوشش کرنے کیلیے آمادہ ہو جائیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ یہ کام کسان کا سا صبر چاہتا ہے، اور اسے صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو جلسوں اور جلوسوں

کی چاشنی کے بغیر خشک اور بے مزہ محنت کی تلخیاں اپنے مقصد کی دھن میں گوارا کرسکتے ہوں۔

جو حضرات درحقیقت کچھ کام کرنا چاہتے ہیں، اُنکو میں مشورہ دونگا کہ اسی طرز پر اپنے حلقوں میں جمعہ کی مرکزیت قائم کرنیکی کوشش کریں، اور اس اجتماع سے، زیادہ سے زیادہ جتنا کام لینا ممکن ہو، لیں۔ - اپنے خطباتکو میں نمونہ کے طور پر "ترجمان القرآن" میں شائع کرتا رہونگا۔ ان سے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اختلافی مسائل سے بچ کر خطبۂ جمعہ سے عامۂ مسلمین کو اصولِ دین کی تعلیم دینے اور انکے اندر مسلمان ہونے کا احساس زندہ کرنیکا کام کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہاں جمعہ کی مدد سے تنظیم و اصلاحِ عوام کا کام جس جس طریقہ سے لیا جائیگا اسکی تفصیلات بھی شائع کی جاتی رہینگی، تاکہ جو لوگ کام کرنا چاہتے ہیں وہ اس طریقہ کی پیروی کرسکیں۔ اسکا یہ مدعا نہ سمجھ لیا جائے کہ لوگ بجنسہٖ انہی خطبوں کو پڑھیں یا ھوبہو ان کاموں کی نقل اتاریں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اصول اور طریق کار سمجھ لینا چاہیئے، اور اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے اس کو عمل میں لانا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں دو چیزوں کی طرف میں علمائے کرام کو خاص طور پر توجہ دلاؤنگا۔

ایک تو دیہات میں نماز جمعہ کا مسئلہ ہے، جس کے متعلق فقہائے حنفیہ کے فتوے سے عام مسلمانوں میں سخت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دیہات کے باشندوں سے جمعہ کا فرض ساقط ہوگیا ہے، اور اقامت جمعہ کیلیے گھروں کی ایک مخصوص تعداد اور منڈی و بازار گویا منصوص ہیں۔ اس چیز نے فرضیت جمعہ کے مقصد ہی کو فوت کردیا ہے، اور اس سے مسلمانوں کی جماعت کو نقصانِ عظیم پہنچ رہا ہے۔ فقہ حنفی پر جہانتک میں نے غور کیا ہے، میرے نزدیک اسکی رو سے یہ بالکل صحیح ہوگا اگر ایک ہی حلقہ کے مسلمان باہمی اتفاق سے کسی گاؤں کو اغراض جمعہ کیلیے مصر جامع قرار دے لیں، چاہے وہاں بازار ہو یا نہ ہو اور مسلمانوں کی آبادی کم ہو یا زیادہ۔ اس قاعدہ کو تسلیم

کر لینے سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ جگہ جگہ دیہی حلقوں میں مساجد جوامع بن جائینگی اور یہ لکھو لکھا مسلمان جو دیہات میں منتشر ہیں، اقامت جمعہ کے ذریعہ سے باہم مربوط ہوتے چلے جائینگے۔ خود متقدمین حنفیہ کا منشا بھی اقامت جمعہ کے لیے مصری شرط لگانے سے یہی تھا، اگر الفاظ کی غلامی سے نکل کر مقصد اور روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

دوسری چیز خطبۂ جمعہ کی زبان ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ علماء کا ایک بڑا گروہ غیر عربی میں خطبہ دینے کو مکروہ سمجھتا ہے، اور جن وجوہ کی بنا پر ان کا یہ خیال ہے وہ بڑی حد تک معقول ہیں۔ لیکن آخر مکروہ اور حرام میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ مکروہات کو محرمات کا درجہ دینا درست نہیں۔ شریعت میں یہ اصول مسلّم ہے کہ اگر کسی امر مکروہ سے کوئی بڑی مصلحت شرعی حاصل ہوتی ہو تو اسکو اختیار کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن بھی ہوسکتا ہے۔ اسی بنا پر بعض بدعات کو حسنات میں شمار کیا گیا، حالانکہ بدعت فی نفسہٖ مکروہ ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس مصلحت کے وقت میں اگر ہم جمعہ کے غیر عربی خطبہ سے مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم کا اچھا کام لے سکتے ہیں تو یہ بدعت آخر کیوں بدعت حسنہ نہیں ٹھیرائی جاسکتی۔ اسکے نقصانات سے اس کے فوائد، دنیوی نہیں بلکہ دینی فوائد..... بہت زیادہ ہیں، اور ایک مکروہ ایسے ہی فوائد کی بنا پر جائز اور مستحسن بن سکتا ہے۔

شوال کی اشاعت میں "دارالاسلام" کا مضمون شائع ہوتے ہی ناظرین ترجمان القرآن میں ایک حرکت پیدا ہوگئی اور اس کثرت سے خطوط آنے شروع ہوگئے جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ مسلمان اسوقت ایک صحیح لائحۂ عمل کیلیے کسقدر بے چین ہو رہے ہیں۔ میں اسکو ایک فال نیک سمجھتا ہوں۔ پیاس کا احساس ہی پانی کے فراہم ہونیکی تمہید ہے۔ لیکن میں اپنے بھائیوں سے کہونگا کہ زیادہ بے صبری نہ کریں۔ شور و ہنگامہ کیساتھ قوم میں ایک وقتی ہیجان پیدا کر دینے کا طریقہ بارہا آزمایا جاچکا ہے اور ثابت ہوچکا ہے کہ یہ طریقہ قوم کو بنانے میں کچھ بھی کارگر نہیں ہوسکتا۔ اب ہمیں کوشش کرنی ہے کہ صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق مضبوط بنیادوں پر ایک تعمیری تحریک اٹھے اور وہ پھیلنے کی اتنی حریص ہو جتنی استحکام کی حریص ہو۔ ہم آگ ضرور لگانا چاہتے ہیں، اکے بے

مقالات

غیر مسلموں کیساتھ مسلمانوں کا برتاؤ

(از جناب مولوی مشتاق احمد صاحب - مدرستہ الاصلاح سرائمیر)

انسانی فطرت کے عجائب میں سے یہ بھی ایک بڑا عجوبہ ہے کہ انسان اکثر اپنے عیوب سے بے خبر اور دوسروں کو الزام دینے میں جری ہوتا ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر تو اسے نظر نہیں آتا، مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا تلاش کرنے میں یکایک اسکی اندھی آنکھ خوردبین بن جاتی ہے، اور جب خوردبینی سے بھی کام نہیں چلتا تو بینائی سے گذر کر خلاقی پر اتر آتی ہے، جب تلاش کیے سے بھی کوئی تنکا اسے نہیں ملتا تو خود پیدا کر کے بتاتی ہے۔

اسپین فتح کر کے مسلمانوں نے کیا کیا اور پھر اسی ملک پر غالب ہو کر فرنگیوں نے کیا کیا؟ صقلیہ پر جب مسلمان حکمراں ہوئے تو وہاں صدیوں تک عیسائی آبادی کتنی رہی اور پھر جب فرنگی اس پر قابض ہوئے تو وہاں کی مسلمان آبادی کہاں چلی گئی؟ یہودیوں نے ساتھ مسلمانوں نے اپنی حکومت میں کیا سلوک کیا اور فرنگیوں نے کیا کیا اور اب تک کر رہے ہیں؟ غیر قوموں پر قابو

بقیہ مضمون صفحہ ۱۰۲۔ حرارت کے زندگی نہیں، مگر ہمیں وہ آگ درکار نہیں ہے جو گھر پھونکنے والی ہو، بلکہ وہ آگ درکار ہے جو کھانا پکا سکے، یعنی ضابطہ کے اندر رہنے والی آگ، جسکا ٹمپریچر ضرورت کے مطابق گھٹایا بڑھایا جا سکتا ہو۔ ایسے کام کے لیے سب سے زیادہ نازک وقت، ابتدائے کار ہی کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر بنیاد کمزور پڑ جائے تو اس پر پوری عمارت کمزور اٹھتی ہے۔ لہذا ہمارے دردمند بھائی ذرا صبر سے کام لیں۔ انشاءاللہ الکریم ایک ایک قدم تدریج اور ترتیب کیساتھ اٹھایا جائیگا، اور ہر قدم اٹھانیکے ساتھ ناظرین رسالہ کو اسکی اطلاع دی جاتی رہیگی۔

یا کر رنگ و نسل کا امتیاز کس نے کیا ؟ انکی زبان، تہذیب اور انفرادیت کو کس نے کچلنے کی کوشش کی ؟ (Lynching.) جسکا ہم معنی کوئی لفظ عربی، فارسی یا اردو لغت میں پایا ہی نہیں جاتا کس کی ایجاد ہے ؟ (Colour bar.) کا موجد کون ہے ؟ اپنے عقائد اور اصول سے مختلف عقائد اور اصول رکھنے والوں کو نیست و نابود کرنے کیلیے عدالتیں اور (Concentration camps.) قائم کرنے اور Purge. اور Putsch. کا نامتناہی سلسلہ جاری کرنیکا فخر کسے حاصل ہے ؟ یہ چند سوالات ہیں جنکا جواب تاریخ سے پوچھو اور خود اس زمانہ میں جرمنی، اٹلی، فرانس، بلجیم، روس، انگلینڈ، ہالینڈ اور امریکہ جیسی مہذب قوموں کے کارناموں میں تلاش کرو پھر ذرا تاریخ سے یہ بھی پوچھو کہ انسان کو شودر بنانیکا شرف کسے حاصل ہوا ہے ؟ آدمی کو ملیچھ، راکشس اور پشاچ میں منتقل کرنیوالے کون ہیں ؟ پیدائش کے لحاظ سے انسانوں کے طبقات مقرر کرنا کس کی ایجاد ہے ؟ آدمی کی خلقی نجاست کا چالیس چالیس قدم تک متعدی ہونا کس نے تحقیق کیا ؟ آدمی کا محض ہاتھ لگ جانیسے ایک بڑے کنوئیں کا ناپاک ہوجانا کس کی دریافت ہے ؟ آدمی کے کلام کی نجاست سے بچنے کیلیے اینٹ اور پتھر کو دو آدمیوں کے درمیان بات چیت کا واسطہ بنانیکی نادر تدبیر جنہوں نے ایجاد کی وہ کون تھے ؟ پھر ذرا تاریخ سے یہ بھی دریافت کرو کہ بودھ مت کے باشندوں پر برہمنیت کے متبعین جب غالب آئے تو انہوں نے کیا کیا اور ہندوستان پر جب مسلمان حکمراں ہوئے تو انہوں نے کیا کیا ؟ اس سوال کو تاریخ کے سامنے بھی پیش کرنیکی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کی مردم شماری میں بودھ مت والوں اور ہندوؤں کی آبادی کے اعداد و شمار دیکھ لینا ہی بس کافی ہے۔

ان روشن حقائق کو سامنے رکھ کر جب آپ دیکھینگے کہ وہی لوگ جنکے کارناموں کیطرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، آج مسلمانوں پر ناروا داری، تنگ نظری، تعصب، خونخواری اور ظلم و ستم کے الزامات رکھتے ہیں، تو آپکو انسانی فطرت کی اُس اعجوبگی و طرفگی کا کمال نظر آجائیگا جسکو ہم نے اپنے مضمون کی تمہید میں بیان کیا ہے۔ دیدہ دلیر مجرم کی یہ تعریف سنی تھی کہ وہ الٹا کوتوال کو ڈانٹتا ہے، مگر اب ایسے ہوشیار مجرم بھی دیکھنے میں آئے کہ وہ اپنا الزام کوتوال کے سر تھوپ دیتے ہیں، اور معصوم بنکر اس

شان سے پروپیگنڈا نہیں بلکہ ساحری کرتے ہیں کہ (۱۶) خود کوتوال غریب اپنے متعلق شک میں پڑ جاتا ہے۔

پہلے فرنگی مصنفین نے صدا بلند کی، اور پھر انکے ہندوستانی شاگردوں نے آواز اُٹھائی کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے، مسلمانوں کو قتل و خونریزی کی تعلیم دیتا ہے، اسلام کو بجبر دوسری قوموں پر مسلط کیا گیا، غیر قوموں کو مسلمانوں نے ذلیل و خوار کر کے رکھا اور ظلم و ستم سے پامال کیا، وغیر ذالک من الخرافات۔ یہ صور اس طرح پھونکا گیا کہ خود صور پھونکنے والوں کے کارناموں سے دنیا کی توجہ ہٹ گئی، اور سب کے سب اسلام اور مسلمانوں پر پلٹ پڑے، اور خود مسلمانوں میں بہت سے سادہ لوح اس شک میں پڑ گئے کہ کہیں واقعی ہمارا ہی دامن تو داغدار نہیں۔ چنانچہ سرسید اسکول کے مصنفین نے پچھلی صدی میں جس طرح مرعوبانہ انداز سے اسلام اور مسلمانوں کی صفائی پیش کی وہ اس ساحری کے کمالات کی ایک واضح مثال ہے۔

اس مضمون میں ہم صفائی کی نیت سے نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت کی غرض سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن نے غیر قوموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کرنے کی تعلیم مسلمانوں کو دی ہے، اور مسلمانوں نے اس تعلیم کے مطابق کیسا برتاؤ ان کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم جو حقائق بیان کرینگے ان کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اگر ناظرین دوسری قوموں کے پچھلے کارنامے، اور ان کے موجودہ طرزِ عمل کے مرتبح شواہد کو بھی پیشِ نظر رکھیں، تو ان پر یہ حقیقت کھل جائیگی کہ غیر مسلم قوموں کی حکومت دراصل دنیا کے لیے ایک مستقل عذاب ہے، اور دنیا کو امن و چین صرف اس وقت نصیب ہو سکتا ہے جب قرآنی دستور العمل رکھنے والے انسان روئے زمین پر حکمراں ہوں۔

دنیا کے کسی مذہب کی تعلیمات میں آپ کو یہ قاعدہ نہیں مل سکتا کہ اُس مذہب کے پیرو تمام ان پیشوایانِ مذہب اور تمام ان صحیفوں پر ایمان لائیں جو خدا کی طرف سے دنیا کے کسی ملک اور کسی عہد میں آئے ہوں، اور اسی طرح ایمان لائیں جس طرح وہ خود اپنے نبی اور اسکی لائی ہوئی کتاب پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف قرآن کی ہے کہ وہ اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ

مسلمانو! تمہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ تمام گذشتہ پیغمبروں پر بھی ایمان لانا چاہیے کیونکہ اسلام تمام گذشتہ مذاہب کی ایک تکمیلی شکل ہے، روزِ اوّل سے ایک ہی صداقت اور ایک ہی حقانیت کی تعلیم کے لیے تمام انبیا آتے رہے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ان سے الگ کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ

(آل عمران – ۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا (کسی اور دین کی) تلاش میں ہیں، حالانکہ (جو مخلوقات) آسمانوں میں ہیں اور جو ..... زمین میں ہیں چار و ناچار اُسی کے مطیع ہیں، اور اسی کی طرف سب کو لوٹ جانا ہے۔ اے محمدؐ ان سے کہدو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کتاب ہم پر اُتری اُس پر، اور جو صحیفے ابراہیم اور اسماعیل، اور اسحٰق اور یعقوب پر اُترے ان پر اور موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو جو کتابیں اس کے رب کی طرف سے دی گئیں ان پر، ہم تو ان پیغمبروں میں سے کسی ایک میں تفریق نہیں کرتے اور اسی ایک خدا کے مطیع ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہر قوم کے پیغمبر پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ حکم تو ان انسانوں کے متعلق ہے جو خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں، جو خدا کی عبادت کرتے ہیں، جنکے پاس خدا کی طرف سے انبیاء آئے اور جنہیں آسمانی کتابیں عطا کی گئی ہیں۔ اب اُن انسانوں کے بارے میں بھی اسلام کا آخری حکم سُن لیجیے جو پروردگارِ عالم کی پرستش نہیں کرتے، جو عالم

کائنات کے خالق کے سامنے اپنی پیشانیاں خم نہیں کرتے، جنکی تمامتر توجہات کا مرکز پتھر کی مورتیں ہیں، جو اپنی ہر طرح کی خواہش کی تکمیل اپنے بتوں سے چاہتے ہیں، جنکے نزدیک آفتاب و ماہتاب اور دوسری مخلوقات قابلِ پرستش ہیں۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الانعام - ۱۳)

اور جنکو یہ لوگ خدا کے بجائے پکارتے ہیں انکو گالی مت دو کیونکہ وہ جہالت کی بنا پر حد سے گذر کر اللہ کی شان میں گستاخی کرینگے۔ اسی طرح ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل ہم نے مرغوب بنا رکھا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب کے پاس جانا ہے جو ان کے اعمال ان پر ظاہر کرے گا۔

پھر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم غیر قوموں کے ساتھ سختی سے مت پیش آؤ۔ ان کے ساتھ تمہیں حسن سلوک کرنا چاہیئے۔ اگر تم ان کے ملکوں اور خاندانوں میں دعوت و تبلیغ کرنا چاہو تو وہ راہ اختیار کرو جو حکمت اور موعظت کی ہے، جس میں صرف افہام و تفہیم مقصود ہو۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (النحل - ۱۶)

اے پیغمبر لوگوں کو حکمت و موعظت کی باتوں سے خدا کے راستہ کی طرف بلاؤ اور اگر ان سے بحث کرو تو اس طور پر جو احسن و پسندیدہ ہے تمہارا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اسکی راہ سے بھٹک گیا ہے اور اس کو بھی جو سیدھے راستہ پر آنے والا ہے۔

مذکورۂ بالا آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام غیر اقوام کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنے

کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کسی حال میں یہ جائز نہیں رکھتا کہ مسلمان دوسری قوموں پر زیادتی کریں۔ یا اپنے طرزِ عمل سے ان میں جہالت کا جوش بھڑکائیں، یا حدِ اعتدال سے گذر کر اپنے اخلاق کا کوئی بُرا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہی نہیں، اس سے بڑھ کر وہ کہتا ہے کہ اگر دوسرے تم پر زیادتی کریں، اور ظلم و عدوان پر اتر آئیں تب بھی تم آپے سے باہر نہ ہو، جوشِ انتقام میں انسانیت کی حد سے نہ گذر جاؤ، اور ہر حال میں عدل کو پیشِ نظر رکھو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (المائدہ - ۱)

اور انہوں نے جو تمہیں مسجدِ حرام کی طرف جانے سے روکا تھا تو یہ عداوت تم کو ان پر زیادتی کرنے پر آمادہ نہ کردے۔ تم نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (المائدہ - ۲)

اے اہلِ ایمان! تم خدا کی خاطر حق پر قائم رہنے والے اور انصاف کیساتھ شہادت دینے والے بنو اور کسی قوم کی عداوت تمکو ایسا کثر نہ بنادے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ نہیں تم انصاف ہی کرو کہ یہی شیوہ پرہیزگاری سے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ

اور بُرائی کا بدلہ اتنی ہی بُرائی ہے جتنی کی گئی ہو۔ پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرے اسکا

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (الشوریٰ - ۴)

اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اللہ بے شک ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جس پر ظلم کیا جائے اور وہ اس کا بدلہ لے تو ایسے لوگوں پر کوئی گرفت نہیں۔ گرفت صرف ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق ناروا زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلیے دردناک عذاب ہے اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کردے تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے

قٰتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقٰتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔

(البقرہ - ۲۴)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑیں، مگر زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن حکیم میں جہاں مسلمانوں کو جہاد کیلیے ابھارا گیا ہے وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ہر وقت صلح کیلیے تیار رہنا چاہیے، کیونکہ اسلام کے نزدیک جنگ محض دو وجہوں سے جائز ہو سکتی ہے۔

(۱) مدافعت کیلیے۔

(۲) اصلاح کیلیے۔ یعنی دنیا کے اندر امن و سلامتی کا قانون جاری رکھنے کیلیے۔

اب اگر ان میں سے کوئی مقصد بغیر جنگ کے حاصل ہو جائے یا کوئی ایسی راہ نکل آئے جو ان مقاصد کے خلاف نہ ہو تو اسے فوراً قبول کر لینا چاہیے کیونکہ شدید ضرورت کے بغیر انسانی خون کا ایک قطرہ بھی بہانا قرآن کے نزدیک جائز نہیں۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ (الانفال - ۸)

اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو کیونکہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر ان کا ارادہ تم سے دغا کرنے کا بھی ہوگا تو تم کچھ پروا نہ کرو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنین کی طاقت سے تمہاری تائید کی۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ جب تمہارے دشمن جنگ سے ہمت ہار بیٹھیں، اور ان میں تلوار اٹھانے اور جنگ کرنے کی سکت باقی نہ رہے اور یہ معلوم ہو کہ وہ تم سے صلح کرنا چاہتے ہیں تو تمہیں اس حال میں ان سے جنگ کرنے کا حق نہیں ہے۔ تم ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے بلکہ اس وقت تمہیں فوراً صلح کر لینی چاہیے۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (النساء - ۱۲)

پس اگر وہ تم سے ہاتھ روک کر الگ ہو جائیں اور لڑنا چھوڑ دیں اور تمہارے پاس پیغام صلح بھیجیں تو پھر ان پر دست درازی کرنے کا کوئی راستہ اللہ نے تمہارے لیے نہیں رکھا ہے

پھر حکم دیا کہ اگر دشمنوں میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لینے آئے تو اسے قتل نہ کرو بلکہ اُسے اپنی امان میں رہنے کی اجازت دو اور زمانۂ قیام میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور جب وہ اپنے وطن واپس جانا چاہے تو پوری حفاظت کیساتھ اس کے وطن پہنچا دو۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ

اور مشرکین میں سے اگر کوئی شخص تم سے

اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ (التوبہ - ۱)

پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو تاکہ وہ کلام خدا کو سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ اسلام سے نا واقف ہیں۔ (اس طرح انہیں جاننے اور سمجھنے کا موقع ملیگا)۔

یہ تو وہ صورتیں تھیں جن میں خود دشمن صلح کا خواستگار ہو۔ اب ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کو اس وقت دشمنوں کے سامنے صلح پیش کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ (محمد - ۴)

اعداء کے مقابلہ میں ضعیف نہ بنو اور انھیں اس وقت صلح کی دعوت دو جبکہ تم غالب و سربلند ہو۔

غور کرو! یہ کتنا بلند اور اعلیٰ درجہ کا اصول ہے۔ آج دنیا کی قومیں اس وقت صلح کرتی ہیں جب ان کے اندر طاقت کم ہوتی ہے، اور وہ دشمنوں سے جنگ کرنیکی قوت اپنے اندر نہیں پاتیں، یا کم سے کم انھیں مقابل کی طاقت سے خطرہ ہوتا ہے۔ اس وقت دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں میں صلح کیوں ہے؟ جرمنی، اٹلی، جاپان، فرانس، روس اور برطانیہ ایک دوسرے سے کیوں نہیں لڑتے؟ صرف اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کو کھا جانے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتے اور مقابل کی طاقت ان کو خوفناک نظر آتی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی اتنا طاقت ور ہو جائے کہ دوسرے کو بآسانی نگل سکتا ہو، تو وہ اس "کار خیر" میں استخارہ کی بھی راہ نہ دیکھے گا۔ اس کے بالکل برعکس اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ جب تم طاقت ور اور بالادست ہو، اس وقت تم صلح کرو۔ جب دوسروں کو پامال کرنے کا زور تم میں ہو، اس وقت تم پامال کرنے سے باز رہو۔ جب تم کھانے اور

نگلنے کا ہل رکھتے ہو اس وقت کھانے اور نگلنے کے بجائے امن اور سلامتی قائم کرو۔ اس لیے کہ تم دنیا میں آدم خوری کے لیے نہیں بھیجے گئے ہو بلکہ آدمیت کا شرف قائم کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ تم زمین پر خدا کے خلیفہ ہو۔ زمین والوں پر خدا کی لعنت نہیں ہو۔ تمہیں خدا نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ اس کی زمین پر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرو۔[1]

اب اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس بات کیلیے درکار ہے کہ دنیا میں قرآن کے سوا اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو عدل اور امن قائم کرنے کے صحیح اصول بتاتی ہو اور متبعین قرآن کے سوا اور کوئی اس کا اہل نہیں کہ زمین پر عدل اور امن قائم کرے۔

اس کے بعد یہ دیکھیے کہ جو غیرمسلم قومیں اسلامی حکومت کے دائرے میں آجائیں ان کی جان و مال اور ان کے مذہب اور ان کے اصولِ تہذیب و تمدن کے ساتھ کس قسم کا معاملہ برتنے کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔

فتح مکہ سے قبل کوئی ایسی قوم حکومتِ اسلامی کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئی تھی جو بحیثیت رعایا کے سمجھی جاتی یا جسے غیرمسلم قوم سے تعبیر کیا جاتا۔ فتح مکہ کے بعد جب اسلام کو عروج ہوا تو بہت سی قومیں اسلامی سلطنت میں داخل ہوئیں اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان کے لیے کوئی منظم اصول بنایا جاتے۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصول مرتب کیے، جنکی بعد کے خلفاء اور اسلامی بادشاہوں نے پوری رعایت ملحوظ رکھی۔ وہ اصول یہ ہیں۔

(۱) کوئی دشمن ذمی کفار پر حملہ کرے گا تو ان کی مدافعت کی جائیگی۔

(۲) ذمیوں کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائیگا۔

(۳) جزیہ کی ادائیگی کیلیے انھیں محصل کے پاس نہیں جانا ہوگا بلکہ محصل خود جاکر وصول کریگا

[1] یہ خیالات الجہاد فی الاسلام سے ماخوذ ہیں تفصیل کیلیے اصل کتاب کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے۔

(۴) ان کی جان و مال کا اسی طرح تحفظ کیا جائیگا جس طرح مسلمان رعایا کی جان و مال کا کیا جاتا ہے۔

(۵) ان کے تجارتی قافلوں کی حفاظت کا باقاعدہ انتظام اسلامی حکومت کریگی۔

(۶) ان کی اراضیات پر کوئی غاصبانہ قبضہ جائز نہ رکھا جائیگا۔

(۷) ان کو اپنی املاک پر پورے حقوق مالکانہ دیئے جائینگے۔

(۸) ان کے مذہبی عہدوں اور مناصب میں کوئی تغیر و تبدل نہ کیا جائیگا۔

(۹) ان کی عبادتگاہوں اور ان کے مذہبی مراسم میں کسی طرح کی دست اندازی نہ کی جائیگی۔

(۱۰) ان پر خود انہی کے مذہبی و تمدنی قوانین نافذ کیے جائینگے، حتیٰ کہ مجوسیوں کے ہاں اگر بہن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے تو اسلامی حکومت بھی ان کے لیے اس کو جائز رکھیگی۔

(۱۱) ان کے ملکی حقوق (Civil rights) اور واجبات وہی ہونگے جو مسلمانوں کے ہیں۔ اور فوجداری قانون کی نگاہ میں وہ اور مسلمان مساوی ہونگے۔

(۱۲) ان کی جن ریاستوں کو اسلامی حکومت اپنی حفاظت میں لے گی ان کے علاقہ میں کوئی فوج نہ بھیجی جائیگی۔

(۱۳) ان سے فوجی خدمت نہ لی جائیگی اور نہ جزیہ کے علاوہ کوئی اور رقم انکی حفاظت کے لیے طلب کی جائیگی۔ اور اگر اسلامی حکومت انکی حفاظت سے عاجز ہو تو جزیہ واپس کر دیا جائیگا۔

ان قواعد و ضوابط کا ماخذ وہ اعلانات (Proclamations.) ہیں جو مختلف غیر مسلم آبادیوں کو اپنی حفاظت میں لیتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمائے تھے۔ مثال کے طور پر ہم وہ اعلان نقل کرتے ہیں جو نجران کے عیسائیوں کو لکھ کر دیا گیا تھا۔

ولنجران وحاشیتها جوار اللہ و ذمۃ محمد النبی رسول اللہ

علی انفسہم وملّتہم وارضہم واموالہم وغائبہم وشاھدھم وعبیدھم وبعثہم وامثلتہم۔ لا یغیر ما کانوا علیہ ولا یغیر حق من حقوقھم وامثلتھم ولا یفتن اسقف من اسقفیتہ ولا راھب من رھبانیتہ ولا واقہ من وقاھیتہ علی ما تحت ایدیھم من قلیل او کثیر ولیس علیھم رھق ولا دم جاھلیۃ ولا یحشرون ولا یعشرون ولا یطاء ارضھم جیش۔[1]

یہ چند اصول تھے جنکو آنحضور صلعم نے اسلام کے زیر سایہ رہنے والی قوموں کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان قواعد کو سامنے رکھکر غور کیجیے کہ عہد نبوی سے لیکر آج تک جن سلطنتوں نے اپنی محکوم قوموں کے ساتھ انتہائی فیاضانہ برتاؤ کیا ہے، کیا ان میں سے کسی نے بھی اتنے وسیع حقوق و مراعات عطا کیئے ہیں؟ انگریزی حکومت موجودہ زمانہ کی حکومتوں میں محکوم قوموں کیلیے سب سے زیادہ فیاض مشہور ہے۔ مگر خود دیکھ لیجیے کہ دونوں حکومتوں کے اصولوں میں زمین و آسمان کا بُعد ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ جس قدر اصول مقرر کیے گئے تھے ان پر خلفاء اسلام اور مسلمانوں نے کہانتک عملدرآمد کیا۔ سب سے زیادہ اس بحث کے فیصلہ کے لیے جس دور کے واقعات مناسب ہیں وہ دور فاروقی ہے، کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ کا زمانۂ خلافت کافی طویل ہے جس میں اسلامی حکومت کے تمام قواعد و ضوابط مرتب اور عملاً نافذ ہو گئے تھے، اور وہ تصویر مکمل ہو چکی تھی جس کا خاکہ عہد نبوی و عہد صدیقی میں تیار ہوا تھا۔

آج جن قوموں کو اپنے عدل و انصاف پر ناز ہے، جنکو اپنے نظام حکومت پر فخر ہے، وہ بھی

---

[1] کتاب الخراج للامام ابی یوسف رح

عدل اور رواداری کی ویسی مثال نہیں پیش کرسکتیں جیسی فاروقی عہد میں ملتی ہے۔ مفتوحین کے ساتھ ان کے برتاؤ کو فاروق اعظم کے برتاؤ سے کوئی مناسبت نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ذمی اور مسلمان کے خون کی قیمت یکساں ہے۔ اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کریگا تو وہ اسی طرح قتل کیا جائیگا جس طرح مسلمان کے قتل کی صورت میں ذمی قتل کیا جائیگا۔ جماعتیں اور قومیں دعوی کرتی ہیں کہ ہم بھی اسی اصول پر قائم ہیں لیکن کیا انگریزوں کا ہندوستان میں اور فرانسیسیوں کا شمالی افریقہ میں یہی عمل ہے ؟ اس کے برعکس مسلمانوں کو دیکھیے کہ یہاں جو اصول پیش کیا گیا اس کے مطابق عمل بھی کرکے دکھا دیا گیا۔ دور فاروقی میں ایک مرتبہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے قبیلہ والوں کے سامنے حاضر کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور مقتول کے وارثوں نے اسکو تہ تیغ کر دیا[1]۔

حضرت عمرؓ کے پاس ایک عیسائی غلام تھا۔ آپ برابر اس کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کرتے تاکہ وہ اسلام قبول کرلے لیکن وہ اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اگر آپ چاہتے تو اس پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔ مگر آپ نے کبھی اپنا حاکمانہ اثر استعمال نہ کیا۔ وہ آخر وقت تک آپ کے پاس رہا اور عیسائی رہا۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی بالکل وہی طریقہ رہا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تھا۔ دور عثمانی میں جبکہ کوفہ کی گورنری پر ولید بن عقبہ مامور تھے ایک یہودی نے شعبدہ بازی کے بہت سے تماشے دکھائے۔ اس پر جندب بن کعب کو جو مشہور تابعی ہیں خیال ہوا کہ کہیں یہ کوئی فتنہ نہ کھڑا کردے۔ چنانچہ انھوں نے یہودی کو قتل کر دیا۔ ولید نے فوراً ان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ جب وہ گرفتار کرکے لائے گئے تو ولید بن عقبہ نے یہودی کے قصاص میں انھیں قتل کرنا چاہا۔ لیکن

---

[1] زیلعی، تخریج ہدایہ صفحہ ۳۳۸ و ۳۳۹

اس وقت ایسا کرنے میں بڑا خطرہ تھا، ممکن تھا کہ قتل کے باعث ان کا قبیلہ برانگیختہ ہو جاتا اور اس طرح ایک مہلک جنگ چھڑ جاتی۔ اس لئے ولید نے انھیں قید کرنے کا حکم دیا تاکہ موقع پاکر انہیں قتل کرا دے۔ داروغہ جیل کو جندب بن کعب کے حال پر رحم آگیا اور اس نے کہا کہ تم چپکے سے رات کو نکل جاؤ ورنہ قتل کردیے جاؤ گے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میرے ساتھ اس طرح کی کارروائی ہونے والی ہے تو وہ رات کو قید خانے سے نکل بھاگے۔ صبح جب ولید کو ان کی فراری کی خبر معلوم ہوئی تو داروغہ پر بہت خفا ہوا اور کہا یقیناً قیدی کے بھگانے میں اسکا ہاتھ شریک تھا، اسی کی شرارت سے ایسا ہوا ہے اس لئے اس کے بدلے داروغہ کی گردن زدنی کا حکم دیا اور اس کے حکم کے مطابق داروغہ قتل کردیا گیا[۱]۔ ہم یہاں اس سے بحث نہیں کرتے کہ داروغہ کا قتل غلط تھا یا صحیح۔ ہمیں محض یہ دکھانا مقصود ہے کہ خلفائے اسلام اور مسلمان غیر قوموں کے حقوق کا کتنا پاس کرتے تھے۔

خلیفۂ چہارم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا صاف اعلان تھا کہ "من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا ودیتہ کدیتنا"۔ چنانچہ آپ ہمیشہ اسی پر عامل رہے۔ آپ کے زمانے میں ایک مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کردیا۔ آپ نے مسلمان کو گرفتار کرا کے مقتول کے قبیلہ کے سپرد کردیا۔ قبیلہ والوں نے خون بہا لیکر قاتل کو رہا کردیا۔ اس پر حضرت علیؓ نے انہیں بلا کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے تم لوگ قاتل کے قبیلہ سے ڈر گئے۔ ان لوگوں نے کہا نہیں ہم لوگوں نے اپنی خوشی سے ایسا کیا ہے۔ کسی کے خوف سے ایسا نہیں ہوا ہے[۲]۔

جنگ صفین کی تیاری ہے۔ ٹھیک فوج کی روانگی کے وقت خلیفۂ چہارم کی زرہ کھوئی

---

[۱] مسعودی ذکر خلافت کتاب الاوائل میں اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کیساتھ نقل کیا ہے۔

[۲] زیلعی صفحہ ۲۰۸۔

جاتی ہے - جنگ سے واپس آنیکے بعد وہی زرہ آپ ایک یہودی کے پاس دیکھتے ہیں اور جب اس سے زرہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ صاف ..... انکار کرتاہے اور کہتاہے کہ یہ زرہ میری ہے، یہ تو سالہا سال سے میرے پاس ہے - گو آپ کو کامل یقین ہے کہ یہودی سراسر جھوٹ بول رہا ہے اور اس میں آپ کو کسی قسم کا شبہ نہیں کہ زرہ آپ کی ہے، لیکن اس کے باوجود آپ اپنے اختیارات خصوصی سے کام نہیں لیتے، اور رعیت کے ایک معمولی فرد کی طرح عدالت میں دعویٰ دائر کرتے ہیں - قاضی عدل و انصاف کے سامنے یہ نہیں دیکھتا کہ حضرت علیؓ خلیفۂ وقت ہیں - اسے آپ کی شخصیت کا کوئی خیال نہیں ہوتا بلکہ آپ کی جلالت اور مرتبہ کو نظر انداز کرکے قانون کے مطابق آپ سے زرہ کی ملکیت پر شہادت طلب کرتا ہے، آپ اپنے ایک غلام اور اپنے صاحبزادے امام حسنؓ کو شہادت میں پیش کرتے ہیں - قاضی ..... صاف کہتاہے کہ امام حسنؓ کی شہادت اس معاملہ میں معتبر نہیں اس لیے کہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کے دعوے پر بیٹے کی شہادت تسلیم نہیں کی جاسکتی - یہ عدل دیکھکر یہودی بےساختہ کلمہ پڑھکر مسلمان ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ جس دین میں یہ عدل و انصاف ہے اور جس کے ماننے والے اس قدر صداقت پرست ہیں وہ یقیناً سچا اور قابلِ اتباع مذہب ہے۔

بعد کے خلفاء کے متعلق بھی تاریخ میں ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومتوں نے عموماً غیر مسلم رعایا کے ساتھ وہی برتاؤ کیاہے جسکی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اور جب کبھی اس سے انحراف کیا گیا، علماء اسلام نے اسکی مخالفت کی - مثال کے طور پر مسجد دمشق کے واقعہ کو لیجیے - جب دمشق میں مسلمان آبادی بڑھی اور ضروریات کے لیے مسجد ناکافی پائی گئی تو حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے چاہا کہ کنیسۂ یوحنا کو خرید کر مسجد میں شامل کرلیں - مگر عیسائیوں نے قبول نہ کیا اور حضرت معاویہ خاموش ہوگئے - پھر خلیفہ عبدالملک بن مروان نے

عیسائیوں کو بہت بڑی رقم دے کر کنیسہ لینا چاہا۔ مگر ان کے انکار پر خلیفہ خاموش ہو گیا۔ پھر خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد حکومت میں بہت بڑی رقم دے کر کنیسہ خریدنے کی کوشش کی اور جب عیسائی راضی نہ ہوئے تو اس نے جبراً اس کو توڑ کر مسجد میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد جب حضرت عمر ابن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حکم دیا کہ مسجد میں جتنا حصہ اس گرجا سے لیکر بڑھایا گیا ہے اسے عیسائیوں کے حوالہ کر دیا جائے[1]

خلیفہ منصور نے جب شہر بغداد کو دارالسلطنت بنانا چاہا تو آس پاس کی زمینوں کو غیر قوموں سے قیمت دیکر حاصل کیا اور چپہ بھر زمین بھی کسی ذمی سے نہ چھینی[2]۔

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرس (Cyprus.) کے باشندوں کو جلاوطن کر کے شام میں آباد کیا تو اس پر فقہائے اسلام سخت ناراض ہوئے اور اسے گناہ عظیم سمجھا۔ اور جب یزید بن ولید نے ان کو پھر قبرس واپس کیا تو عام طور پر اس کی تعریف کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف ہے[3]۔ ایک مرتبہ جبل لبنان کے ذمی باشندوں نے بغاوت کی صالح بن علی بن عبداللہ نے ان کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی اور ان کے ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کر کے آبادی کے ایک بڑے حصہ کو جلاوطن کر دیا۔ اس پر امام اوزاعی نے سخت احتجاج کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسے یاد دلایا کہ "جو کوئی کسی ذمی پر ظلم کریگا اور اسکی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا اس کے خلاف قیامت کے روز میں خود مدعی بنونگا[4]"

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۱۳۱ - ۱۳۲ -

[2] فتوح البلدان صفحہ ۳۰۳ -

[3] فتوح البلدان صفحہ ۱۶۳ -

[4] فتوح البلدان صفحہ ۱۶۹ -

مذہبی معاملات میں بھی اسلام نے غیر قوموں کو جو آزادی دی تھی اس کی نظیر کوئی قوم اور کوئی حکومت نہیں پیش کر سکتی۔ اوپر وہ اصول بیان ہو چکے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم قوموں کے مذہبی حقوق کے متعلق مقرر فرمائے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں جو چیز ہے وہ اعتقادات اور مذہبی اعمال اور مذہبی قوانین اور مذہبی عبادتگاہوں اور ان کے متعلقہ عہدوں کی کامل آزادی ہے۔ ان اصولوں کے مطابق عمل کرنے میں اسلامی حکومت نے اتنی راستبازی کا ثبوت دیا ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی کی شراب یا اسکے خنزیر کو بھی تلف کیا ہے تو اس کا تاوان ذمی کو دلوایا گیا ہے۔[1]

یہاں ہم مذہبی معاملات کے متعلق وہ چند میثاق نقل کرتے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت اسلامی فرمانرواؤں نے غیر مسلم مفتوحین کو لکھ دیے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب حیرہ پر مسلمانوں کا تسلط ہوا تو آپ نے وہاں کے عیسائیوں کو یہ میثاق لکھ کر دیا۔

لا یھدم لھم بیعة ولا کنیسة	ان کے گرجے اور کنیسے نہیں ڈھائے
ولا یمنعون من ضرب النواقیس	جائیں گے، انھیں سنکھ بجانے اور اپنے
ولا من اخراج الصلبان فی	تہواروں میں صلیب نکالنے سے روکا
یوم عیدھم[2]	نہیں جائیگا۔

مقام عانات پر جب حضرت خالدؓ کو فتح ہوئی تو وہاں کے پادریوں کو آپ نے جو اقرارنامہ لکھ کر دیا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

---

[1] درالمختار جلد ۳ ص ۲۷۳۔
[2] کتاب الخراج صفحہ ۸۴۔

لا یھدم لھم بیعة ولا کنیسة علی ان یضربوا نواقیسھم فی ای ساعة شاؤا من لیل او نھار الا فی اوقات الصلوٰة۔ علی ان یخرجوا الصلبان فی ایام عیدھم

ان کے گرجے مسمار نہیں کیے جائینگے اوقات نماز کے سوا رات اور دن میں وہ جب چاہیں ناقوس بجائیں اور اپنے تہواروں میں صلیب نکالنے کی ان کو آزادی ہوگی۔

حضرت عمرؓ فاروق نے بیت المقدس کی فتح کے بعد جو اقرار نامہ لکھا وہ بعینہٖ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

اعطاھم امانا لانفسھم و اموالھم ولکنائسھم وصلبانھم و سقیمھا و بریھا وسائر ملتھا انہ لا یسکن کنائسھم ولا تھدم ولا ینتقص منھا ولا من حیزھا ولا من صلبھم ولا من شیءٍ من اموالھم ولا یکرھون علی دینھم ولا یضار احد منھم۔

ان کو امان دی، ان کی جان و مال اور ان کے کنیسوں اور صلیبوں اور ان کے تندرستوں اور بیماروں کے لیے یہ امان ایلیا کی تمام ملتوں کیلیے ہے، عہد کیا جاتا ہے کہ ان کے کنیسوں کو مسلمانوں کا مسکن نہ بنایا جائیگا نہ ان کو منہدم کیا جائیگا نہ ان کے احاطوں اور ان کی عمارتوں میں کوئی کمی کی جائیگی نہ ان کی صلیبوں اور ان کے اموال میں سے کسی چیز کو نقصان پہنچایا جائیگا، ان پر دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی جائیگی اور نہ ان میں سے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا جائیگا۔

حضرت ابو عبیدہ نے بعلبک کے عیسائیوں کے لیے ان لفظوں میں صلحنامہ لکھا۔

ؔ کتاب الخراج صفحہ ۸۷۔

هٰذا كتاب امان لفلان بن فلان واهل بعلبك، رومها وفرسها وعربها على انفسهم واموالهم وكنائسهم ودورهم داخل المدينة وخارجها وعلى ارحائهم - من اسلم فله مالنا وعليه ما علينا - ولتجارهم ان يسافروا الى حيث ارادوا من البلاد التى صالحنا عليها - وعلى من اقام منهم الجزية والخراج -

یہ امان نامہ ہے فلان ابن فلان اور اہل بعلبک کیلیے عام اس سے کہ وہ رومی ہوں یا فارسی یا عربی امان ہے ان کی جان، مال کنائس اور عمارات کیلیے عام اس سے کہ وہ شہر کے اندر ہوں یا باہر اور امان ہے ان کی چکیوں کیلیے - ان میں سے جو مسلمان ہوجائیگا اس کے وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور اس کے وہی فرائض ہیں جو ہم پر فرض ہیں - اور ان کے تاجروں کو حق ہوگا کہ جن ملکوں سے ہماری صلح ہوچکی ہے ان میں آزادی کیساتھ آمدو رفت کریں - اور ان میں سے جو اپنے دین پر قائم رہیگا اس پر جزیہ اور خراج ہے -

اسی قسم کے معاہدات قریب قریب تمام ان علاقوں کے باشندوں سے کیے گئے تھے جن کو مسلمانوں نے فتح کیا، اور ہمیشہ ان کی پابندی سختی کے ساتھ کی گئی - اگر کبھی کسی مسلمان حکمراں نے ان کی خلاف ورزی کی بھی تو مسلمانوں کی رائے عام نے اسے کبھی پسند نہ کیا اور ان کے ماہرین قانون نے ایسے افعال کو ہمیشہ ناجائز ٹھیرایا، اور اکثر ایسا ہی ہوا کہ رائے عام کے دباؤ سے اسلامی حکومتوں کو اپنی غلطی کی تلافی کرنی پڑی - مثال کے طور پر عباسی خلیفہ ہادی کے زمانہ میں مصر کے گورنر علی بن سلیمان نے چند گرجوں کو مسمار کردیا تھا - ہادی کے انتقال کے بعد جب ہارون رشید خلیفہ ہوا تو اس نے علی بن سلیمان کو معزول کرکے اس کی جگہ موسیٰ بن عیسیٰ کو

مصر کا گورنر مقرر کیا اور موسیٰ نے مسمار شدہ گرجوں کے متعلق علماء سے فتوی دریافت کیا۔ تمام علماء نے بالاتفاق یہی فتوی دیا کہ ان گرجوں کو از سر نو تعمیر کیا جائے اور کہا کہ مصر میں جسقدر گرجے ہیں وہ صحابہ کے زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ مسمار شدہ گرجے حکومت کی جانب سے از سر نو تعمیر کیے گئے۔[1]

اسی طرح دمشق کا ایک گرجا ایک شخص کی شرارت سے قبیلہ بنی نصر کے قبضہ میں آگیا تھا، جب حضرت عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے تو آپ سے وہ گرجا عیسائیوں کو واپس دلایا۔[2] اسطرح کے بیشمار واقعات ہیں لیکن بسبب طوالت ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اسلامی دور میں گرجوں اور بتخانوں کی تعمیر کا حق غیر مسلموں کو نہ تھا۔ لیکن میں کہونگا کہ مذہبی تعصب کی عینک اصل حقیقت کو کبتک چھپائیگی۔ تاریخ میں ایک نہیں بیشمار واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء نے کبھی اس میں روکاوٹ نہیں پیدا کی۔ اسلامی بادشاہوں کی جانب سے اس بارے میں کوئی خاص پابندی عائد نہ تھی۔ خاص اسلامی شہر بغداد میں اس کثرت سے گرجے تعمیر ہوئے کہ ان کا شمار محال ہے اگر کوئی انکا استقصار کرنا چاہے تو اسے معجم البلدان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قاہرہ میں جو گرجے ملتے ہیں وہ سب اسلامی عہد کے تعمیر کردہ ہیں۔ خالد بن عبداللہ قسری نے اپنی گورنری کے زمانہ میں خود اپنی عیسائی ماں کیلیے ایک گرجا تعمیر کرایا۔[3] عضدالدولہ نے جو ایک مشہور بادشاہ گذرا ہے اپنے وزیر کو گرجوں اور بتخانوں کی تعمیر کا عام اختیار دیا تھا۔ اس کے زمانہ میں عیسائیوں اور

---

[1] تاریخ مقریزی جلد دوم صفحہ ۵۱۱

[2] النجوم الزاہرہ واقعات ۱۰۱ھ

[3] ابن اثیر واقعات ۳۶۹ھ

غیر مسلم قوموں کے ساتھ بڑی بڑی مراعات کی گئیں، چنانچہ شاہی حکم کے مطابق ۳۶۹ھ میں مختلف اسلامی شہروں میں گرجے تعمیر ہوئے[۱]۔ اسلامی دور میں صرف یہی نہ تھا کہ گرجوں کی تعمیر کی اجازت تھی بلکہ ساتھ ہی یہ عام رعایت بھی تھی کہ جو جائدادیں گرجوں اور مذہبی اداروں پر وقف تھیں اُنکو بحال رکھا گیا۔ حتیٰ کہ گرجوں کے پادریوں اور بتخانوں کے پوجاریوں کو حکومت کی جانب سے وظیفے بھی ملتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص نے جب مصر پر قبضہ کیا تو گرجوں کے اوقاف کو علیٰ حالہ باقی رکھا[۲]۔ محمد بن قاسم نے جب سندھ کو فتح کیا تو تمام برہمنوں کو بلا کر وظیفے مقرر کیے، اُن کو جو اختیارات پہلے سے حاصل تھے ان کو باقی رکھا اور بتخانوں کی جاگیروں میں کوئی کمی نہیں کی[۳]۔

حضرت ابو بکرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک عورت نے مسلمانوں کی ہجو میں اشعار کہے جنکو سنکر ایک افسر سخت برہم ہوا اور اس نے جا کر اس عورت کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ صدیق اکبرؓ نے اس افسر کو خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"اگر وہ عورت مسلمان تھی تو اسے کوئی معمولی سزا دینی چاہیے تھی تاکہ اسے ایک طرح کی تنبیہ ہو جاتی اور اگر وہ ذمی تھی تو اس سے درگذر کرنا چاہیے تھا اس لیے کہ جب ہم نے ذمیوں کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور جب ہم ان کے شرک سے چشم پوشی کرتے ہیں تو یہ جرم تو بہت معمولی تھا[۴]۔"

---

[۱] ابن الاثیر واقعات ۳۶۹ھ

[۲] تاریخ مقریزی جلد دوم صفحہ ۴۹۴

[۳] تاریخ سندھ مصنفہ علی بن حامد۔

[۴] تاریخ طبری واقعات ۱۱ھ

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مَرو کے بطریق (پیٹریارک) نے ایران کے لارڈ بشپ کو ایک خط لکھا تھا جس کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

"اہل عرب جنکو اس وقت پروردگار نے تمام دنیا کا بادشاہ بنایا ہے ہمارے مذہب پر کوئی حملہ نہیں کرتے ہماری مذہبی روایات کا پورا لحاظ کرتے ہیں، ان کی حکومت میں ہمیں ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل ہے، یہی نہیں بلکہ مذہبی کاموں میں وہ ہماری ہر طرح کی اعانت کرتے ہیں، ہماری عبادتگاہوں اور گرجوں کیلیے عطیے دیتے ہیں، ہمارے پادریوں کی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

مسلمانوں کے متعلق یہ ایک بدگمانی پھیلائی گئی ہے کہ ان کے دورِ حکومت میں سول سروس بالکل مسلمانوں کے لیے مختص تھی اور غیر مسلموں کے لیے مناصب حکومت کے دروازے بند تھے۔ لیکن ہمارا قانون اور ہماری تاریخ دونوں اسکی تردید کرتے ہیں۔ قرآن حدیث اور فقہ تینوں ایسے کسی حکم سے خالی ہیں جس کا منشا یہ ہو کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے ان کی اہلیت کے مطابق خدمت نہ لی جائے۔ اسی طرح تاریخ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلامی حکومتوں نے اس باب میں کبھی متعصبانہ پالیسی اختیار کی ہو۔ خلافت راشدہ خالص مذہبی حکومت تھی۔ مگر اس میں ذمیوں سے حکومت کی خدمت لی جاتی تھی۔ خلافت اموی میں مالگذاری اور حساب کا پورا صیغہ ذمیوں کے ہاتھ میں تھا۔ خلافت عباسی میں کونسا عہدہ تھا جسکا دروازہ ذمیوں کے لیے بند ہو۔ ان خلفاء کی حکومت میں ذمیوں کو بڑے بڑے عزت کے منصب حاصل تھے۔ مثلاً خلیفہ مامون کے دربار میں مشہور عیسائی بختیشوع کا جو مرتبہ تھا وہ مسلمانوں کے اکابر کو بھی حاصل نہ تھا۔ مامون اس کو اپنے رنج کے مشوروں میں شریک کرتا، اپنے خاص معاملات میں اس سے رائے دریافت کرتا، اور اسکی رائے پر عمل کرتا۔ اس کا عام اعلان تھا کہ جو کوئی میرے پاس درخواست پیش کرنا چاہے اُسے بختیشوع کے

ذریعہ سے بھیجنا چاہیے، چنانچہ بڑی بڑی ہستیاں بختیشوع کے ذریعہ اپنی اپنی عرضیاں شاہی دربار میں بھیجتی تھیں۔ کیا اس سے بڑھکر کوئی حکومت غیر اقوام کو اپنے یہاں اعزاز بخش سکتی ہے۔

خلیفہ معتضد کے دربار میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، تمام اراکین سلطنت کھڑے رہتے تھے، لیکن ثابت بن قرہ کو بیٹھنے کی عام اجازت تھی، حالانکہ ثابت بن قرہ ذمی تھا۔ ایک دن معتضد ثابت بن قرہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے تفریح کے لیے جارہا تھا۔ دفعتہً معتضد نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ثابت خوف سے کانپ اٹھا۔ معتضد نے کہا ڈرو نہیں، بات یہ ہے کہ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ سے اوپر تھا اس لیے میں نے کھینچ لیا کیونکہ تم علمی دنیا کے بادشاہ ہو، تمہیں حق ہے کہ تم اپنا ہاتھ اوپر رکھو۔

یہاں مثالوں کے انبار لگانا مقصود نہیں۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس باب میں مسلمانوں نے جتنی فیاضی سے کام لیا ہے اسکی نظیر دنیا کی کسی حکمراں قوم میں نہیں مل سکتی۔ یہاں ایک چھوڑ بیسیوں مثالیں ایسی موجود ہیں کہ غیر مسلم رعایا کے افراد کو گورنری اور وائسرائلٹی اور سپہ سالاری تک کے عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ مگر اس جمہوریت کے دور میں کوئی انتہائی آزاد خیال قوم بھی ایسی فیاضی کی مثال پیش کرسکی؟ اسکی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسلام کی تعلیم مسلمانوں کو انسانیت کی قدر کرنا سکھاتی ہے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ انسان کو اسکے وطن یا اسکی نسل یا اسکی زبان کے لحاظ سے نہیں بلکہ اسکے انسانی اوصاف کے لحاظ سے دیکھے۔ بخلاف اس کے غیر مسلم خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو اس ڈھنگ پر تربیت پاتا ہے کہ انسانی نقطۂ نظر کو اس کے ذہن میں نشو و نما ہی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ انسان اور انسان کے درمیان اوصاف انسانی کے لحاظ سے نہیں بلکہ عوارض مادی کے لحاظ تمیز کرتا ہے اور یہ بیگانگی کیفیت اسکی آنکھوں پر اسطرح چھائی ہوئی ہے کہ علم و عقل کی کوئی ترقی اسکی اس بیماری کو پوری طرح دور نہیں کرسکی۔ دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسی تہذیب ہے جسکے ماحول میں تربیت پاکر انسان اس بیماری سے نجات پاسکتا ہے۔

اسلام اور اجتماعی زندگی

(ترجمہ و تلخیص، از مولوی حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی)

[ذیل میں لندن کے ایک ہندو سالسٹر مسٹر آر۔ اے نہرا کے فاضلانہ مقالہ کا ملخص ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ موصوف نے یہ مقالہ اسلامک سوسائٹی لندن کے جلسہ میں پڑھا تھا۔]

تین اسباب ہیں جن کی بنا پر ایک ہندو اس بحث پر تقریر کر رہا ہے۔ سب سے پہلا سبب یہ ہے کہ میں اگرچہ ہندو پیدا ہوا، لیکن بچپن سے ہمیشہ مسلمان ہمسایوں اور دوستوں میں رہا۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہندو مسلمان الگ الگ نہیں رہتے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہندو مذہب اپنے پیروؤں کو یہ نہیں سکھاتا کہ وہ دوسرے مذاہب کو برا کہیں یا نظر حقارت سے دیکھیں۔ رواداری اور غیر ضرر رسانی، ہندو دھرم کے اساسی اصول ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ میں نے مذہب اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اور پندرہ سال سے اسلامی قانون کی پریکٹس کر رہا ہوں۔ میں اپنے موضوع کو ذیل کے تین عنوانات میں تقسیم کرونگا۔

(۱) کاروباری اخلاق۔ (۲) عام اخلاق۔ (۳) صنفی اخلاق۔

میں ہر عنوان میں اختصار برتوں گا کیونکہ ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنے بیانات کی توضیحی مثالیں بھی دینی ہیں جو مجھے اپنے چند سال کے پیشہ کے تجربات میں ملی ہیں۔

میں یہ بات صاف صاف کہنا چاہتا ہوں، کہ میرا موضوعِ تقریر، اخلاق کا وہ اصلی معیار ہے

جسکی حضرت محمدؐ کی عظیم المرتبت ہستی نے بناڈالی اور تبلیغ کی، اور جس پر انھوں نے اور ان کے پیچھے پیرووں نے عمل فرمایا۔ یہ معیار اتنا اعلیٰ ہے کہ عہدِ حاضر کا ہر وہ مرد یا عورت جو مادیت کے سیلاب میں غرق ہے، اس کے مطابق زندگی بسر کرنے میں دقت محسوس کریگا۔

سب سے پہلے کاروباری اخلاق کو لیجیے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ روئے زمین پر اسلام ہی وہ اکیلا مذہب ہے جو سُود کو حرام قرار دیتا ہے۔ اگر آپ اس مفید ترین و اعلیٰ اصول کی تحلیل کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ اقتصادی نظام، جسکا دارومدار سُود پر ہے، سراسر غلط ہے۔ روپیہ ایک جاندار چیز نہیں۔ وہ دوگنا چوگنا نہیں ہوتا۔ ایک پونڈ خواہ وہ چاندی کا ہو یا سونے کا، جہاں کہیں اور جس زمانہ میں بھی ہوگا، کسی طرح بھی وہ دو پونڈ میں متبدل نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک ہی پونڈ رہیگا، خواہ وہ کسی بادشاہ کے ہاتھ میں ہو، یا کاشتکار کے ہاتھ میں ہو، فوجی جنرل کے ہاتھ میں ہو، ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہو یا کاشتکار کے ہاتھ میں۔ یہی وجہ ہے کہ شارعِ اسلام نے اپنے متبعین کو سُود کے لینے اور دینے سے منع فرمایا۔ حرص کی ایجاد کردہ چیزوں میں سود، بنی نوعِ انسان پر بے رحمی کی بدترین شکل ہے، جسکا ارتکاب مادیت سے مغلوب اور روحانیت سے بے بہرہ مخلوق، احمقانہ پندار کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔ سود کے لین دین کے نتائج بہت دور رس، اور سوسائٹی کے سکونِ دماغی کو بُری طرح تہ و بالا کرنے والے ہوتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے قوانین کی رو سے ۴۸ فیصدی تک سود لینا روا ہے۔ شاید آپ حضرات میں سے بعض اس بات سے ناواقف ہوں کہ انگلستان میں ایک سود خوار ۴۸ فیصدی تک سود قانوناً لے سکتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک شخص آج سَو پونڈ قرض لیتا ہے تو سال بھر میں اسے ۴۰ پونڈ دینے ہونگے، اور دو سال گذر جانے پر زرِ اصل سے تقریباً دوگنی رقم دینی پڑیگی۔ اس مہاجنی سود کی بدولت خدا معلوم کتنے خاندان تباہ ہو چکے ہیں۔ میں نے خود ایسے واقعات دیکھے ہیں جن میں ان سُود

خواروں ہی کی وجہ سے تباہی آئی۔ جب کوئی شخص ان سود خواروں کے چنگل میں جا پڑتا ہے تو شرح سود کی زیادتی کی بدولت شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص حریص ساہو کار سے کہ پنجہ سے صحیح و سالم نکل سکے۔ موجودہ زمانہ کے ماہرین اقتصادیات، سود کے کاروبار کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ آخر کیوں؟ محض اس لیے کہ سود کے اصول کی وجہ سے اُنکے ہاتھ وہ رقم زائد لگ جاتی ہے جو اُنکی نہیں۔ یہ سودی کاروبار بہت ہی مہیب پیمانہ پر جاری ہے، جسکا نتیجہ یہ ہے کہ حرص اور خود غرضی، اپنی انتہائی خوفناک شکل میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے، اور اقوام عالم ایک قعر عظیم کے کنارے آ لگی ہیں اور ہر وقت اپنے ہاتھوں پیدا کی ہوئی تباہی میں جا گرنے کے لیے تیار ہیں۔

تعمیری انجمنیں، بینک اور بیمہ کمپنیاں سطحی اعتبار سے مضبوط معلوم ہونے کے باعث بہت ہی مفید اور ضروری ادارے سمجھی جاتی ہیں۔ اب میں آپ کے سامنے ایک ایسی مثال پیش کرونگا جو میرے جیسے پیشے والوں کو، اپنے پیشہ کے سلسلہ میں اکثر پیش آتی ہے۔ ایک شخص نے ایک مکان بارہ سو پونڈ میں خریدا۔ اور یہ طے پایا کہ وہ ماہ بماہ آٹھ پونڈ کی قسطیں ادا کریگا۔ ان آٹھ پونڈوں میں نصف سے زیادہ رقم، پہلے دس سال کے سود کی رقم ہے۔ وہ شخص سات سال تک یہ قسطیں کسی نہ کسی طرح ادا کرتا رہا۔ آٹھویں سال وہ بیمار پڑا، اور ساتھ ہی اسے اپنے کاروبار میں خسارہ ہوا، اور وہ تین ماہ تک قسطیں ادا نہ کر سکا۔ تعمیری انجمن، جو سود خوار ہی کی ایک معزز شیطانی شکل ہے، ہر ماہ اُس پر تاوان عائد کرتی رہی۔ میں اُس غریب مگر ایماندار خریدار کا مشیر قانونی تھا۔ وہ بیچارہ قسطیں ہی ادا کرنے سے قاصر تھا۔ یہ تاوان کا بار کہاں سے ادا کرتا۔ مگر قانوناً یہ تاوان لگانے والے سود خوار حق بجانب تھے۔ انجام کار، انجمن نے اپنے مشیران قانون کو اُس خریدار پر مقدمہ دائر کرنے کی ہدایت کی۔ میں نے ان کے پاس جا کر منت استدعا کی، اور اُس ایماندار

خریدار کی تفصیلی صورتِ حال بیان کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ہمیں افسوس ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، قاعدہ کی پابندی لازمی ہے" اور ڈائرکٹران بجز اسکے اور کچھ نہیں کر سکتے کہ واجب الادا قسطوں کی وصولی کا سلسلہ جاری رکھیں"۔ اسکے بعد انہوں نے مقدمہ دائر کیا اور بالآخر اُس مکان کا قبضہ حاصل کر کے اُس شخص کو معہ اُسکے گھر والوں کے اُس مکان سے جس میں انکے سات برس گذرے تھے، نکال باہر کیا۔ یہ ساری کارروائی ازروئے قانون جائز تھی، اور بعض لوگ کہینگے کہ یہی مناسب تھی۔ لیکن کیا انسانیت اسی کا نام تھا؟ اگر سود کا اصول نہ ہوتا تو یہ شخص زر اصل بآسانی ادا کر چکا ہوتا، اور کمپنی اتنی بیرحمی نہ کر سکتی۔ کیونکہ ایسی صورت میں کمپنی کو نہ کوئی ضرورت محسوس ہوتی اور نہ طبع دامنگیر ہوتی کہ وہ شخص مذکور پر مقدمہ چلاکر مکان پر قبضہ کریں اور اُس مکان کو پھر کسی ایسے شخص کے ہاتھ بیچ ڈالیں جو باقاعدہ اصل وسود ادا کرتا رہے۔ اسلام کے قانون کے مطابق ایک تاجر، اپنے ہم پیشہ تاجر یا دوست کو روپیہ قرض دیتا ہے اور مقروض اس رقم کو بیحد شکریہ اور احسانمندی کے ساتھ واپس کرتا ہے۔ خیال تو کیجیے کہ یہ اصول کتنا زیادہ مبنی بر انسانیت ہے، اور سود نہ لینے کے ...... اعلیٰ اور شریفانہ اصول میں کتنی خالص ہمدردی ومحبتِ ہمجنسی پنہاں ہے کوئی شخص بھی اپنے روپیہ کو سود پر چلا چلاکر اپنی حرص میں اضافہ نہیں کرتا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کاروباری معاملات میں انسانیت برتی جائیگی، خود غرضی میں کمی ہوگی تو اسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ زندگی کے جھگڑے گھٹیں گے اور روزمرہ کی زندگی اور کاروباری معاملات میں زیادہ اطمینان قلب نصیب ہوگا۔ میں عہدِ حاضر کے سودخوار اداروں کی شقاوت اور خارج از انسانیت کارروائیوں کی بیسیوں مثالیں دے سکتا ہوں۔ اسلام کے متعلق بہت سے لوگ، عجیب عجیب نظریے رکھتے ہیں، اور بہت کم ایسے ہیں جو اسلام کی اُس اصلی اور بے آمیز شکل کا مطالعہ کرتے ہیں جو اُسکے ضعیف دماغ والے اور محض زبانی پیرووں کی آمیزشوں سے پاک ہے۔

کاروباری اخلاق کے بعد ہم "صنفی اخلاق" کے موضوع کو لیتے ہیں۔ آپ میں سے بعض نے سُنا ہوگا کہ اسلامی قانون میں ایک اصول "خلوت صحیحہ" کا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ اخلاق کا بلند ترین اصول ہے جو انسانوں کے لیے اُنکے ان ذاتی تعلقات میں جو وہ صنفِ مقابل سے رکھتے ہیں، واجب العمل بتایا گیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اُن لوگوں کے فائدہ کے لیے، جو اس اصول سے ناواقف ہیں، اسکی تعریف بیان کردوں۔ اُس عظیم الشان شارع (اسلام) کے زمانہ میں گو کہ علم برق کا اتنا چرچا نہ تھا، لیکن وہ انسانی زندگی میں علحدگی کی ضرورت اور بھلائی سے بخوبی واقف تھے۔ سائنس کی اصطلاح میں بھی، انسانوں کا باہمی صنفی تعلق "برقی رو" ہی کا نام ہے۔

جس طرح انسانی زندگی کے تسلسل کے لیے یہ صنفی تعلق ضروری ہے، اُسی طرح یہ امر بھی ضروری ہے کہ وہ قواعد و اصول بھی عمل میں لائے جائیں جنکے ذریعہ انسانیت کا بہترین طریق پر تحفظ ہو سکے، اور اسکا قیام، بلا سوسائٹی کے تباہ و برباد ہوئے رہ سکے۔ انسان لازمی طور سے ایک پیکرِ اخلاق ہے۔ آپ نے یہ کہاوت سُنی ہوگی کہ "اگر دولت چلی گئی تو کچھ بھی گیا، اگر تندرستی چلی گئی تو کچھ چلا گیا، اور اگر اخلاق چلا گیا تو سب کچھ چلا گیا"۔ ایک انسان بغیر اعلیٰ اخلاق کے ایک درندہ سے بدتر، اور ایک سانپ سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اس لیے حضرت محمدؐ کی عظیم المرتبت ہستی نے اعلیٰ اخلاق کے تحفظ کا اعلیٰ ترین اصول (خلوت صحیحہ کی صورت میں) بیان فرمادیا۔ اسلامی قانون میں خلوت صحیحہ کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک مرد اور عورت جو ایک دوسرے کے غیر محرم ہیں، کسی جگہ اکٹھے اس حال میں پائے گئے کہ وہ تنہا ہیں، اور انہیں وہاں کسی قسم کا اندیشہ نہیں، تو قانون کے ظاہری اعتبار سے گویا وہ مرتکب جرم ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے گو کہ نیم قانونی الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن مطلب کی خاصی توضیح ہوگئی ہے۔

اب میں اُسی برقی رَو کی مثال کو پھر بیان کرتا ہوں۔ جو لوگ علم برق کے اصول سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ برقی رَو، مثبت اور منفی دو قسم کی ہوتی ہے۔ یہ دونوں قسمیں باہم ملنے کے لیے ہمہ وقت تیار اور بیتاب رہتی ہیں۔ جب تک ان دونوں کے مابین خاصا فاصلہ رہتا ہے یا دونوں کو علحدہ رکھنے والی کوئی چیز موجود ہوتی ہے، اس وقت تک یہ دونوں اپنے اپنے خول میں دوڑتی رہتی ہیں۔ لیکن جوں ہی علحدہ رکھنے والی چیز ہٹادی جاتی ہے، یا باہمی فاصلہ ایک خاص حد تک کم کردیا جاتا ہے، فوراً دونوں ایک دوسرے کی طرف لپکتی ہیں اور شعلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس موقع پر چاہے ساری دنیا مل کر شعلہ نہ اُٹھنے کی دعا کرے تب بھی اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہر چیز کے لیے فطرت نے قانون اور اصول مقرر کر رکھے ہیں۔ قانون توڑو گے تو اس کا انجام بھی بھگتو گے۔ انسانی اور اخلاقی دنیا بھی اٹل قوانین سے اُسی طرح جکڑی ہوئی ہے جسطرح جسمانی دنیا۔ بنابریں خلوت صحیحہ ہی کا اعلیٰ اصول مرد اور عورت کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ ترین اخلاق کو قائم رکھیں۔ یہی وہ اصول ہے جسکے مطابق یورپ میں لوگ نوجوانوں کو علحدہ رکھنے کیلئے "محافظ عورتیں" رکھتے ہیں۔ اسلام ان لوگوں کی ہرگز ہمت افزائی نہیں کرتا جو اچھے اصولوں کو قدیم اور دقیانوسی کہکر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے مانا کہ بہت سے مسلمان سچے مسلمان نہیں اور اسلام کے اعلیٰ معیار کے عامل نہیں۔ لیکن میرا مقصد تو صرف یہ جتانا ہے کہ اسلام میں ایک ایسا معیار موجود ہے۔ کون شخص ہے جو دُنیا میں بداخلاقی کے سیلاب کی روز افزوں زیادتی سے، جس کا نتیجہ دنیا کے روز افزوں زوال کی صورت میں نکل رہا ہے، بے خبر ہے؟ وہ دن کچھ دور نہیں، جبکہ ہمیں باوجود اسکے کہ ہم دنیا میں اہم اور معزز حیثیت رکھتے ہیں، ان لوگوں کی حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو اخلاق کے اعلیٰ اصول نہیں برتتے۔

موجودہ زمانہ کا رواج ہے کہ نوجوان مرد و عورت کھلے بندوں پھرتے رہتے ہیں اور

جب چاہیں بلا کسی پابندی کے باہم ملتے ہیں۔ یہ رواج دنیا کی موجودہ غیر اطمینان بخش حالت کا ذمہ دار ہے۔ مسرت گھٹ رہی ہے اور بے چینی بڑھ رہی ہے۔ میں نے انگلستان میں اپنی نو سالہ پریکٹس کے دوران میں بہت سے ازدواجی مقدموں میں پیروی کی ہے، جنہیں فریقین زیادہ تر انگریز تھے، اس سلسلے میں بیان کر سکتا ہوں کہ اُن زوجین کی زندگی جو اخلاق کے اعلیٰ معیار پر عامل نہیں ہوتے، کتنی ناخوشگوار ہوتی ہے۔ بعض بعض مسلمانوں نے بھی اپنے مذہب اور اُسکے اعلیٰ معیار کو بھلا کر اپنے سر مصیبت مول لی ہے۔ افراد کی، اور اُنکے توسط سے اقوام اور دنیا کی صحت اور مسرت کا دارو مدار، اخلاق کے اس اچھے اور عمدہ معیار پر ہے جو کاروباری زندگی اور خانگی زندگی دونوں میں برتا جائے۔ اسلام اس معیار کو بہم پہونچاتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ ہر مسلمان سچا مسلمان ہو جائے۔ کیونکہ اس وقت اسلام زیادہ پھیلے گا، اور دوسرے مذاہب سے وسیع تر اسکی اشاعت ہوگی۔

اب میں چند لفظ عام اخلاق کے متعلق کہوں گا۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر قسم کی نشہ آور چیزیں شراب وغیرہ کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی دنیا خصوصاً نئی دنیا، جان چکی ہے کہ روزمرہ کی عام زندگی کی بہتری اسی میں ہے کہ شراب جیسی بڑی چیز سے احتراز کیا جائے۔ اسلام اپنے ماننے والے کو کسی حال میں اور کسی رسم کے موقع پر شراب پینے کی اجازت نہیں دیتا۔ شراب کی خرابیاں بحیثیت مجموعی اتنی زیادہ مشہور و معروف ہیں کہ انکی تفصیل کی حاجت نہیں ہر سال انکی بدولت کتنے خانداں تباہ ہو جاتے ہیں، کتنے بھلے اور ہونہار اشخاص شروع ہی میں اپنے مفید کارنامہ ہائے حیات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسلام میں عیش پسندی کو بھی سختی کے ساتھ قابل تحقیر سمجھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لیے روا نہیں کہ وہ اپنی دیواروں پر، یا کہیں اور تصویریں لگائے۔ زندگی کی سادگی اس کا اعلیٰ ترین مقصد رکھا گیا ہے۔ یہ عیش پسندی ہی ہے

جو لوگوں میں تفرقہ ڈالتی، اور امیروں کو خود غرض اور غریبوں اور غیر مستحقوں سے بے پروا بناتی ہے۔ جو کچھ مغرب میں ہو رہا ہے، اس پر نظر ڈالیے۔ وہاں یہ ممکن ہے کہ ایک دولت سے لدا پھندا امیر لندن کے مشرقی حصہ میں ایک غریب بھائی رکھتا ہو۔ مغربی حصہ لندن کے تمام تھیٹر، سینما، اور رسٹورنٹ ہر روز بھرے رہتے ہیں۔ درآنحالیکہ لکھوکھا آدمیوں کو کھانا اور ضروری کپڑا میسر نہیں ہوتا۔ اور یہ صورت حال طبعی اور صحیح سمجھی جاتی ہے۔ افسوس، محض ذاتی مفاد کے لیے انسانی ہستیاں کتنی بری طرح انصاف اور راستی کے معیار کو توڑتی مروڑتی ہیں۔

(اسلامک ریویو)

بحوالہ "صدق"

مسلمان قوم ہیں یا فرقہ ؟

ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے یا فرقہ وارانہ ؟

(از جناب عزیز ہندی)

[ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک مستقل قوم کی ہے یا ایک جغرافی قوم کے فرقہ کی؟ یہ سوال اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اگر مختلف فیہ تھا تو صرف وطن پرست اور خدا پرست طبقوں کے درمیان تھا۔ مگر اب ہمارے سیاسی حالات کی ستم ظریفی نے اس سوال کو بھی خدا پرست طبقہ کے درمیان مختلف فیہ بنا دیا ہے اگرچہ یہ امر بھی بجائے خود کچھ کم افسوسناک نہ تھا کہ ہمارے درمیان خود اپنے "قومی وجود" ہی کا سوال مختلف فیہ ہو جائے، تاہم اگر ٹھنڈے دل سے خالص علمی و عقلی طریق پر اس بنیادی مسئلہ سے بحث کی جاتی، تب بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن افسوس بالائے افسوس یہ ہے کہ یہ سوال چھڑا بھی تو تلخیوں اور شخصی عداوتوں کیساتھ چھڑا، اور اپنے ساتھ نفسانیت، سخن پروری، پارٹی فیلنگ اور حمیت جاہلیت کے زہریلے ثمرات لیکر آیا۔ اب ہمارے برادران ملت نے اس نازک انقلابی دور میں اپنی جماعتی حیثیت کے اہم ترین مسئلہ پر جو بحثیں فرمائیں ان میں یہ پہلو تو نظروں سے اوجھل ہوگیا۔۔ کہ فی الواقع ہماری حیثیت کیا ہے، اور یہ پہلو سامنے آگیا۔۔۔ کہ کون کس کو گراتا ہے اور کون کسے پچھاڑتا ہے۔ ایک طرف اگر صحیح نظریہ کی حمایت بھی ہوئی تو اس میں اثبات حق پر اتنا زور نہیں جتنا گروہ مقابل کو روسیاہ کرنے کی کوشش پر۔ دوسری طرف ایک سراسر باطل نظریہ کی حمایت تمامتر اس جذبہ کے تحت کی گئی۔۔۔۔ کہ فلاں شخص چونکہ ہمارا سرگروہ ہے، اور چونکہ گروہ مقابل اس پر حملہ کر رہا ہے، اسلئے ہم پر اسکی حمایت لازم ہوگئی ہے

خواہ اسکی رائے غلط ہی کیوں نہ ہو، خواہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان جماعت کے مستقبل پر اس کا کتنا ہی مہلک اثر پڑے، خواہ اپنی بات کی پچ کے لیے اپنے ضمیر اور اپنے علم کے خلاف قرآن و حدیث کے ارشادات کو ڈھالنے میں کتنی ہی کھینچ تان کرنی پڑے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا و سیات اعمالنا۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہو، تو کسی شریف آدمی کے لیے اس بحث میں دخل دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن جن لوگوں کا جینا اور مرنا ہی اسلامی قومیت کے بقا اور فروغ کی خاطر ہے ان کے لیے اپنی زندگی کے واحد نصب العین کو اس قیل و قال میں گم ہوتے دیکھنا اور خاموش بیٹھے رہنا بھی مشکل ہے۔ لہذا اپنے دل پر جبر کرکے ہم نے فیصلہ کیا کہ تمام غیر متعلق بحثوں سے قطع نظر کرکے اس مسئلہ پر خالص علمی حیثیت سے بحث کریں۔ آیندہ اشاعت سے اس بحث کا سلسلہ شروع ہوگا مگر اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کرام جناب عزیز ہندی کے اس مضمون کو بغور ملاحظہ فرمالیں تاکہ بحث کے مبادی نظر کے سامنے آجائیں۔]

(۱) مسلمان قوم ہیں یا فرقہ؟

ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک فرقہ کا نام دیا گیا ہے حالانکہ وہ فرقہ نہیں بلکہ ایک بڑی قوم ہیں۔ فرقہ کسی قوم کا ایک جز ہوتا ہے، اور یہاں کوئی ایسی قوم نہیں ہے جس کا مسلمان ایک جز کہلا سکیں۔ ہندوستان ایک برِاعظم کی طرح ہے جس میں چھوٹی بڑی بیسیوں قومیں بستی ہیں۔ ہر قوم اپنی جداگانہ معاشرت و تہذیب کی مالک ہے، اور اپنی مخصوص ذہنیت رکھتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ عبدیت اور غلامی نے چونکہ ہر قوم کو یکساں طور پر اسیر و محکوم کر رکھا ہے، اور ہر قوم میں آزادی حاصل کرنے کی کم و بیش اُمنگ موجود ہے، اس لیے ہر قوم یہ سمجھتی ہے کہ جب تک ہندوستان کامل آزاد نہ ہو جائے اس وقت تک کسی قوم کو بھی اپنی اسارت و محکومی سے رہائی کی کوئی توقع

نہیں۔ اس امر کے پیش نظر اہلِ سیاست کا یہ تقاضا ہے کہ جملہ اقوام کو ایک واحد قومیت کے سانچے میں ڈھال دیا جائے، اور اس طرح ایک واحد وجود بن کر خارجی حکومت کے جور و استبداد سے رہائی حاصل کی جائے۔ گویا آزادی کی راہ میں جو سب سے بڑی اور زبردست رکاوٹ درپیش ہے وہ یہاں مختلف قوموں کا وجود ہے۔ یہ جب تک ایک نہ ہو جائیں، اہلِ سیاست کے نزدیک آزادی کامل کا حصول محالات میں سے ہے۔

اس عقدہ کو حل کرنے کے لیے اہلِ سیاست نے پہلے ہی سے یہ قیاس کر لیا ہے کہ ہندوستان کے پینتیس کروڑ افراد ایک واحد قوم ہیں، اور ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی وغیرہ اس واحد اور عظیم الشان قوم کے جُداجُدا فرقے ہیں۔ مگر یہ قیاس اسی قبیل سے ہے جس طرح یہ فرض کر لیا جائے کہ ساری دُنیا ایک واحد قومیت ہے اور مختلف اقوام اس واحد قومیت کے فرقے ہیں۔ ایسا قیاس اگر کسی حقیقت پر مبنی ہو بھی تو وہ ابھی ایک دور از کار حقیقت ہے۔ عمل کی دنیا میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کوئی تدبیر، کوئی قوت ایسی موجود نہیں جس سے دُنیا کی مختلف اقوام کی ذہنیت کو بدل کر انہیں ایک کر دیا جائے۔ اور جب تک ذہنیت کو بدلا نہ جا سکے اقوام کا وجود دنیا میں باقی رہیگا، اور جب تک اقوام دنیا میں باقی ہیں ان کا مسلک و طریقِ زندگی آپس میں مختلف ہی رہیگا۔

اپنا ایک الگ مسلک اور الگ طریقِ زندگی رکھنا ہی کسی جماعت کا ایک الگ قوم ہونا ہے۔ یہ مسلک اور طریقِ زندگی دراصل قومی وجود کا ظہورِ خارجی ہے، اور اسی چیز کو باقی رکھنا اور اسی چیز کو باقی رکھ کر... ترقی دینا ہر قوم کا نصب العین ہے۔ آزادی بجائے خود نصب العین نہیں ہے بلکہ اس نصب العین کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ اس ذریعہ کے حاصل کرنے کی خواہش فطری طور پر پیدا ہی اسیلئے ہوتی ہے کہ ہر قوم اپنے قومی وجود کو برقرار رکھنا اور اپنے طریق پر اس کو فروغ

دینا چاہتی ہے۔ ہندوستان کے باشندوں میں اگر یہ خواہش پیدا ہوئی ہے تو یہ بھی اس لیے ہے کہ ان میں قومی شعور بیدار ہو گیا ہے۔ لیکن جبکہ ان کے مسلک اور طریقہائے زندگی مختلف ہیں اور ان میں ہر گروہ اپنے قومی وجود کا اظہار مختلف صورت میں کر رہا ہے، ان کو ایک قوم فرض کر لینا، اور ان مختلف قوموں کو ایک قوم کے فرقے قرار دے کر ان کی قومیت کے خارجی ظہورات کو "فرقہ وارانہ" اور "منافی قومیت" کہنا، سراسر غلط اور مہمل ہے۔

جس طرح آزادیٔ فکر و عمل افراد کا فطری حق ہے اسی طرح جماعاتِ افراد یعنی اقوام کو بھی یہ فطری حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی و ارادہ کو بلا کسی خارجی دباؤ کے ظاہر اور نمایاں کریں۔ یہ حق جس طرح افراد سے اصولاً چھینا نہیں جا سکتا اسی طرح اقوام سے بھی ہم اسے روک نہیں سکتے۔ اقوام کا دفعۃً چولا بدل ڈالنا، تاریخ و تجربۂ انسانی اور فطرت کے آئین کے بالکل برخلاف ہے، اس لیے متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت ہی غیر اغلب اور ناممکن ہے۔

پس اس بنا پر یہ ہندوستان کی ہر قوم کا فطری حق ہے کہ وہ اپنے ہی اساسِ قومیت پر اپنی زندگی کا اظہار و افشاء کرے اور ہر دوسری قوم کے ساتھ اپنے زاویۂ نگاہ کے ماتحت بین الاقوامی تعلقات قائم کرے۔ ہندوؤں کا اپنی ہندویت کے اساس پر، سکھوں کا اپنی سکھیت کے اساس پر، اور مسلمانوں کا اپنی مسلمانیت کے اساس پر اپنی زندگی کو نمایاں کر ناولیسا ہی فطری حق ہے جسکے حصول کی طلب ہر قوم میں موجود ہے۔ کیونکہ اگر یہ ہر قوم کے اندر موجود نہ ہوتی تو کسی میں آزادی کا جذبہ بھی نشوونما نہ پا سکتا۔

دراصل ہم نے خارجی حکومت کے اثر کو غلط طور پر قبول کرتے ہوئے ہندوستان کی مختلف قوموں کو فرقے یا کمیونٹیز کہہ کر پکارنا شروع کر دیا ہے۔ بیرونی حکمرانوں کے زاویۂ

نگاہ سے تو یقیناً ہم فرقے ہیں، کیونکہ "نیشن" کی جو موجودہ تعریف یورپ میں مستعمل ہے اس کے لیے... "اسٹیٹ" کا ہونا لازمی ہے، یعنی وہ صرف اُسی مجموعۂ افراد کو "نیشن" کا نام دینگے جو اپنی اسٹیٹ کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہی ہو۔ اس تعریف کے ماتحت انگریز ایک "نیشن" ہیں اور چونکہ وہ بحیثیت "نیشن" کے ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں اس لیے وہ اپنی ماتحت رعیت کو کبھی نیشن کہہ کر نہیں پکاریں گے بلکہ ہمیشہ فرقے یا کمیونٹیز ہی کہیں گے۔ لیکن ہمارے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ جو کچھ بھی ہو وہ خود ہمارا نہیں ہو سکتا۔ ہم کو اگر کمیونٹی سے "نیشن" بننا ہے، تو یقیناً ہم اپنے لیے نیشن ہونے کا ہی دعویٰ کرینگے کیونکہ ہم اسی دعویٰ کی بنا پر اپنی آزادی کا مطالبہ پیش کر سکتے ہیں۔

اس حقیقت کو ہم پس پُشت نہیں ڈال سکتے کہ جب اس ملک کے اہلِ سیاست انگریزوں سے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو انگریزی ذہنیت کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے وہ ہندوستان کو "اسٹیٹ" اور اس کے اندر بسنے والوں کو ایک واحد قوم یعنی ہندوستانی فرض کر لیتے ہیں۔ یہی وہ بڑا سبب ہے جس کی بنا پر یہاں کے اہلِ سیاست اس امر کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے مذکورۂ بالا دعویٰ کی صداقت کے ثبوت کے طور پر یہاں کی مختلف اقوام کو ایک واحد قوم بنا دیں، اور پھر یہی وہ بڑی وجہ ہے کہ سیاست کے عملی میدان میں جب یہ سیاست داں ملک کی مختلف قوموں کے وجود کو اپنے مقابل سدِّ سکندری کی طرح سے حائل پاتے ہیں تو انہیں بجز اس کے اور کچھ نہیں سوجھتا کہ وہ خود بھی اپنے حکمرانوں کا سا زاویۂ نگاہ اختیار کر کے ان قوموں کو قومیں کہنے کی بجائے فرقے کہہ کر مطعون کریں، اور ان کی قومی تحریکوں کو فرقہ وارانہ قرار دیتے ہوئے نیشنلزم کے منافی خیال کریں۔ وہ اسے اپنی دانست میں ایک بڑی گہری سیاست خیال کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح ایک تو یہاں کی مختلف قوموں کو ان کی اصلی

پوزیشن سے گرا کر فرقے قرار دینا خود حکمرانوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مختلف فرقوں کے اختلاط سے ایک واحد قومیت بنانے میں ان کی امداد کریں، اور دوسرے خود مختلف قوموں کے اندر انتشار خیال پیدا کرکے انہیں اپنے قومی امتیازات کو مٹا دینے کی دعوت و اشتعالک بھی دیتا ہے۔

(۲) اب ہم یہ معلوم کرینگے کہ ملک کے یہ سیاستداں اور مدبر جو اپنے حکمرانوں کے زاویۂ نگاہ کو قبول کرتے ہوئے یہاں کی مختلف قوموں کو فرقے قرار دے رہے ہیں خود کس قوم یا فرقہ سے متعلق ہیں اور یہ خود کیوں اپنی قوم کو "قوم" کے درجہ سے گرا کر "فرقہ" کے درجہ میں رکھ رہے ہیں؟

اگر کوئی قوم یا "نیشن" زمانہ کے انقلاب کی وجہ سے کسی غیر کی محکومی میں آگئی ہو تو وہ اس بنا پر کہ وہ کبھی ایک قوم یا نیشن تھی، اپنے گذشتہ دور کو پھر واپس لانے کے لیے، اپنے حکمرانوں سے آزادی کا مطالبہ کرنے میں یقیناً حق بجانب ہوگی۔ لیکن ایک فرقہ جو خود ابھی تک اپنے آپ کو ایک فرقہ ہی خیال کیے ہوئے ہے کس بنا پر اپنی آزادی کا دعویٰ کرسکے گا؟ ضروری ہے کہ اسے ہمیشہ کیلئے ایک فرقہ ہی بنے رہنا چاہیے، لیکن اگر کبھی وہ ایسی کم مایہ زندگی کو برداشت نہ کرسکے تو پھر اسکے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ پہلے "فرقہ" کے درجہ سے "نیشن" کے درجہ کی طرف ارتقاء کرے، یعنی پہلے اس فرقہ کو جس سے وہ خود متعلق ہے آزادی و خود مختاری کے ذریعہ سے نیشن بنائے۔

پس اگر مذکورہ بالا سیاست داں طبقہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے تو وہ محض اپنی قوم ہی کی نمایندگی و آزادی کا دعوے دار ہوسکتا ہے، دوسروں کا نہیں۔ اور اگر اس کے قرب جوار یا ہمسائے میں بعض دوسری قومیں اسی کی طرح محکوم و اسیر آباد ہوں، اور ان کی آزادی اسکی آزادی کے ساتھ لازم و ملزوم کا درجہ رکھتی ہو، تو وہ ایسی تمام قوموں کو اپنے ساتھ مل کر آزادی کی مہم سر کرنیکی دعوت تو دے سکتا ہے مگر اپنے اندر مدغم ہو جانے کی نہیں۔ لیکن اگر یہ

سیاست دان طبقہ کسی قوم کی بجائے ملک کے کسی فرقہ یا کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہے تو وہ خود چونکہ نیشن نہیں بلکہ ایک فرقہ ہے، اس لیے وہ ملک کی دوسری قوموں کو (جو اپنے آپ کو قومیں شمار کرتی ہیں) اُن کے اصلی مقام سے گرا کر فرقے یا کمیونٹیز کے نام سے نہیں پکار سکتا یہ تو اسی وقت ممکن ہے جبکہ سب قومیں اپنے آپ کو فرقے قرار دے لیں اور اپنے آپ کو ایک ہی قوم کا جزء سمجھیں، لیکن جب تک ان فرقوں میں سے ایک بھی ایسا فرقہ باقی ہے جو اپنے آپ کو فرقہ نہیں بلکہ قوم کہتا ہے تو اس صورت میں مذکورۂ بالا سیاست دان طبقہ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ خواہی نخواہی اور زبردستی اسے فرقہ ہی کہہ کر پکارتا چلا جائے۔

اگر وہ اس انتباہ و آگاہی کے باوجود ایسا ہی کرتا چلا جا رہا ہے، تو پھر اس فرقہ یا قوم کی جس سے وہ خود متعلق ہے اس میں ضرور کوئی خاص غرض پوشیدہ ہے۔

ایک تیسری پوزیشن بھی ہے! وہ یہ کہ اگر مذکورۂ بالا سیاست دان طبقہ ملک کی سب قوموں یا فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے تو اس صورت میں اگر یہ نمائندے اپنے اپنے متعلقات کو قومیں سمجھ رہے ہیں تو یقیناً وہ اپنی قومیتوں کی حدود کو واضح اور متعین کرنے کے بعد آپس میں آزادی کے حصول کی غرض سے اشتراکِ عمل کر رہے ہوں گے۔ اور اگر وہ اپنے اپنے متعلقات کو قوموں کی بجائے فرقے قرار دیے ہوئے ہیں تو پھر ان کے درمیان کوئی اختلاف ہی موجود نہ ہونا چاہیے، کیونکہ وہ اس صورت میں ایک ہی قوم کے مختلف اجزاء ہیں اور ان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک محکوم و اسیر "نیشن" ہیں جو اپنی کھوئی ہوئی جگہ کو پھر حاصل کرنے کے لیے آزادی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ مگر کیا فی الواقع انکی یہی پوزیشن ہے؟

اس بحث سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارے حکمرانوں کا جو زاویۂ نگاہ ہمارے متعلق ہے، وہ خود ہمارا نہیں ہو سکتا۔ ہم یہاں اس عظیم الشان ملک میں فرقوں کی حیثیت میں آباد

نہیں ہیں، بلکہ مختلف قومیں ہیں - ہمیں انگریزوں کا فرقے یا کمیونٹیز کہہ کر پکارنا اور "نیشنز" کا لقب نہ دینا، آئین وسیاستِ حاضرہ کا ایک نہایت ہی نازک اور دقیق مسئلہ ہے -

"کوئی نیشن" "کسی دوسری نیشن پر حکمراں نہیں ہو سکتی" یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ محکوم قوم پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں کیا جاتا بلکہ جیسا کہ اوپر کسی جگہ بیان ہو چکا ہے "نیشن" صرف اسی مجموعۂ افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنی حدود کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہے ہوں اور اسٹیٹ کے مظہر ہوں -

(۴) اس امر کے معلوم ہو جانے کے بعد کہ ہندوستان میں فرقے نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں، ہم طبعاً اس سوال کے حل کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ سیاستداں طبقہ جو ہمارے اندر ہمارے حکمرانوں کا سازاویۂ نگاہ رکھتا ہے، آخو کیوں مجبور ہے کہ ایسا زاویۂ نگاہ اختیار کرے۔

اگر یہ طبقہ ان تمام گروہوں سے متعلق ہے، جو ہندوستان میں آباد ہیں، اور اپنے آپ کو فرقے تسلیم کر رہے ہیں تو چونکہ ہر فرقہ ایک ہی قوم کا جزو ہے، کسی فرقہ کی طرف سے یہ صدا بلند نہ ہونی چاہیے کہ وہ فرقہ نہیں بلکہ ایک علحدہ قوم ہے - لیکن اگر اس قسم کی کوئی صدا بلند ہوتی ہے تو یہ امر ماننا پڑیگا کہ مذکورۂ بالا سیاسی طبقہ تمام گروہوں پر (جو فرقے نہیں بلکہ قومیں ہیں) مشتمل نہیں ہے، بلکہ یا تو کسی ایک ایسے گروہ پر مشتمل ہے جو خود ایک قوم ہے اور اپنی قومیت کو پھیلانا چاہتا ہے، یا پھر کوئی ایسا طبقہ ہے جو کسی قوم سے کٹ کر علحدہ ہو چکا ہے، اور ایک الگ قومیت بنانے کا آرزومند ہے -

اگر حقیقت یہ ہو کہ وہ کسی قوم سے علحدہ ہو کر اپنی الگ قومیت بنانا چاہتا ہے تو وہ اپنے ہی مخصوص فرقہ کی جسے وہ ایک قوم میں تبدیل کرنا چاہتا ہے، نمائندگی کرنے کا ادعا کر سکتا ہے وہ دوسری قوموں کو اپنی ہی طرح فرقے قرار دے کر اپنے فرقے کی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ لیکن

اگر پہلی صورت ہے تو اس صورت میں اسکی حیثیت کسی ایک قوم کے نمائندہ عنصر کی ہے اور اسکا اپنے حکمرانوں کا سا زاویۂ نگاہ اختیار کرنا سوائے اسکے اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ وہ خود اپنی قوم کے لیے حکمرانوں کی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے، یعنی موجودہ حکمرانوں کو بیدخل دیے دست و پا کرکے ملک کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس سیاست والی طبقہ کی اتنی بلند آرزو کسی مضبوط اساس پر قائم ہو یعنی اس کی قوم میں اتنا دم خم موجود ہو کہ وہ اتنی بلند آرزو کی تکمیل کرسکے۔

اس امر کے معلوم کرنے کے لیے ہمیں دریافت کرنا پڑے گا کہ وہ وسائل و ذرائع کس قسم کے ہوسکتے ہیں جن پر اتنی بلند آرزو قائم کی جا سکتی ہے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہوں کسی ایک قوم کا اس قسم کی آرزو میں مبتلا ہونا صاف ظاہر کرتا ہے کہ

(الف) وہ تعداد میں سب قوموں سے زیادہ ہے۔

(ب) اس کی مالی ساخت بہت زیادہ مضبوط ہے۔

(ج) وہ علمی حیثیت سے دوسری قوموں سے بڑھی ہوئی ہے۔

(د) دوسری قوموں سے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔

(ہ) اسے ایسا نظام حکومت میسر ہے جس میں مندرجہ بالا خصوصیات سیاستاً اس کے اقتدار و قوت میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہیں۔

اس معیار کو سامنے رکھ کر ہمیں بغیر کسی دقت کے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے ملک میں ایسی قوم صرف ہندوؤں کی قوم ہو سکتی ہے۔ وہ تعداد میں اور قوموں کی نسبت سہ گنی زیادہ ہے۔ اسکی مالی ساخت بہت مضبوط ہے۔ وہ علمی حیثیت میں بھی اور قوموں سے

.... بڑھ چڑھ کر ہے۔ ملک کی دوسری قوموں سے اس کے تعلقات خود غرضانہ اور رقیبانہ ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ملک کے اندر ایک ایسا نظام حکومت پیدا ہو رہا ہے جو اپنے سسٹم کے ماتحت صرف اسی ایک قوم کو سب سے زیادہ پولٹیکل اقتدار بخشتا ہے۔ لہذا ضرور ہے کہ مذکورہ بالا سیاستداں طبقہ اسی قوم میں سے ہو اور حقیقت میں سچ مچ یہ طبقہ اسی قوم سے متعلق ہے۔

پس ہمیں معلوم ہو گیا کہ درحقیقت ہندوستان کا یہ سیاستداں طبقہ جو ہندی قومیت کی آواز لگا رہا ہے، صرف ایک قوم سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ہندوؤں کی قوم ہے۔ یہ طبقہ اسی کی نمائندگی کرتا ہے اور اسی کے اقتدار و آزادی کا طالب ہے اور ہندوستان کی باقی سب قوموں کو نہ صرف خارجی حکومت کی بجائے خود اپنی قومی حکومت کا مطیع و منقاد دیکھنا چاہتا ہے، بلکہ اپنے قومی وجود میں ان کو جذب کرکے زیادہ عظمت حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔

یہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس طبقہ کے افراد میں بعض وہ اشخاص بھی تو شامل ہیں جو دوسری قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، تو یہ اعتراض نہایت آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے۔ ایسے اشخاص اس طبقہ میں یا تو دیانتدارانہ شامل ہوئے ہیں یا ان کی شمولیت غیر دیانتدارانہ ہے۔ اگر انکی شمولیت غیر دیانتدارانہ ہے، تو ضرور ان کی شمولیت کسی اپنی خاص اور ذاتی غرض پر مبنی ہوگی لہذا ایسے اشخاص ہماری بحث سے خارج ہیں۔ اور اگر ان کی شمولیت دیانتداری پر مبنی ہوا تو پھر ان کی یہ دیانتداری دو پہلو رکھتی ہے: ایک ذاتی اور دوسرے قومی۔

اگر وہ اپنی ذات میں دیانتدار ہیں تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اصل مسئلہ کو پوری طرح سمجھا نہیں ہے اور اسی ناسمجھی کا نتیجہ ہے کہ وہ ایسے طبقہ میں شامل ہو گئے ہیں جو ان کی اپنی قوم کی نہیں بلکہ کسی دوسری قوم کی نمائندگی کر رہا ہے۔

اور اگر ان کی دیانت داری قومی پہلو رکھتی ہے تو پھر اس امر کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ انہوں نے مسئلہ کے تمام ما لہٗ و ما علیہ پر نظر نہیں کی۔ وہ جانتے ہیں کہ جس طبقہ میں وہ شامل ہو رہے ہیں وہ کسی دوسری قوم کی نمائندگی کر رہا ہے، لیکن ماحولِ سیاسی کے ماتحت وہ اس طبقہ میں شامل ہونا اس بنا پر ضروری خیال کرتے ہیں کہ وقت آنے پر وہ اپنی قوم کے لیے جداگانہ حقوق و امتیاز حاصل کر سکیں گے۔ لیکن سیاسی ماحول کے دباؤ اور فشار نے انہیں یہاں آ کر غلط کر دیا ہے یہ مسئلہ خاص حقوق و امتیاز حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ اپنی قومی ہستی کے قائم رکھنے اور نمایاں کرنے کا ہے۔ اور یہ محض اسی وقت ممکن ہے جبکہ خاص حقوق و امتیاز کی حدود اتنی واضح اور استوار ہوں کہ کسی دوسری قوم کے خاص حقوق و امتیاز ان حدود میں متجاوز نہ ہو سکیں۔ دو ہمسایوں کے خاص حقوق و امتیازات کی حدود اسی وقت تک ایک دوسرے کے تجاوزات سے مصئون رہ سکتی ہیں جبکہ ان حدود کے درمیان کوئی ناقابلِ تجاوز سدّ موجود ہو۔ لہٰذا اگر وہ اس طرح کی شمولیت کے وقت ایسی کسی سدّ کا ذکر و بیان نہیں کرتے تو پھر ان کی حیثیت ان دو ہمسایوں کی طرح ہوگی جو کسی ایک ہی گھر میں بغیر کسی سدّ اور اوٹ کے اکٹھے زندگی بسر کرتے ہیں اور جو ان میں قوی تر ہے وہ ہمیشہ دوسرے کو اپنی مرضی و ارادہ کا غلام بنائے رکھتا ہے۔ جو لوگ ایسی صورتِ حال کو گوارا کر رہے ہیں انکی دیانت پر ہمیں خواہ مخواہ حملہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ایسے اشخاص کو دیانتدار فرض کرتے ہوئے بھی، جب ہم ان کے تدبر کو منطقی اور علمی طور پر جانچیں گے تو انکی کسی ایسے طبقہ میں شمولیت ذاتی رہ جائیگی قومی نہیں۔

لہٰذا اس سیاستدان طبقہ میں جسکا ذکر یہاں ہو رہا ہے اگر بعض قوموں کے افراد شامل ہوں بھی تو وہ خود اسی کا ایک جزو اور حصہ سمجھے جائینگے اور دوسری قوموں کے نمائندہ عنصر ہرگز نہ ہونگے۔

تنزیل و تاویل

سورۂ طور کی قسمیں

(از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

قرآن پاک کا ہر طالب علم جب اس سورہ کو پڑھے گا تو باوّل وہلہ اس کے ذہن میں اسکی قسموں کی غرض و غایت کی بابت ضرور سوال پیدا ہوگا۔ ہمیں بھی قرآن مجید کے اسرار و حکم معلوم کرنے کا شوق ہے۔ گو کہ ؎

احب الصالحین ولست منہم
لعل اللہ یرزقنی الصلاحا

اس سبب مطالعہ کے وقت ہمارے ذہن میں بھی اسکی قسموں کی بابت نہایت اہمیت سے سوال پیدا ہوا۔ آج کی صحبت میں اسی سوال کی ہم تحقیق کرینگے۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم نے اس اہم سوال کا جو حل سوچا ہے ضروری نہیں کہ ارباب تفسیر کو اسکے تمام پہلوؤں سے اتفاق ہو بلکہ ہمیں تو اس کا بھی اندیشہ ہے کہ ارباب تفسیر کو اس باب میں ہمارے بیشتر نظریات سے اختلاف ہوگا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ پھر ایسے غیر معروف نظریے پیش کرنیکی ضرورت ہی کیا ہے؟ واقعتاً ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن ہم پوری ایمانداری سے کہتے ہیں کہ اس سوال پر اس ادعا کے ساتھ ہم نے قلم اٹھایا ہی...... نہیں ہے کہ اسکی تمام پر پیچ وادیاں ہموار کر لی ہیں۔ بلکہ محض اس توقع پر اس کٹھن راہ میں قدم رکھا ہے کہ ممکن ہے خدا کوئی بہترین حل سمجھا دے۔ اس لیے

کہ - وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا کا اصول اٹل ہے، اور اس امید پر کہ اگر ہمیں اس حقیقت کے سراغ لگانے میں ناکامی ہوئی تو بہت ممکن ہے وہ حضرات جو فہم قرآن کی دولت سے مالا مال ہیں اس باب میں ہماری رہبری فرماوینگے، اس لئے کہ "وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ" اپنی جگہ پر ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں لیت ولعل کی یکقلم گنجایش نہیں ہے -

ہم نے سورۂ بروج کی قسموں کی بابت بحث کرتے وقت (ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ) ..... اجمالاً قسم کا مفہوم شہادت ثابت کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ چونکہ یہ بحث نہایت اہم ہے اس لئے اس کی مزید شرح کسی دوسری صحبت میں کی جائے گی - مگر ہمیں سخت افسوس ہے کہ اور مشاغل نے ہمیں اس طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ دی - لیکن اگر ناظرین ترجمان القرآن اُس مختصر تشریح (بابت قسم بروج) کو سامنے رکھیں گے تو بہت ممکن ہے کہ آج کی صحبت میں جو کچھ ان کے سامنے پیش کیا جائے گا اس کے سمجھنے میں ایک حد تک اس سے مدد مل سکے گی -

قبل اس کے کہ پیش نظر سورہ کے مقسم بہٖ کی غرض وغایت کی بابت کچھ عرض کریں مناسب ہوگا کہ ایک نہایت ہی اہم اور ضروری مرحلہ سے گذر لیا جائے تاکہ اس سے متعلق اور مباحث کے سمجھنے میں آسانی ہو - وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کے مرکز کی تعیین ہے -

سورۂ طور کی شہادتوں کا مرکز

اس میں شک نہیں کہ اس سے ماقبل کی سورہ (ذاریات) (جزا وسزا) کے اثبات میں واقع ہے اور اس کی جملہ قسمیں قیامت کبریٰ کے وقوع پر شاہد عدل ہیں - پیش نظر سورہ میں بھی غور وفکر کرنے سے یہی مترشح ہوتا ہے - اور یہ کچھ ہمارا ہی نظریہ نہیں ہے بلکہ جمہور مفسرین بھی اس بارے میں ہمارے ہمنوا ہیں - فرق محض اجمال وتفصیل کا ہے -

مقسم علیہ کی تعیین کے بعد قاعدہ کی رو سے ہمیں مقسم بہ اور مقسم علیہ کی مناسبت سے بحث کرنی چاہیے۔ لیکن بغیر قسموں کی شرح و تعیین کے مناسبت کی بحث قبل از وقت ہوگی اس لئے پہلے ہم قسموں کی شرح و تعیین کرینگے۔

سورۂ طور کی قسموں کی شرح و تعیین

وَالطُّوْرِ۔ وقوع دینونت پر یہ پہلی شہادت ہے تفسیروں کے استقرار سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف سے لیکر آج تک تمام مفسرین اس شہادت کے بارے میں متفق ہیں کہ اس سے وہی جبلِ اقدس مراد ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف تکلم حاصل ہوا تھا۔ اسی لئے اس پر ا- ل تعریف کا بھی داخل ہے اور دوسرے مواقع پر اضافت کے ساتھ مذکور ہے (وطور سینین وطور سیناء)

وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ۔ عدالت الہیہ کے قیام کے باب میں یہ دوسری شہادت ہے۔ اس شہادت کے بارے میں تفسیروں میں متعدد اقوال مذکور ہیں۔ ان میں سے چند مشہور اقوال کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے ابن جریرؒ اور دیگر تفاسیر کی جانب مراجعت کرنی چاہیے۔

(۱) بعض حضرات اس سے لوح محفوظ مراد لیتے ہیں۔

(۲) بعضوں کے نزدیک اس سے اعمالنامہ مراد ہے۔

(۳) بعضے اس سے مطلق صحیفہ مراد لیتے ہیں۔

(۴) بعض بزرگوں نے اس سے قرآنِ پاک مراد لیا ہے۔

(۵) کچھ لوگوں نے اس سے توراۃ مراد لی ہے۔

اس شہادت کے بارے میں مشہور اقوال یہی ہیں۔ ہمارے نزدیک دو ابتدائی قولوں کے علاوہ بقیہ کے لینے میں کچھ حرج نہیں۔ تفصیل مناسبت کے باب میں آئیگی۔

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ۔ عدل الٰہی کے ثبوت میں یہ تیسری حجت ہے۔ اس کے بارے

میں دو قول مشہور ہیں۔

(۱) بعض حضرات اس سے خانۂ کعبہ مراد لیتے ہیں۔

(۲) بعض بزرگوار اس سے خانۂ کعبہ کے محاذ ہی میں ملائکہ کا کعبہ مانتے ہیں۔

مذکورۂ بالا شہادت کے بارے میں مفسرینؒ سے یہی دو اقوال پایۂ شہرت کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ ہمیں ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کے وجوہ مناسبت کے باب میں مذکور ہیں۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ۔ وقوعِ جزا پر یہ چوتھی دلیل ہے۔ اس شہادت کے بارے میں جمہور مفسرین متفق ہیں کہ اس سے نظام علوی مراد ہے۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ۔ یہ وقوعِ قیامت پر پانچویں حجت ہے۔ اس کے متعلق تفسیروں میں دو اقوال مذکور ہیں جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) دنیا کے عام موجزن دریا مراد ہیں۔

(۲) وہ عظیم الشان دریا مراد ہے جو عرش کے نیچے اور آسمان کے اوپر واقع ہے۔

اس بارے میں مفسرینؒ سے یہی دو اقوال منقول ہیں۔ پہلے قول سے تو ایک حد تک ہمیں بھی اتفاق ہے، لیکن دوسرے قول کی کوئی توجیہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جس روایت سے یہ قول ماخوذ ہے وہ ناقابلِ قبول ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہنے کی جرأت کرینگے کہ اس روایت کا اس آیت کی تفسیر میں لانا غیر ضروری ہے۔ ہم نے سیاق وسباق کی روشنی میں اس شہادت سے متعلق ایک دوسری رائے قائم کی ہے۔ وہ یہ کہ اس سے وہ دریا مراد ہے جس میں فرعون کی قوم غرق کر دی گئی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل مناسبت کے باب میں بیان ہوگی۔

تفصیل بالا سے مقسم بہ کی تعیین ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان شہادتوں میں مناسبت ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ دعوے اور دلائل میں کوئی لگاؤ ہے یا نہیں؟

مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت

اس میں ذرا بھی شک کی گنجایش نہیں کہ پیش نظر سورہ کی پانچوں شہادتوں کا مرکز ایک ہے یعنی یہ کہ دینونت کبریٰ کا وقوع یقینی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اتقیاء و اشقیاء میں تفریق کی گھڑی ضرور آئیگی۔ اس کے بغیر نظام عالم عبث ہے اب ہم تمام شہادتوں کی دعوے سے مناسبت بیان کرینگے تاکہ مقسم بہ اور مقسم علیہ میں جو حقائق پوشیدہ ہیں اجاگر ہوں۔

(۱) وَالطُّورِ۔ یہ کسی پر مخفی نہیں کہ طور ہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ایک مقہور اور مظلوم قوم کو اس کے صبر و برداشت کی بدولت اپنی نوازشہائے بے پایاں سے نوازا اور اس کے دشمنوں کی دھاک مٹا دی اور اسے ایک ایسی شریعت بخشی جو منکرین و معاندین کیلیے یکسر تازیانۂ عذاب تھی اور طالبان حق کیلئے سراپا رحمت و اکسیر۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں نے اس روحانی عطیۂ خداوندی کو قبول کیا، خدا نے سارے عالم کے قلوب ان کی طرف جھکا دیے اور سارے عالم کی گلہ بانی ان کے سپرد کر دی، اور جن لوگوں نے اس کے قبول کرنے سے اعراض کیا وہ دنیا اور آخرت کی دونوں دولتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ یہ شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ ہمارے دعوے پر شاہد ہے۔ الغرض اس مقام پر جو واقعہ ہوا وہ مظلوم حامیان حق پر لطف و نوازش اور ظالموں پر قہر و غضب کی ایک نہایت روشن مثال ہے۔ اس لیے کہ عدالت الٰہیہ کے قیام کے وقت بھی ایسا ہی ہوگا کہ جو مقہور ہیں وہ غالب ہونگے، جو بھوکے ہیں وہ آسودہ ہونگے، اور جو ظالم ہیں وہ ذلیل و شرمسار ہوں گے، اور جو سرکش ہیں آسمانی بادشاہت کا دروازہ ان کے لیے کبھی نہ کھلے گا۔

(۲) وَکِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ - اس شہادت میں دینونت کے مختلف پہلو ہیں۔ اگر اس سے عام صحف سماویہ مراد لیے جائیں تو اس میں بھی کوئی زحمت نہیں۔ دنیا میں جتنے انقلابات ہوئے ہیں ان میں سب سے اہم کڑی صحف سماویہ کا نزول ہے، اس لیے کہ اس سے محض قوموں کے ظاہری احوال ہی میں تغیر نہیں ہوا ہے بلکہ ان کی روحانی زندگی کی بھی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ ایسا تمام پیغمبروں کے عہد مبارک میں ہوا ہے۔ سو جس طرح ہر بعثت کے وقت صفحۂ ارض پر انقلاب ہوا ہے اور اس میں زیادہ تر صحیفۂ آسمانی ہی کا دخل تھا، اسی طرح جب وہ فیصلے کی گھڑی آپہنچے گی تو ایک انقلاب عظیم ظہور میں آجائیگا۔ کتنے اگلے پیچھے کی صف میں ہونگے، اور کتنے ضعیف و ناتواں عرشِ الٰہی سے قریب ہونگے۔ الغرض صحائف کے نزول میں بھی دینونت کی روشن مثال ہے، اور یہی دینونت کا نقشہ قیامت کے دن نظروں کے سامنے ہوگا۔

اور اگر اس شہادت سے توراۃ مراد لیں جیسا کہ پہلی شہادت (وَالطُّوْرِ) کا اقتضاء ہے تو اس صورت میں بھی دینونت کا پہلو واضح ہے۔ وہ یوں کہ جس طرح توراۃ کے نزول سے عناصر فاسدہ کا قلع قمع کر دیا گیا اور مقہوروں کو سربلند کیا گیا (بنی اسرائیل کی تاریخ اس نظریہ کی تصدیق کریگی) بعینہٖ اسی طرح اُس روز جبکہ خدا کی عدالت قائم ہوگی، مجرمین اپنے اعمال کی سزا پائینگے اور صلحاء رضائے الٰہی سے لطف اندوز ہونگے۔ نزول توراۃ کے بعد جو کچھ ہوا اس میں دینونت کی ایک روشن مثال ہے۔

اور اگر اس شہادت سے قرآنِ پاک مراد لیا جائے، جیسا کہ اکثر مفسرینؒ کا خیال ہے اور اسی نظریہ کی پرزور تائید امام ابن قیمؒ نے بھی اپنی معرکتہ الآرا تصنیف اقسام القرآن میں کی ہے، تو بھی کوئی دقت نہیں، اس لیے کہ قرآن پاک کا دینونت ہونا صحف سابقہ سے بھی ثابت ہے۔ حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں:۔

جس پتھر کو راجگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب، اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائیگی۔ اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائیگی دے دی جائیگی۔ جو اس پتھر پر گریگا چور ہو جائیگا پر جس پر وہ گریگا اسے پیس ڈالیگا۔

(متی باب ۲۱ - آیت ۴۲ - ۴۴)

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں،۔

"اس وقت آسمان کی بادشاہت ان دس کنواریوں کی مانند ہوگی جو اپنی مشعلیں لیکر دولھا کے استقبال کے واسطے نکلیں۔ ان میں پانچ ہوشیار اور پانچ نادان تھیں۔ نادانوں نے اپنی مشعلیں لیں مگر تیل ساتھ نہ لیا پر ہوشیاروں نے اپنی مشعلوں کے ساتھ برتنوں میں تیل لیا۔ جب دولھا نے دیر کی سب اونگھنے لگیں اور سو گئیں آدھی رات کو دھوم مچی کہ دیکھو دولھا آتا ہے اس کے استقبال کے واسطے نکلو تب ان کنواریوں نے اٹھ کر اپنی مشعلیں درست کیں اور نادانوں نے ہوشیاروں سے کہا اپنے تیل میں سے ہمیں بھی دو کہ ہماری مشعلیں بجھی جاتی ہیں پر ہوشیاروں نے جواب میں کہا ایسا نہ ہو کہ ہمارے اور تمہارے واسطے کفایت نہ کرے بہتر ہے کہ بیچنے والوں کے پاس جاؤ اور اپنے واسطے مول لو جب وہ خریدنے گئیں دولھا آپہنچا اور وہ جو تیار تھیں اسکے ساتھ شادی کے گھر میں گئیں اور دروازہ بند ہوئے پیچھے وہ دوسری کنواریاں بھی آئیں اور کہنے لگیں اے خداوند اے خداوند ہمارے لئے دروازہ کھول تب اس نے جواب میں کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں تمہیں نہیں پہچانتا اس لیے جاگتے رہو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ کون سے دن یا کون سی گھڑی ابن آدم آئیگا۔" (متی باب ۲۵ آیت ۱-۱۳)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"اور درختوں کی جڑ پر اب کلہاڑا رکھا ہے پس ہر ایک درخت جو اچھا پھل نہیں لاتا کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ میں تو تمہیں توبہ کیلئے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن وہ جو میرے بعد آتا ہے مجھ سے زور آور ہے کہ میں اس کی جوتیاں اٹھانیکے لائق نہیں وہ تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دیگا اس کا سوپ اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کریگا اور اپنے گیہوں کو کھتّے میں جمع کرے گا پر بھوسے کو اس آگ میں جو ہرگز نہیں بجھتی جلائیگا۔

(متی باب ۳۔ آیت ۱۰-۱۲)

ایک دوسرے موقع پر قرآنِ پاک کو "آتشیں شریعت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مذکورۂ بالا حوالجات سے قرآنِ پاک کا دینونت کبریٰ کا مظہر ہونا واضح ہے۔ خود قرآنِ پاک میں بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی یہ آخری شریعت منکرین ومکذبین کے لیے تازیانۂ عذاب ہے اور مومنین وموقنین کے لیے سراپا رحمت ہے۔

سورۂ حاقہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنكُم مُّكَذِّبِينَ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ (الحاقہ-۲)	قرآنِ پاک پرہیزگاروں کیلیے نصیحت ہے اور ہمکو خوب معلوم ہے کہ تم میں سے بعض اسکو جھٹلانے والے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ کافروں پر افسوس ہے

ایک دوسرے موقع پر یوں مذکور ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَنزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا۔ قَيِّمًا	ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا اور اس میں کجی نہ کی

لِيُنْذِرَ بَاسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ (الکہف-۱)

رکھی۔ بالکل سیدھی بات ہے تاکہ خدا کی طرف سے عذاب شدید سے ڈرائے۔ اور جو ایمان والے ہیں (اور) نیک عمل بھی کرتے ہیں انکو اس بات کی خوشخبری دے کہ انکے لیے عمدہ اجر ہے جس میں ہمیشہ وہ رہیں گے، اور ان لوگوں کو عذاب سے ڈرائے جو کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔

مذکورۂ بالا آیات سے واضح ہے کہ ایمان والوں کیلیے قرآنِ مجید آبِ زلال ہے۔ اور منکرین کیلیے زہرِ ہلاہل۔ قرآن کی یہ محض دھمکی ہی نہ تھی کہ "اس کا مخالف پسیگا اور تباہ ہوگا" بلکہ فی الواقع ایسا ہوا بھی۔ اسلام کی تاریخ اس کی تائید کریگی۔ تفصیل کی اس موقع پر گنجائش نہیں۔

(۳-۴) وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ۔ ان دونوں شہادتوں میں سے پہلی شہادت سے معمورۂ ارضی اور دوسری سے یہ سقفِ نیلگوں مراد ہے۔ ان دونوں قسموں میں پہلی شہادت سے جمہور مفسرین کے خلاف ہم نے ایک دوسری راہ اس لئے اختیار کی ہے کہ جزا و نبوت کے باب میں عالم علوی و سفلی سے استشہاد قرآن پاک میں بیک وقت شائع و ذائع ہے اور یہی چیز یہاں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کی گردش میں ان عقل والوں کیلیے جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار یہ نظام تو نے عبث نہیں بنایا ہے

وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران)

تو پاک ہے پس ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔

ایک دوسرے مقام پر ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ۔ (الحجر - ۶)

اور ہم نے نہیں پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور قیامت ضرور آئیگی پس اے پیغمبر کفار کی شرارتوں سے خوش اسلوبی کیساتھ درگذر کرو۔

ایک دوسرے موقع پر یوں مذکور ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (الانبیاء - ۲)

اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ انکے درمیان ہے کھیل کے طور پر۔

ایک اور موقع پر ہے:۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى الآیہ۔ (الروم - ۱)

کیا انہوں نے اپنے جی میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، نہیں پیدا کیا مگر حق کیساتھ اور ایک مدت معینہ تک کیلیے۔

ایک اور مقام پر یوں وارد ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ

خدا ہی نے آسمانوں کو بغیر کسی سہارے کے بلند کیا ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو پھر عرش پر استوار ہو گیا اور اسی نے چاند اور سورج کو مسخر کیا ہے ہر ایک وقت مقرر تک چلتا ہے وہی امور کی تدبیر کرتا ہے تاکہ تمہارے اندر خدا سے ملنے

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا۔ الآیہ (الرعد - ۱)

کا یقین پیدا ہو اور اسی نے زمین کو پھیلایا اور اس میں اٹل پہاڑ اور دریا بنا دیے۔

ایک دوسری جگہ یوں ہے:۔

إِنَّ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (الجاثیہ - ۱)

بیشک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیئے دلائل ہیں۔

ایک اور جگہ یوں مذکور ہے:۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَّالْجِبَالَ أَوْتَادًا وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا (النبأ - ۱)

کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا اور ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے اور ہم ہی نے تمہاری نیند کو موجب راحت بنایا ہے اور ہم ہی نے رات کو پردہ اور دن کو روزی کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے ہیں اور ہم ہی نے روشن مشعل بنائی ہے۔

احتواء مقصود نہیں ورنہ نہ معلوم کتنے مقامات پر اس قسم کی آیات مذکور ہیں جن میں کہیں تو بلحاظ حکمت ان دونوں چیزوں کو جزاء کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے اور بعض جگہ امکان معاد پر خالق کی قدرت قاہرہ کے ان دونوں مظاہر سے استشہاد کیا گیا ہے۔ یہی چیز ان دونوں پیش نظر آیتوں میں بھی مرعی ہے۔ فرق محض اسلوب کلام کا ہے، ورنہ باعتبار معنیٰ کوئی فرق نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۵) والبحر المسجور۔ اس شہادت سے اگر عام موج زن دریا مراد لیا جائے تو اس کی گنجائش ہے اور اس صورت میں مقسم اور مقسم بہ میں مناسبت کی یہ صورت ہوگی کہ دریاؤں جیسے

تباہیاں یا فائدہ رسانیاں ظہور میں آتی ہیں ان میں قیامت کبریٰ کے وقوع کی ایک بہت ہی بڑی مثال ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے بحرِ قلزم مراد لینا بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ دریا ہے جہاں حق و باطل میں معرکہ آرائی ہوئی۔ پھر آخر کار حق ہی کو غلبہ حاصل ہوا اور باطل کے علم کے نیچے گو کہ فوج گراں تھی مگر کچھ نہ کر سکی اور ہمیشہ کیلیے مٹ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کے عہد سعید میں ایسا ہوا یا نہیں؟

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ آخر تم سب سے الگ ایک نئی تاویل کیوں کرتے ہو؟ اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہوگا کہ اسکی ہمارے پاس دو وجہیں ہیں۔

(۱) اس صورت میں ایک خاص واقعہ ہلاکت کی جانب اشارہ ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب کو اس واقعہ فاجعہ کا تصور لرزا دیگا اور اس کے دل میں منکرین کی راہ سے نفرت اور صلحاء کے اصول سے شیفتگی پیدا ہو گی۔ تعمیم کی صورت میں یہ فوائد حاصل نہ ہونگے۔

(۲) پہلی قسم کا بھی یہی اقتضاء ہے کہ اس سے بحرِ قلزم ہی مراد لیا جائے۔

---

(۱) "ترجمان القرآن"۔ فاضل مضمون نگار نے یہاں بیتِ معمور سے معمورۂ ارضی اور سقفِ مرفوع سے آسمان مراد لیا ہے۔ جہاں تک دوسری تاویل کا تعلق ہے اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں اس لیے کہ آسمان کیلیے چھت کا استعارہ خود قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ البتہ پہلی تاویل کے سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کرۂ زمین یا عالم سفلی کیلیے "بیت" کا لفظ بھی کہیں استعمال ہوا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ خواہ قرآن ہو یا غیر قرآن، بہر حال اسکی کسی عبارت کی وہی تاویل و تعبیر درست ہو سکتی ہے جبکہ خود الفاظِ عبارت متحمل ہو سکتے ہوں۔ لہذا فاضل مضمون نگار کو اپنی تاویل بیان کرنے کے ساتھ اس پہلو پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔

سورۂ کہف اور فتنۂ دجال

(از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب معلم دار العلوم ندوۃ العلماء)

سورۂ کہف کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ اسکی تلاوت دجال کے فتنہ سے محفوظ رکھیگی مسلم کے الفاظ ہیں۔

من حفظ عشر آیاتٍ من اول الکھف عصم من فتنۃ الدجال

جو ابتدا ء کہف کی دس آیتیں یاد کرلیگا وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہیگا۔

شعبہ (ایک راوی) کی روایت میں "من آخر الکھف" ہے، ہمکو غور کرنا چاہیے کہ سورہ کے عام مضامین اور خصوصاً سورہ کی ابتدا و انتہا کو اس خاصیت اور تاثیر سے کیا ربط و مناسبت ہے؟ عام مفسرینؒ نے اس ربط و مناسبت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، امام نوویؒ شارح مسلم نے اس حدیث کے تحت میں اتنا لکھا ہے۔

قیل سبب ذالك ما فی اولها من العجائب و الآیات فمن تدبرها لم یفتتن بالدجال وکذا فی آخرها قوله تعالیٰ - افحسب الذین کفروا ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء

اسکا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ سورہ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی عجیب باتیں اور اپنی قدرت کی نشانیاں بیان کی ہیں۔ جو ان پر غور کریگا وہ دجال کے فتنہ میں مبتلا نہ ہوگا اسیطرح اس کے آخر میں یہ آیت افحسب الذین کفروا الخ

لیکن یہ مناسبت بہت دور کی ہے اور تکلف سے خالی نہیں، مگر اس سے معلوم ہوا کہ مناسبت تلاش کی جاسکتی ہے۔

میرے نزدیک ایک مناسبت تو یہ ہے (واللہ اعلم بالصواب) کہ سورہ کی ابتدا میں دجال صفت بادشاہ اور چند اولوالعزم اور صاحبِ استقامت نوجوانوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے دجال کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو اپنے بندوں کے امتحان کیلیے بہت سے خصوصی اختیارات اور غیر معمولی قوتیں عطا فرمائیگا۔ وہ ماریگا اور جلائیگا۔ اسکے ہاتھ میں بندوں کا رزق ہوگا اسکے حکم سے بارش ہوگی۔ اسکے پاس بہشت نما باغ ہوگا جسمیں وہ اپنے مقبول لوگوں کو داخل کریگا جہنم نما آگ ہوگی جسمیں وہ اپنے منکر اور معتوب لوگوں کو جلائیگا۔ غور کیا جائے تو خود مختار اور مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھ میں بھی بہت سی دجالی قوتیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی کبھی اسکا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مارتے اور جلاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ۔

تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ابراہیمؑ سے مناظرہ کیا تھا اس بنا پر کہ اللہ نے اسکو سلطنت عطا فرمائی تھی، جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں

ان کے ہاتھوں میں بھی اللہ کے حکم سے اسکے کچھ بندوں کا رزق ہوتا ہے انکے پاس بھی ایک بہشت نما مقام ہوتا ہے جو کم ہمتوں کی جنت ہوتی ہے، جس میں ہر قسم کا عیش و لطف ہوتا ہے وہ جن سے خوش ہوتے ہیں انکو اس "جنتِ شداد" میں داخل کر دیتے ہیں۔ کسیکو اپنا ندیم بنا لیتے ہیں، کسیکو اپنا وزیر، کسیکو زر و جواہر سے مالا مال کر دیتے ہیں، اور کسیکو کوئی منصب خطاب اور عہدہ دیکر نہال کر دیتے ہیں۔ جن سے وہ ناخوش ہوتے ہیں انکے لیے دنیا کو جہنم بنا دیتے

اور زندگی کو عذاب جان ۔ سولی پر چڑھا دیتے ہیں، یا جیلخانہ میں ڈال دیتے ہیں، جہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر جاتا ہے۔ کسیکو وہ جہنم دکھا کر ڈراتے ہیں، اور کسیکو وہ اپنی خوشنودی کے "سبز باغ" دکھا کر پھسلاتے ہیں۔ جو اُس طرح انکا تابع نہیں ہوتا وہ اِسطرح انکا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ انکی قہر کی نگاہ میں بھی جادو ہے کہ جس طرف اُٹھتی ہے بڑے بڑے شیر لومڑی بنجاتے ہیں۔ انکی مہر کی نگاہ میں بھی جادو ہے کہ جس پر پڑتی ہے اپنا دین و ایمان نذر کر دیتا ہے۔

ان "دجالوں" کے شعبدوں سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو سلطنتوں اور بادشاہوں کی پرواہ نہ کریں، جو خزانوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں، جو تخت و تاج، منصب و اعزاز کو پاؤں سے ٹھکرادیں۔ اس ہمت و ایثار کی پوری مثال اصحاب کہف تھے، جنہوں نے کسی قیمت پر اپنے ایمان کا سودا نہیں کیا، اور اسکے لیے دنیا کی کوئی رشوت قبول نہیں کی، اور کسی جال میں انکا پاؤں نہیں الجھا۔ انکو اپنے عقیدہ سے پھیرنے کیلیے اور اپنا ہم خیال بنانے کیلیے بادشاہ وقت نے کیا کیا ترکیبیں نہ کی ہونگی؟ انکو ڈرایا بھی ہوگا اور پھسلایا بھی ہوگا، جیلخانہ کے دروازے بھی کھول کر دکھائے ہونگے اور اپنی بہشت بریں کے پردے بھی اٹھا کر شوق دلایا ہوگا، انکو سولی اور پھانسی کی دھمکی بھی دی ہوگی اور عہدہ و جاگیر کا لالچ بھی دیا ہوگا، لیکن کوئی افسوں ان پر کارگر نہوا اور وہ یہی کہتے رہے،

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا

ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے ہم اسکے سوا کسی اور معبود کو ہرگز پکارنے والے نہیں اگر ہم ایسا کریں تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہوگی۔

مسلمانوں کو اُس دجالِ اکبر کے علاوہ جو احادیث کی پیشگوئیوں کے مطابق قیامت کے قریب ظاہر ہوگا بیشمار دجالوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ دجال مختلف بھیس میں آئینگے اور نئے نئے شعبدے دکھائینگے،

کبھی انکے پاس خزانہ و لشکر، منصب و اعزاز ہوگا، اور کبھی علم و فن۔ انکا مقابلہ کرنیکے لیے اور انکے فتنہ سے بچنے کیلیے اصحاب کہف کا سا ایمان اور استقامت چاہیے، اس سبق کو یاد رکھنے کیلیے مسلمانوں کو اس سورہ اور ان آیتوں کو دہراتے رہنے اور یاد کرنیکی ہدایت ہے۔

دوسری مناسبت یہ ہے کہ آخر زمانہ کی اکثر تجویزوں، تحریکوں اور کاموں میں ایک چیز بہت نمایاں ہوگی: اور وہ یہ کہ ان میں اول سے لیکر آخر تک دنیا ہی دنیا پیش نظر ہوگی۔ اٹھتے بیٹھتے اسیکا کلمہ پڑھا جائیگا، اور اسی کا گیت گایا جائیگا۔ خدا اور آخرت اس دائرہ سے بالکل خارج ہونگے۔ انکا نہ کوئی ذکر ہوگا نہ کوئی سوال۔ لوگ ان چیزوں کو بھولتے جائینگے۔ دنیا ہی کیلیے جیئینگے اور مرینگے۔ موجودہ تحریکوں پر غور کیجیے جنہوں نے مذہب کی جگہ لے لی ہے اور لاکھوں آدمیوں کا دین و ایمان بنگئی ہیں، یعنی وطنیت، قومیت، سوشلزم وغیرہ۔ انکے لغت میں کہیں خدا اور آخرت کا نام بھی آتا ہے؟ انکے رہنماؤں اور کارکنوں کو کسی وقت انکا تصور بھی ہوتا ہے؟ دنیا میں کوئی چیز انکے ہاں خدا اور آخرت سے زیادہ مبغوض نہیں۔

سورۂ کہف میں اس رجحان کے خلاف سب سے زیادہ مواد ہے۔ آخر میں آتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا

کہو کیا ہم تمہیں وہ لوگ بتائیں جو اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ نقصان میں رہنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکی تمام کوششیں دنیا کی زندگی ہی میں گم ہوکر رہ گئی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوب کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں اور اس سے ملاقات کا انکار کیا تو انکے عمل سب اکارت گئے اور قیامت کے دن ہم انکا کوئی وزن قائم نہیں کرینگے۔

وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (اور وہ (۲۷) سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں) کسقدر ان لوگوں پر صادق آتا ہے جو ان تحریکوں کیلیے وقف ہیں۔

خطباتِ جمعہ

خطبۂ اولیٰ ۲۲ محرم ۵۷ھ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ۔

ساری تعریفیں اللہ کیلیے ہیں اور اللہ ہی کو پہنچتی ہیں۔ ہم اسکی حمد وثنا کرتے ہیں۔ اس سے مدد مانگتے ہیں۔ اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ اس پر ایمان لاتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خود اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے بچائے۔ اللہ جسکو ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ اور اللہ ہی جسکو ہدایت نہ دے اسے کوئی سیدھے راستہ پر نہیں لگا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود اس خدا کے سوا نہیں جو ایک ہے اور کوئی اسکا شریک نہیں ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

برادرانِ اسلام - میں ایک دور دراز علاقے کا رہنے والا اپنا گھر بار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو چھوڑ کر آپکی اس بستی میں صرف اسلیے آیا ہوں کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں کوئی لالچ کھینچ کر نہیں لایا ہے۔ نہ میں آپ سے کسی اجرت کا طالب ہوں۔ میں صرف آپکے لیے اور سب مسلمانوں کیلیے دنیا اور عاقبت کی بھلائی چاہتا ہوں، اور اس کام میں اگر مجھے کوئی

لالچ ہے تو وہ بس اتنا ہے کہ شائد اس طرح میرا مالک مجھ سے راضی ہو جائے اور میرے گناہوں کو بخش دے۔ بھائیو! اگر تمہارا دل گواہی دے کہ اس کام میں میری مدد کرنا تمہارا فرض ہے، تو میری مدد کرو۔ اور میری مدد اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ خدا اور اسکے رسول کی تعلیم کے مطابق جو کچھ میں تم سے کہوں اس کو قبول کرو اور جس بات سے منع کروں اس سے باز آجاؤ، اور تمہاری فلاح دارین کیلیے جو کام میں کروں اس میں میرا ساتھ دو۔ اگر تم ایسا کروگے تو خدا اپنے فضل سے میری اور تم سب کی تائید کریگا، اور ہمیں کامیابی عطا کریگا، کیونکہ خدا اپنی رحمت سے کسی ایسی جماعت کو کبھی محروم نہیں کرتا جو اسکے حکموں پر چلنے والی اور اسکی راہ میں جہاد کرنے والی ہو۔

بھائیو! مجھے نہ علم میں کامل ہونیکا دعویٰ ہے اور نہ عمل میں کامل ہونیکا۔ میں تو گناہوں کی دنیا سے بھاگ کر یہاں پناہ لینے آیا ہوں تاکہ شائد یہاں مجھ کو اپنی اصلاح کرنے اور پورا مسلمان بن جانے کا موقع مل جائے۔ جسطرح دوسرے انسانوں کے علم اور عمل میں کوتاہیاں ہیں اسی طرح میرے علم و عمل میں بھی ہیں۔ اسلیے میں کبھی یہ نہ چاہونگا کہ تم آنکھیں بند کرکے میری پیروی کرو اور اگر میں غلطی بھی کروں تو اس میں میرا ساتھ دو۔ نہیں۔ تم میں سے ہر شخص کو اپنے دین کے معاملہ میں چوکنا رہنا چاہیے، اور دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں خدا اور رسول کی تعلیم کے مطابق کہتا ہوں یا نہیں۔ اگر تمہیں شبہ ہو تو مجھ سے دلیل طلب کرو۔ اگر میں غلطی کروں تو مجھے ٹوک دو اور میری اصلاح کرو۔ اور اگر کبھی تم دیکھو کہ میں خدانخواستہ گمراہ ہو گیاں تو میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ مجھے اپنی بستی سے نکال دینا۔

یہ چند باتیں تھیں جو سب سے پہلے میں آپ لوگوں کے گوش گذار کرنا چاہتا تھا۔ اسکے بعد، چونکہ آج آپکی نماز جمعہ میں یہ میرا پہلا خطبہ ہے، اسلیے میں آج کے خطبہ میں صرف جمعہ ہی کے متعلق آپکے سامنے کچھ باتیں بیان کرونگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ ان باتوں کو غور سے سنینگے اور یہاں سے واپس جا کر اپنے ان بھائیوں کو

کو بھی سنا دینگے جو یہاں نماز میں شریک نہیں۔

جمعہ کے احکام سننے سے پہلے آپکو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ جمعہ دراصل ہے کیا چیز؟ شریعت نے جتنی عبادتیں آپ پر فرض کی ہیں انکے دو مقصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ نیک اور پرہیزگار اور خدا ترس بنے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ خدا کے سب پرہیزگار بندے مل کر ایک جماعت بن جائیں، اور ایک دوسرے کے مددگار بنکر اپنی مجموعی طاقت سے دنیا میں نیکی اور پرہیزگاری اور خدا ترسی کو پھیلائیں۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ تمام عبادتیں اس طرح پر فرض کی گئی ہیں کہ ان سے یہ دونوں مقصد ساتھ ساتھ حاصل ہو جاتے ہیں۔ روزے کو فرض کیا تو اس طرح کہ سارے مسلمانوں کیلیے ایک ہی مہینہ مقرر کر دیا تاکہ سب ملکر ایک وقت میں روزہ رکھیں۔ یہ نہیں کیا کہ ہر شخص الگ الگ جب چاہے روزہ رکھے اور سال بھر میں تیس روزے پورے کرلے۔ حج فرض کیا تو ساری دنیا کے مسلمانوں کیلیے ایک تاریخ مقرر کی تاکہ تمام حاجی ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہوں۔ یہ نہیں کیا کہ اپنی سہولت دیکھ کر جب جسکا جی چاہے حج کر آئے۔ زکوٰۃ فرض کی تو ہر جگہ کے مالدار مسلمان کیساتھ اسکے غریب بھائی کا جوڑ لگا دیا۔ اسی طرح نماز بھی جب فرض کی تو ساتھ ہی جماعت کی بھی سختی کے ساتھ تاکید کردی۔

لیکن نماز کا معاملہ دوسری عبادتوں سے ذرا مختلف ہے۔ روزے سال بھر میں ایک مہینے کیلیے ہیں۔ حج اور زکوٰۃ سال میں صرف ایک مرتبہ کیلیے ہیں۔ مگر نماز تو روزانہ پانچ مرتبہ فرض ہے اس میں ہر وقت جماعت کی پابندی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہر شخص کیلیے ہر نماز کو اگر جماعت کیساتھ ادا کرنا فرض کر دیا جائے تو بڑی مشکل ہو، اسلیے اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی نمازوں میں جماعت کی تاکید تو سختی کیساتھ فرمائی مگر اس کو ایسا فرض نہیں کیا کہ بغیر جماعت کے نماز ہی نہ ہو۔ اس کے معاوضہ میں یہ حکم دیا کہ روزانہ پانچ وقت کے بجائے صرف ہفتہ میں ایک وقت کی نماز جماعت کیساتھ ادا کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے، ایسا فرض کہ جماعت کے بغیر یہ نماز ادا ہی نہ ہوگی، اور اس میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں

کو اکٹھا ہونا چاہیے - یہی وہ نماز ہے جسکو نماز جمعہ کہتے ہیں -

اب جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، تمام عبادتوں کی طرح نماز سے بھی شریعت کے دو مقصد ہیں - ان میں سے پہلا مقصد یعنی ہر ہر شخص کو خدا ترس اور پرہیزگار بنانا تو پنجوقتہ نماز سے حاصل ہو جاتا ہے، مگر دوسرا مقصد یعنی خدا ترس بندوں کو ایک جماعت بنانا پنجوقتہ نمازوں سے پوری طرح حاصل نہیں ہوتا - اس مقصد کی تکمیل صرف جمعہ ہی سے ہوتی ہے - اسی لیے اللہ اور اسکے رسول نے جمعہ کی اسقدر سخت تاکید کی ہے کہ کسی دوسری عبادت کی نہیں کی، اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ جمعہ کو جو شخص جان بوجھ کر چھوڑتا ہے وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے - اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

یا ایّھا الّذین اٰمنوا اذا نودی للصّلوٰۃ من یّوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع - ذٰلکم خیرٌ لّکم ان کنتم تعلمون -	اے ایمان والو! جب جمعہ کی نماز کیلیے پکارا جائے تو خدا کی یاد کیلیے دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو -

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا -

من ترک ثلٰث جمعات من غیر عذر کتب من المنافقین -	جس نے بغیر کسی عذر کے مسلسل تین جمعے چھوڑ دیے اس کا نام منافقین میں لکھا گیا -

غور کرو، کتنے مسلمان ہیں جو تین جمعے کیا سینکڑوں قصداً چھوڑ جاتے ہیں، حتیٰ کہ جن کو جمعہ کے روز یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ آج ان پر کوئی چیز فرض ہے، اور پھر بھی وہ اپنے آپ کو مسلم اور مومن سمجھتے ہیں -

دوسری حدیثوں میں ہے :

من کان یومن باللہ والیوم الاٰخر فعلیہ الجمعۃ .. فمن استغنیٰ بلھو او تجارۃ استغنی	جو کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس پر تو جمعہ فرض ہے ... اور جو کھیل کود یا کاروبار

اللہ عنہ وَ اللہ غنی حمید — کی خاطر جمعہ سے بے پروا ہو جائے، اللہ اس سے بے پرواہو جائیگا اور اللہ پاک سب سے نیاز ہے۔

لینتھین اقوام عن ودعھم الجمعات او لیختمن اللہ علی قلوبھم ثم لیکونن من الغافلین — لوگ جمعہ کی نماز چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ انکے دلوں پر مہر کردیگا، وہ بھی غافلوں میں ہو جائینگے۔

ایک حدیث میں تو حضور نے یہاں تک فرمایا ہے کہ

لقد ھممت ان امر رجلا یصلی بالناس ثم احرق علی رجال یتخلفون عن الجمعۃ بیوتھم — میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی جگہ کسی کو نماز پڑھانے کیلیے کھڑا کردوں اور ان لوگوں کے گھروں میں آگ لگادوں جو جمعہ چھوڑے بیٹھے ہوں۔

دیکھیے تو سہی۔ نبی کریم جو اپنی امت پر باپ اور ماں سے زیادہ شفیق تھے، اور جنکی رحم دلی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کسی چیونٹی کو بھی تکلیف دینا انہیں گوارا نہ تھا، انکے دل میں اس گناہ پر کتنی بڑی سزا دینے کا خیال آیا ہے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ یہ کیسا سخت جرم ہے۔ مختصر الفاظ میں، میں صرف اتنا کہونگا کہ جو شخص جمعہ کو چھوڑتا ہے وہ اسلام کے اصل مقصد کو ضائع کرتا ہے۔ وہ دین کی جڑ پر ضرب لگاتا ہے، اور مسلمانوں کی جماعت میں رہ کر اس بنیاد کو توڑتا ہے جس پر مسلمانوں کی جماعت قائم کی گئی ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جس کشتی میں بیٹھا ہوا اسی میں سوراخ کررہا ہوتا کہ خود بھی ڈوبے اور اپنے ساتھ دوسرے مسافروں کو بھی لے ڈوبے۔ ایسا شخص منافق نہیں تو کیا مومن کہا جائیگا؟

اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ آپکا فرض کیا ہے۔ آپ کو نہ صرف خود سختی کیساتھ جمعہ کی پابندی کرنی چاہیے، بلکہ اپنے بھائیوں، دوستوں، ہمسایوں، اور اپنے بالغ بچوں کو بھی ساتھ لانا چاہیے اور جو لوگ جمعہ سے غفلت کررہے ہوں انہیں ہر طرح سمجھا کر، منا کر، منت سماجت کرکے، اور اگر بالغ

تو ڈانٹ ڈپٹ کر آمادہ کرنا چاہیے کہ جمعہ کی نماز میں حاضر ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک اور غلط فہمی ہے جسکو میں رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دیہات میں چونکہ جمعہ کی نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے اسیلیے دیہات کے باشندوں پر یہ نماز فرض ہی نہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جمعہ کا مقصد چونکہ مسلمانوں کو جمع کرنا ہے، اسیلیے الگ الگ چھوٹے چھوٹے دیہات میں جہاں مسلمانوں کی تھوڑی تھوڑی آبادیاں ہوں، جمعہ قائم کرنے سے روک دیا گیا، کیونکہ اسطرح جمعے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہے، کہ دیہات کے مسلمانوں پر جمعہ فرض نہیں رہا، بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ ان کو ہر طرف سے سمٹ کر کسی ایک مرکزی مقام پر جمع ہونا چاہیے اور بہت سے دیہات کے مسلمانوں کو ملکر ایک جگہ نماز پڑھنی چاہئے۔ لہذا آپ لوگ جو دیہات میں رہتے ہیں، یہ نہ سمجھیں کہ آپ سے پر جمعہ ساقط ہے۔ یہ فرض آپ پر بھی اسیطرح عائد ہوتا ہے جسطرح شہر والوں پر ہے، البتہ آپ الگ الگ اپنے قریوں میں نہ پڑھیں، بلکہ ایک مرکز پر جمع ہو جایا کریں۔

جمعہ کے دوسرے ضروری احکام بھی مختصر طور پر بیان کیے دیتا ہوں۔ آج کے روز غسل کرنا سنت ہے اور اسکی تاکید کی گئی ہے۔ خدا نے اس دن کو مومنوں کیلیے عید بنایا ہے، اسیلیے اس میں جسم کو صاف اور پاک کیجیے۔ جو اچھے سے اچھے کپڑے اللہ نے آپ کو دیے ہوں وہ پہنیے اور ممکن ہو تو خوشبو بھی لگائیے۔ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ضرور پڑھیے، اسکی بھی تاکید ہے۔ اسکے بعد آپ چاہیں تو نفل پڑھیں اور چاہیں خاموش بیٹھ کر خدا کو یاد کریں۔ جب امام خطبہ دینے کھڑا ہو تو بات چیت بند کر دیں اور خطبہ کو توجہ کے ساتھ سنیں۔ اگر کوئی شخص بات کرے تو اسے اشارہ سے منع کیجیے، زبان سے کچھ نہ بولیے۔ کیونکہ جرم کرنے والے کو روکنے کیلیے خود جرم کرنا حماقت ہے۔ نماز کیلیے جب آپ کھڑے ہوں تو صفیں سیدھی کیجیے۔ ٹیڑھی بنگی صفیں نہ ہونی چاہییں۔ نماز جمعہ کے بعد احتیاط الظہر پڑھنا غلطی ہے اور محققین نے اسکے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ صرف دو چار رکعتیں بطور سنت پڑھنی چاہییں۔

خطبۂ ثانیہ | الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم

حاضرین! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دیہات کے مسلمانوں پر بھی جمعہ اسی طرح فرض ہے جس طرح اہل شہر پر ہے، البتہ ان کو الگ الگ اپنے قریوں میں پڑھنے کے بجائے ایک مرکزی مقام پر جمع ہونا چاہیے۔ اب اس علاقہ کیلیے جو انتظام میں نے سوچا ہے وہ آپ کے سامنے بیان کر دیتا ہوں۔ نماز کے بعد آپ لوگ مجھے بتا دیں کہ آیا یہ انتظام آپ کو پسند ہے یا نہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ جمال پور کی اس بستی سے متصل ایک جگہ "دارالاسلام" کے نام سے آباد کی جا رہی ہے۔ ہمارا مقصد اس مقام کو اسلام کا ایک مرکز بنانا ہے، اور اسی مقام پر بیٹھ کر ہم اس علاقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اسلیے میری رائے میں یہ مناسب ہے، کہ آئندہ سے دارالاسلام کی مسجد کو اس علاقہ کی جامع مسجد قرار دیا جائے۔ گرد و پیش کے دیہات میں سے جو لوگ پانچ پانچ میل کی حد میں رہتے ہوں ان سب کو جمعہ کیلیے اس مسجد میں آنا چاہیے۔ اگرچہ یہاں ابھی کوئی بازار نہیں ہے اور آپ لوگوں کو کچھ عرصہ تک اس سے تکلیف ضرور ہوگی، کیونکہ جمعہ کیلیے مرکزی مقام ایسا ہی ہونا چاہیے جہاں سے دیہات کے لوگ نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کی چیزیں بھی خرید کرلے جا سکتے ہوں۔ لیکن یہ تکلیف بہت جلد رفع ہو جائیگی۔ یہاں ہر قسم کی دوکانیں کھولنے کا انتظام کیا جا رہا ہے، اور مجھے امید ہے کہ یہ انتظام عنقریب ہو جائیگا۔

پانچ میل کی حد محض سہولت کو مد نظر رکھ کر مقرر کی گئی ہے۔ آگے چل کر اس حد کو زیادہ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جن دیہات کے باشندے جامع مسجد میں نماز پڑھکر رات سے پہلے پہلے اپنے گھر پہنچ سکتے ہوں انکو جامع مسجد میں آنا چاہیے۔ اس لحاظ سے ہم باہمی مشورہ کر کے اور آمد و رفت کے ذرائع کو پیش نظر رکھ کر اس حد کو گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں۔

آئیے! اب درود وسلام بھیجیے اپنے آقا اور مولیٰ رسول رب العلمین وخاتم النبیین پر:-
اللھم صلِّ علی محمد وعلی آل محمد وبارک وسلم۔ اسکے بعد دعائے رحمت کیجیے حضور کے اصحاب واہل بیت پر اور خصوصاً آپکے خلفاء حضرات ابوبکر صدیق، عمر ابن الخطاب، عثمان ابنِ عفان اور علی ابنِ طالب پر جو نبی کریم کا صحیح اتباع کرکے ہمارے لیے ایک روشن راستہ چھوڑ گئے ہیں، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اسکے بعد دعا کیجیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمکو راہ راست پر قائم رکھے، اور گمراہی سے بچائے۔ خدایا ہمیں حق کو حق کرکے دکھا اور اسکی پیروی کی توفیق دے۔ اور ہمیں باطل کو باطل کرکے دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے۔ خدایا جو تیرے دین کی مدد کرے تو اسکی مدد کر اور ہمیں اس کا ساتھی بنا۔ اور جو تیرے دین سے منہ پھیرے، تو بھی اس سے منہ پھیرے اور ہمیں اسکے فتنہ میں پڑنے سے بچا۔

عباد اللہ۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون۔ اذکروا اللہ یذکرکم وادعوہ یستجب لکم ولذکر اللہ تعالیٰ اعلیٰ واولیٰ واعز واجل واعظم واتم واقویٰ واکبر۔

نوٹ۔ نماز کے بعد تمام حاضرین نے بالاتفاق دار الاسلام کی مسجد کو جامع مسجد قرار دیا اور اس کے بعد سے وہاں اقامتِ جمعہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

"سچ" کے بجائے "صدق"

یکم مئی ۱۹۵۰ء سے ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم - گیارہ اور اکیس کو شائع ہوگا۔ سے ہمکو معلوم ہے کہ صاحب ذوق حضرات جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی طرز انشاء کے عاشق ہیں اور آپکے مخصوص دلنشین طرز صحافت کیلئے آپکے اخبار سچ کے بند ہونیکے سبب سے بیتاب تھے۔ اس مژدہ کو سچ معنوں میں مژدہ سمجھینگے۔ لہذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی چار روپیہ جلد روانہ فرماکر خریداران کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرائیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچہ دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑیگا۔ "صدق" ہر اعتبار سے سچ سے بڑھا ہوا ہے۔ معنوی حیثیت سے مضامین قرآنی کا اضافہ۔

سالانہ چندہ (للعہ) ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" ۱۹۵۰ء ہیوٹ روڈ لکھنؤ

بچوں کیلئے مفید کتابیں

سراپائے رسولؐ اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک اور آپکے عادات و خصائل لباس معاشرت، اخلاق آداب اطوار اور عام طرز زندگی کے متعلق تمام معلومات جمع کی گئی ہیں، اور انکو نہایت سہل زبان اور دلکش انداز بیان میں لکھا گیا ہے۔ جیبی تقطیع پر بہت خوبصورت طبع ہوئی ہے۔ قیمت ۴ر

ہمارے نبی کے صحابہ اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دلنشین انداز بیان کیساتھ درج کیے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق اور دینداری، احسن معاشرت اور نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور انکے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت قسم اول ۸ر قسم دوم ۶ر علاوہ محصولڈاک۔

مسلمان بیبیاں یہ کتاب ہمارے نبی کی صحابیہ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ان پاک ہستیوں کی زندگی کو مسلمان لڑکیوں کیلئے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان اسقدر سادہ ہے کہ کم سن بچیاں آسانی اسکو سمجھ سکتی ہیں قیمت ۸ر علاوہ محصولڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

Regd. No. L. 4186.

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے

(۱) اسلامی جہاد کی حقیقت۔ اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

(۲) مدافعانہ جنگ۔ [illegible] غرض جنگ [illegible] جنگ کا حکم دیا ہے۔

(۳) مصلحانہ جنگ۔ اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح [illegible] کی جنگ [illegible]

(۴) اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔ (۵) قوانین جنگ۔ اسلام سے پہلے [illegible] طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔ (۶) جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق [illegible] ہندو مذہب، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات اور ان پر تبصرہ۔ (۷) جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قوانین جنگ سے اسلامی قوانین جنگ کا مقابلہ۔ قیمت غیر مجلد (للعہ) مجلد (للعہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

باہتمام چودھری نیاز علی خاں طابع و ناشر شائع برقی پریس امرتسر میں چھپا
اور دفتر ترجمان القرآن۔ دارالاسلام پٹھانکوٹ سے شائع ہوا